علامہ شوق نیموی

حیات و خدمات

ڈاکٹر محمد عتیق الرحمن قاسمی

مجلس علمی لال باغ پٹنہ

پیش لفظ

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو　　ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو علم و عقل کی دولت سے مالا مال کیا اور جنھوں نے آنے والی نسلوں کے لئے آثار علمی چھوڑا وہ لائق صد تحسین و آفریں ہیں۔ نہ جانے کتنے علمائے اولوالعزم و فضلائے علم و فن اس دنیائے آب و گل میں رہ کر انسان کے دلوں کو اپنی تصانیف اور ارشادات سے منوّر کیا مگر ان میں آج بہتیرے ایسے ہیں جن کے کارناموں سے ہمارے کان آشنا نہیں۔ مبارک ہیں وہ ادبا، شعرا، علما و فضلا جن کی کتابیں اب تک محفوظ ہیں اور ان کی روشنی میں ان مصنفوں کو ہم آج بھی چلتے پھرتے دیکھتے ہیں۔ علم سے ان کا لگن اور عشق تھا جو ان کو زندہ جاوید بنا سکا ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق　　ثبت است بر جریدۂ عالم دوام "او"

انھیں جیسے عالموں میں ہمارے بہار کے ایک برگزیدہ محدث، ایک متبحر عالم، ایک خوش گو شاعر، ایک محقق نکتہ داں اور ایک مدقق زباں داں علامہ ظہیر احسن شوق ساکن قصبہ نیمی متصل مضافات عظیم آباد بہار بھی تھے جن کو انکی زندگی ہی میں علمائے عصر نے بہت سراہا اور انکے ارشادات گرامی کو قبول عام کی سند بخشا۔

علامہ موصوف گوناگوں صفات کے حامل اور بوقلموں علوم کے ماہر تھے۔ علم حدیث میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔ یہ میرا منصب نہیں کہ اس موضوع پر کچھ لکھ سکوں۔ جو کتاب آپ کے پیش نظر ہے اس کو پڑھ کر آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔

علامہ شوق نے عمر طویل نہیں پائی۔ ۱۲۷۸ھ میں پیدا ہوئے اور آخر ۱۳۲۲ھ میں اپنے خالق حق سے جا ملے۔ ۴۴ سال ہی کی عمر میں انھوں نے اپنی تعانیف کا ایک پشتارہ لگا دیا جو نہ جانے کتنے اپنی طویل عمر میں بھی نہ کر سکے۔

زبان و ادب میں تحقیق کا یہ عالم کہ اس وقت کے جید استاد فن جلال لکھنوی سے نبرد آزمائی میں ان کو

شکست دی۔ اپنے علمی رسالوں کی شہرت کے باعث نواب رامپور کی طلبی پر رامپور گئے قصیدہ پیش کیا، انعام وافر رہا خود وہاں کے شعرا مثلاً امیر مینائی، داغ وغیرہ نے کلمات تحسین سے نوازا۔ نواب مذکور نے بار بار رامپور آنے کی دعوت دی۔

یہ خود پہلے تسلیم لکھنوی سے اصلاح لیتے رہے پھر مولانا سعید حسرت عظیم آبادی کو بھی اپنا کلام دکھایا۔ فن میں ایسے کامل ہوئے کہ نزدیک و دور کے نو مشق شعرا ان کے دامن تربیت سے وابستہ ہوئے۔

ان کے شاگردوں میں ممتاز شاگرد، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شفق عماد پوری گیاوی، شاہزادہ زبیر یعنی آخری تاجدار دہلی ظفر کے پوتا، جو خاتمہ سلطنت کے بعد دربھنگہ میں وہاں کے راج میں ملازم ہوئے۔ اور پھر ایک جوانا مرگ شاعر ضیا عظیم آبادی جس کا یہ شعر اتنا مشہور ہوا کہ نہ جانے کتنوں نے اس کو میر کا شعر سمجھا ہو

ایک ٹیس جگر میں اٹھتی ہے اک درد سا دل میں ہوتا ہے   ہم راتوں کو رویا کرتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

فن شاعری پر علامہ شوق کو عبور حاصل تھا۔ تقریباً ہر صنف شاعری میں طبع آزمائی کی۔ ان کی مثنوی سوز و گداز مقبول انام ہوئی اور کئی بار زیور طبع سے آراستہ ہو چکی۔

عربی، فارسی اور اردو میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ مقام افسوس ہے کہ ابتک ان کی زندگی اور حاصل زندگی پر کوئی سیر حاصل مقالہ نہیں لکھا گیا تھا۔ ڈاکٹر عتیق الرحمٰن پی ایچ۔ ڈی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے "علامہ کے حالات زندگی، ان کی تصانیف، ان کے کمالات علمی و فنی پر ایک تابناک اور پر از معلومات کتاب لکھ کر دنیائے ادب پر عموماً اور زبان اردو پر خصوصاً احسان کیا ہے۔ یہ کتاب بڑی محنت اور لگن سے لکھی گئی ہے مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ یہ کتاب ان کتابوں میں ایک امتیازی شان رکھتی ہے جو پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد مختلف اداروں سے طبع کرائی گئی ہیں۔

اس کتاب کے مطالعہ سے قارئین علامہ شوق کی علمی، ادبی، فنی اور شعری صلاحیتوں اور کارناموں سے واقفیت حاصل کریں گے۔ مزید یہ کتاب اور مقالہ نگاروں کے لئے مشعل راہ ثابت ہو گی۔

عطا کاکوی، ۲۰ر مارچ ۱۹۸۶ء

سخنہائے گفتنی

علامہ ظہیر احسن شوق نیموی (متوفی ۱۳۲۲ھ) بہار کے ان مقتدر ہستیوں میں ہیں جنہیں ان کے گراں قدر علمی و ادبی خدمات کی وجہ سے نہ صرف بہار بلکہ پورے ہندستان میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اس کی بنیادی وجہ ان کی زندگی کے دو روشن اور ممتاز پہلو ہیں ——

ایک تو یہ کہ وہ اردو زبان کے مستند شاعر اور محقق و زبان داں تھے۔ ان کی شعری خوبیوں کو داغ دہلوی، تسلیم لکھنوی، حسرت عظیم آبادی اور احسن مارہروی جیسے نامور شعراء نے سراہا اور مولانا ابوالکلام آزاد، زبیر دہلوی اور ضیا عظیم آبادی نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، اور ان کی شاگردی پر فخر کیا۔ اس کے علاوہ زباندانی کے میدان میں جلال لکھنوی جیسے اہم شاعر کو شکست فاش دی اور "جگنو وجگنی" اور "جھاں بین" کی تحقیق میں دہلی اور لکھنؤ کے اساتذہ سے اپنی زبان دانی کا لوہا منوایا۔

دوسرے یہ کہ حدیث کے فن میں آثار السنن جیسی اہم اور تاریخ ساز کتاب مرتب کی اور اس میں بعض احادیث و رجال کے سلسلے میں ایسی نادر تحقیقات پیش کیں کہ ان سے ہندستان کے تقریباً تمام علماء متاثر ہوئے۔ یہی نہیں بلکہ ہندستان کے ممتاز ترین علماء مثلاً علامہ انور شاہ کشمیری، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا زکریا سہارنپوری نے ان کی تحقیقات سے استفادہ کیا اور اپنی اپنی تصنیفات و تالیفات میں جابجا قال العلامہ النیموی (علامہ نیموی نے فرمایا) کہہ کر ان کے حوالے دیئے ہیں ——

۱۹۷۳ء کی بات ہے کہ جب میں نے علی گڑھ سے ایم۔اے (عربی) کا امتحان پاس کیا تو پی۔ایچ۔ڈی کرنے کا خیال ہوا۔ موضوع کی تلاش میں کئی ماہ گذر گئے لیکن کوئی خاص موضوع طے نہ ہو سکا۔ بالآخر میں پٹنہ آگیا اور یہاں موضوع کی تلاش میں مصروف ہوگیا۔ یہاں تک کہ نظر انتخاب علامہ شوق نیموی پر پڑی اور پھر "علامہ شوق نیموی بحیثیت محدث" کے عنوان سے پروفیسر امین احمد کاظمی مرحوم صدر شعبہ عربی پٹنہ یونیورسٹی کی نگرانی میں پٹنہ یونیورسٹی

میں پی، ایچ۔ ڈی کے لئے اندراج کرالیا، سال کی مسلسل محنت کے بعد ۱۹۸۰ء میں کام مکمل کر کے جمع کر دیا جس پر اسی سال مجھے پٹنہ یونیورسٹی کی طرف سے پی، ایچ۔ ڈی کی ڈگری مل گئی۔

یہ مقالہ چوں کہ عربی زبان میں لکھا گیا تھا اور سارا زور علامہ نیموی کی خدمات حدیث کے مواد کی فراہمی پر صرف کر دیا گیا تھا اس لئے ان کی زندگی کے دوسرے علمی و ادبی پہلوؤں پر سرسری اور ضمنی گفتگو کی گئی تھی۔ لیکن اس بات کی شدت کے ساتھ ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ اگر علامہ نیموی کی حیات و خدمات پر ایک جامع اور مبسوط کتاب اردو زبان میں لکھ دی جائے اور ان کے ادبی کارناموں پر بھی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی جائے تو زیادہ مفید اور زیادہ کارآمد خدمت ہوگی۔ چنانچہ اس مقصد سے میں نے کام کرنا شروع کر دیا۔ پہلے اپنے عربی مقالے کا اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ پھر علامہ نیموی کی تمام ادبی کتابوں اور شعری مجموعوں کو بغور پڑھا۔ اردو کی دیگر متعلقہ کتابیں بھی مطالعہ میں رہیں۔ اس کے بعد جو کچھ حاصل مطالعہ نظر آیا وہ اس کتاب میں پیش کر دیا گیا ہے۔ میں اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں اس کا فیصلہ آپ پر منحصر ہے۔ وما توفیقی الا باللہ

یہاں یہ بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ اس کتاب کا پہلا باب (ہندستان میں علم حدیث) علامہ سید سلیمان ندوی کے مفصل مضمون کی تلخیص ہے جو ماہنامہ معارف میں بالاقساط چھپ چکا ہے چونکہ اس موضوع پر یہ نہایت جامع اور تحقیقی مضمون ہے اس لئے علیحدہ مضمون لکھنے کے بجائے اسکی تلخیص پر اکتفا کیا گیا ہے۔ آخر میں ارکین بہار اردو اکادمی، محمود عالم صاحب، سلیم الدین صاحب، علام صاحب اور ارشد حسین سلمہ کا خاص طور پر شکر گذار ہوں جنھوں نے اس کتاب کی طباعت میں میری مدد کی ہے۔

پروفیسر عطاء الرحمن عطا کاکوی سابق ڈائرکٹر ادارہ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے میری گذارش پر پیش لفظ لکھ کر اپنی قیمتی رائے پیش کی ہے اور میرے لئے ہمت افزائی کے کلمات تحریر فرمائے ہیں۔

محمد عتیق الرحمٰن
اسسٹنٹ لائبریرین
خدابخش لائبریری، پٹنہ
۲۳ [illegible] ۱۹۸۶ء

باب اوّل

ہندستان میں علم حدیث

تجارتی لین دین کی وجہ سے عرب و ہند کے تعلقات نہایت قدیم ہیں لیکن ہندستان میں مسلمانوں کی آمد سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ہوئی جیساکہ مشہور مورخ احمد بن یحییٰ بلاذری (متوفی ۲۷۹ھ) نے لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سنہ ۱۵ھ میں حضرت عثمان بن ابو العاص ثقفی کو بحرین اور عمان کا حاکم بنایا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی کو بحرین روانہ کیا اور خود عمان پہنچ کر تھانہ (بمبئی) اور بھڑوچ (گجرات) کی طرف ایک فوجی دستہ بھیجا۔ اس کے علاوہ اپنے دوسرے بھائی مغیرہ بن ابو العاص کی قیادت میں ایک دوسری فوجی مہم دیبل (سندھ) کی طرف روانہ کی۔ دونوں بھائیوں نے حملہ کیا، اور کامیابی و کامرانی کے ساتھ واپس لوٹے[1]

اس کے بعد عربوں نے مختلف اوقات میں مختلف حملے کئے اور پھر رفتہ رفتہ سندھ اور کچھ ہندستانی علاقوں میں ان کی مستقل حکومتیں دولت ماہانیہ (سنہ ۱۹۸ھ تا سنہ ۲۲۷ھ) دولتِ ہباریہ (سنہ ۲۴۷ھ تا سنہ ۴۱۶ھ) دولت سامیہ (سنہ ۲۸۰ھ تا سنہ ۳۶۰ھ) دولت معدانیہ (سنہ ۳۴۰ھ تا سنہ ۴۷۱ھ) دولت متغلبہ (سنہ ۳۴۰ھ تا سنہ ۴۷۱ھ) کے نام سے قائم ہوئیں۔[2]

اس طویل عرصہ میں مسلم حکمرانوں کی علم دوستی اور علماء و محدثین کرام کی آمد کی برکت سے سندھ اور دوسرے ساحلی علاقوں میں علوم دینیہ کی اشاعت نہایت تیزی سے

۱؎ فتوح البلدان: ۴۲۰ ۲؎ ہندستان میں عربوں کی حکومتیں: ۲۱

ہوئی۔ قرآن وحدیث کی طرف خاص طور پر توجہ کی گئی۔ یہاں تک کہ دیبل (سندھ) اور بوقان دینی علوم وفنون کے اہم مرکز بن گئے۔ حدیث کا فن اس قدر عام ہوا کہ سندھ کے اکثر مسلمان حدیث پر ہی عمل کرتے تھے۔ عرب کا مشہور سیاح ابوالقاسم مقدسی ۳۷۵ھ میں ہندستان آیا تھا۔ اس نے سندھ کے مذہبی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :۔ مذاہبہم اکثرہم حدیث [1]

اس سے بھی بڑھ کر تعجب کی بات یاقوت حموی نے دیبل کے بارے میں لکھا ہے کہ قدنسب الیہا قوم من الرواۃ [2] محدثین کی ایک جماعت دیبل کی طرف نسبت کرتی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دیبل وغیرہ میں اعلیٰ پایہ کے محدثین موجود تھے اور ان کے شاگرد دور دور تک پھیل چکے تھے۔

ہندستان میں پہلا محدث

۱۵۹ھ میں خلیفہ مہدی کے حکم سے جو فوج ہندستان کی طرف روانہ ہوئی اس میں ربیع بن صبیح السعدی بھی تھے جن کو تابعی ہونے کا شرف حاصل تھا۔ یہ سب سے پہلے محدث ہیں جو سرزمین ہند میں تشریف لائے۔ اس کے علاوہ یہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے احادیث کے منتشر اوراق کو یکجا کرنے میں پہل کیا۔ یہ ہندوستان کے کسی جزیرہ میں ۱۶۰ھ میں دفن ہوئے [3]۔

جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا کہ علم حدیث کے ساتھ خصوصی لگاؤ کی بنا پر سندھ میں محدثین کرام کی ایک اچھی جماعت تیار ہو گئی تھی جو مقامی طور پر اس علم کی اہم خدمات انجام دے رہی تھی۔ لیکن کچھ محدثین کرام ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنے وطن عزیز سندھ کو

---

[1] احسن التقاسیم :- ۴۸۱ [2] معجم البلدان ۴/۱۱۸
[3] معارف دسمبر ۱۹۲۸ء "یاد ایام : ۶ - رجال السند والھند : ۲۵۵ : نزہۃ الخواطر ۱/۳۶

خیر باد کہا اور دوسرے اسلامی ممالک میں اس علم کی ترویج و اشاعت میں مصروف ہو گئے۔ اس سلسلے میں ابو معشر نجیح سندھی مدنی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کیونکہ یہ سندھی محدث ہوتے ہوئے بھی مدینہ اور بغداد میں اہم مقام رکھتے تھے۔ بلکہ فن مغازی و سیر کے امام تسلیم کئے جاتے تھے۔ انھوں نے کتاب المغازی کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ ان کا نام اس فہرست میں داخل ہے۔ جو مغازی و سیر کے واقعات کو سب سے پہلے قید تحریر میں لاتے۔ سنہ ۱۷۰ھ میں بغداد میں وصال ہوا۔[1]

اسی طرح رجاء السندی (المتوفی ۲۲۱ھ) اور ان کے لڑکے ابو عبداللہ محمد بن رجاء السندی نیشاپوری نہایت اہمیت کے حامل ہیں کیوں کہ خراسان میں ان کا پورا گھرانا بیت العلم اور معدن الحدیث سمجھا جاتا تھا۔[2]

اس کے علاوہ ابو العباس احمد بن عبداللہ دیبلی (المتوفی ۳۵۴ھ) ابو بکر احمد بن منصوری (المتوفی ۴۲۲ھ) ابو نصر سندھی بن ابان بغدادی (المتوفی ۲۸۱ھ) ابو القاسم منصور بن محمد سندھی اصفہانی اور ابو الحسن نصر اللہ سندھی بغدادی (المتوفی ۴۳۳ھ) خاص طور پر محتاج بیان ہیں۔ جنہوں نے دوسرے ممالک میں جا کر علم حدیث کی اہم خدمات انجام دی ہیں اور اپنے ملک کا نام روشن کیا ہے۔[3]

لاہور کا پہلا محدث

سلطان محمود نے سنہ ۴۱۲ھ میں لاہور فتح کیا۔ اس کے عہد میں ایک بزرگ شیخ اسماعیل ہندستان آئے، اور لاہور میں قیام کیا۔ حدیث و تفسیر کے جامع البحرین تھے۔ اور بڑے مؤثر البیان تھے۔ بے شمار آدمی ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے لاہور میں قیام کیا۔ اور تفسیر کا علم اپنے ساتھ لائے۔

---

[1] رجال السند والہند: ۲۵۵، ۲۵۶، عرب و ہند کے تعلقات: ۳۰۳ [2] رجال السند والہند: ۱۲۶ [3] ہندستان میں عربوں کی حکومتیں: ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۸، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۷۲۔

تذکرہ علمائے ہند میں لکھا ہے :-

"از عظمائے محدثین و مفسرین بود و اول کسے است کہ علم حدیث و تفسیر
بہ لاہور آوردہ" [1]

لاہور کا دوسرا محدث

شیخ اسماعیل کے بعد یہاں ڈیڑھ سو برس تک اندھیرا رہا۔

بالآخر ساتویں صدی ہجری کے شروع میں امام صغانیؒ نے حدیث کی روشنی پھیلائی ان کا نام حسن بن محمد تھا۔ ان کا خاندان غزنین اور ماوراءالنہر سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر ان کے والد بزرگوار نے ہندستان میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔

امام صغانی ۵۷۷ھ میں لاہور میں پیدا ہوئے، اور ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم سے حاصل کی۔ پھر حجاز و عراق جاکر علوم دینیہ کی تکمیل کی۔ خاص طور سے لغت اور حدیث میں اس قدر مہارت پیدا کی کہ ان دونوں فن کے امام قرار پائے۔

۶۱۵ھ میں بغداد گئے اور خلیفہ بغداد اور سلطان غزنین و ہند کے درمیان سفارت کا فرض انجام دیا۔ ۶۵۰ھ میں وفات پائی۔

حدیث میں امام صغانی کی مشہور کتاب مشارق الانوار ہے جو مشکوٰۃ شریف کے طور پر مرتب کی گئی ہے۔ مشارق الانوار ہی حدیث کی وہ پہلی کتاب ہے جو ہندستان میں لکھی گئی اور نہایت مقبول ہوئی۔ علمائے کرام نے اس کتاب کی بڑی قدر کی۔ اس کی مختلف شرحیں لکھیں اور داخل درس کیا۔ یہاں تک کہ حضرت نظام الدین اولیاء کے درس میں یہ کتاب داخل تھی۔ اور انہوں نے اس کو سبقاً سبقاً پڑھا تھا۔ [2]

---

[1] تذکرہ علمائے ہند: ۲۳۔ [2] تذکرہ علمائے ہند۔ ۳۔۱۷

علم حدیث سے بہمنیوں کی دلچسپی

بہمنیوں نے سب سے پہلے دکن میں حکومت قائم کی اور سواحل تک جہاں بھی ان کا گذر ہوا وہاں علم حدیث کی اشاعت کی طرف توجہ کی۔ سلطان محمود (۷۸۰ھ تا ۷۹۹ھ) علم کا بڑا قدر داں تھا۔ سلاطین بہمنی میں سب سے پہلے اسی نے علم حدیث کی طرف توجہ کی۔

شیخ ابوالقاسم فرشتہ نے سلطان محمود کے حال میں لکھا ہے :۔

"وجہت محدثان اخبار حضرت نبوی صلے اللہ علیہ وسلم در شہر ہائے کلاں وظائف مقرر کردہ و در تعظیم ایشاں میکوشید"[۱]

گجرات میں علم حدیث

فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں ظفر خاں نے مظفر شاہ کا خطاب اختیار کر کے گجرات میں ۸۱۰ھ میں مستقل حکومت قائم کر لی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اسی کے زمانہ میں بحری راستہ سے آمد و رفت شروع ہوئی۔ اور علم حدیث عرب سے گجرات کو منتقل ہوا۔ سب سے پہلے عالم جو عرب سے اس علم کو لے کر گجرات میں وارد ہوئے وہ مولانا نور الدین احمد شیرازی تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب گجرات میں نئی نئی حکومت قائم ہوئی تھی۔ اور احمد شاہ اوّل (۸۱۳ھ تا ۸۲۴ھ) تخت نشیں تھا۔ مولانا نور الدین شیرازی سید شریف جرجانی کے شاگرد تھے۔ صحیح بخاری کی سند ان کی اتنی عالی تھی کہ وہ حجاز و یمن پہنچے تو بڑے بڑے محدثین نے نہایت ذوق و شوق کے ساتھ ان سے سند حاصل کی[۱]

---

[۱] معارف دسمبر ۱۹۲۸ء۔ یاد ایام :۔ ۳۴

دہلی میں علم حدیث

عام طور سے دہلی اور اس کے اطراف وجوار میں نویں صدی ہجری کے وسط تک علم حدیث سے بے خبری رہی اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ وہاں سے مصر و عرب جانے کے لئے ان دنوں خشکی کا راستہ مستعمل تھا جو نہایت پرخطر اور وقت طلب تھا۔ اور شاہان دہلی نے اس وقت تک ساحل تک دخل نہیں پایا تھا اس لئے دہلی کا مرکز علم حدیث کے سرچشمہ سے خالی تھا در حقیقت دہلی اور اس کے اطراف میں سب سے پہلے سید رفیع الدین صفوی شیرازی (متوفی ۹۵۴ھ) کی ذات گرامی سے علم حدیث کی اشاعت ہوئی۔ جو دسویں صدی کے مشہور عالم اور محدث ہیں انہوں نے عرب میں حدیث کا فیض حافظ سخاوی سے اور معقولات کی تعلیم محقق دوانی سے حاصل کی تھی۔ معقولات و منقولات کی دولت سے سرفراز ہو کر گجرات پہنچے۔ یہ زمانہ دہلی میں سکندر لودی کی حکومت کا تھا۔

یہ علم کا قدرداں بادشاہ تھا۔ اس لئے اس نے سید رفیع الدین صفوی شیرازی کو گجرات سے دہلی بلا لیا۔ ان کے آنے پر سلطان نے بڑی ہمت افزائی اور قدردانی کی۔ سلطان کی ہدایت پر سید رفیع الدین صفوی نے آگرہ میں سکونت اختیار کرلی اور درس و تدریس کا کام شروع کردیا۔ بدایونی کی تصریح کے مطابق انہوں نے چند تلامذہ چھوڑے جن میں قابل تذکرہ شیخ ابو الفتح تھانیسری ہیں۔ شیخ ابو الفتح تھانیسری نے پچاس برس تک آگرہ میں اپنے استاد ہی کے محلہ میں بیٹھ کر عقلی و نقلی علوم کا درس دیا اور بے شمار اشخاص نے ان سے فیض حاصل کیا۔[۱]

---

[۱] منتخب التواریخ ۱۲۹/۳

شیخ علی متقی برہان پوری

ابھی تک ہندستان میں علم حدیث کے لئے کوئی مستقل میدان تیار نہیں ہوا تھا یہاں تک کہ شیخ علی متقی برہان پوری (متوفی ۹۷۵ھ) نے یہاں ایک مستقل اسکول تیار کر دیا جس کی وجہ سے یہاں ایک عرصہ دراز تک علم حدیث کی روشنی نظر آتی رہی۔ شیخ کا آبائی وطن جونپور تھا۔ برہان پور (دکن) میں پیدا ہوئے اور وہیں شیخ باجن برہانپوری سے بچپن میں بیعت کی۔ جوانی میں ملتان جاکر شیخ حسام الدین متقی سے ظاہری و باطنی علوم کی تکمیل کی۔ ۹۵۳ھ میں عرب گئے اور وہاں کے مشہور اساتذہ اور شیوخ سے ظاہری و باطنی علوم حاصل کئے۔

انہوں نے ۹۵۷ھ سے ۹۷۱ھ تک میں فن حدیث کی معرکۃ الآرا کتاب کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال کے نام سے مرتب کی جو صحیح معنی میں حدیث شریف کی دائرۃ المعارف ہے۔ اس کے علاوہ ایک مختصر مجموعہ منہج العمال کے نام سے مرتب کیا۔

شیخ کے آغوش تربیت میں ہندستان کے متعدد باکمال فیض یاب ہوئے۔ جن میں شیخ عبدالوہاب متقی برہانپوری شیخ محمد بن طاہر پٹنی، شاہ محمد بن فضل اللہ برہانپوری، شیخ رحمت اللہ سندھی اور شیخ برخوردار سندھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔[1]

شیخ عبدالوہاب متقی

یہ برہان پور (دکن) میں پیدا ہوئے۔ بیس برس تک ہندستانی علماء سے استفادہ کیا۔ پھر عرب چلے گئے اور ۹۶۳ھ میں شیخ علی متقی کے حلقہ درس میں داخل ہوئے۔ اور شیخ کی وفات تک بارہ برس مسلسل شیخ کی خدمت میں رہے۔ شیخ کی تصنیفات کا مسودہ لکھنا اور صاف کرنا ان کا مشغلہ تھا۔ یہاں تک کہ ان کی وفات کے بعد

---

[1] اخبار الاخیار: ۲۵۷- ۲۶۹ سبحۃ المرجان: ۴۳، ابجد العلوم: ۸۹۵، تذکرہ علمائے ہند: ۳۴۹

حرمین شریفین اور مصر و شام اور یمن کے علماء نے ان کو شیخ علی متقی کا جانشین تسلیم کر لیا۔ صحاح ستہ کا درس ان کے حلقہ میں ہوتا تھا۔ تدریس حدیث اور نادر کتابوں کی تصحیح و نقل ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کے شاگردوں کی تعداد کثیر تھی ۱۰۰۱ھ میں انتقال کیا۔ شیخ عبدالحق دہلوی نے مکہ معظمہ میں ان سے صحاح ستہ کی سند حاصل کی تھی اور ان سے مرید بھی ہو گئے تھے [۱]

محمد طاہر پٹنی

ملا محمد بن طاہر پٹنی (متوفی ۹۱۴ھ) گجرات کے رہنے والے تھے۔ شیخ علی متقی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ مکہ معظمہ جا کر علوم دینیہ کا فیض جاری کیا، اور شیخ علی متقی کی زندگی ہی میں دو کتابیں تصنیف کیں ایک مجمع بحار الانوار لغت حدیث میں اور دوسری المغنی تصحیح اسماء الرجال کے بیان میں۔ مجمع بحار الانوار یوں تو بظاہر لغت حدیث کی کتاب ہے لیکن بعض علمائے حدیث نے اعتراف کیا ہے کہ یہ صحاح ستہ کی شرح ہے۔ اس کے علاوہ تذکرۃ الموضوعات اور قانون الموضوعات ان کی اہم تصنیفات ہیں [۲]

لاہور میں درس بخاری

تاریخ میں پہلی مرتبہ اکبری دور میں صحیح بخاری کے داخل درس ہونے کا ذکر ملتا ہے۔ مولانا محمد لاہور کے مفتی تھے۔ اور حدیث کا درس دیتے تھے۔ تقریباً نوے برس کے سن تک درس حدیث دیا۔ جب صحیح بخاری اور مشکوٰۃ شریف کا دورہ ختم کرتے تو خوشی میں دھوم دھام سے لوگوں کی دعوت کرتے تھے [۳]

---

[۱] خزینۃ الاصفیا ۱/ ۱۳۸ - ۱۴۰ تذکرہ ۳۳۶ [۲] نزہۃ الخواطر ۴/ ۲۹۸، ۳۰۱ اتحاف النبلاء: ۳۹۷؛ تذکرہ علمائے ہند: ۴۴۰ [۳] منتخب التواریخ ۳/ ۱۵۴

شیخ عبدالحق دہلوی

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اکبر بادشاہ کے آخری عہد میں علم حدیث کی نہایت اہم خدمات انجام دی ہیں۔ ان کے ذریعہ علم حدیث کی کافی اشاعت ہوئی، اور عام طور پر اس کا رواج ہوا۔ شیخ عبدالحق دہلوی ۹۵۸ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد ماجد سے علوم کی تحصیل کی پھر مکہ معظمہ جاکر شیخ عبدالوہاب متقی کے حلقہ درس میں شریک ہوئے اور ان سے صحاح ستہ کا درس حاصل کیا۔ ان کے مرید بھی ہوئے۔ اس کے بعد دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ اور تقریباً سو سے زیادہ کتابیں لکھیں جن میں سے مشکوٰۃ کی عربی شرح لمعات اور فارسی شرح اشعۃ اللمعات کافی مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ سیرت میں مدارج النبوۃ تصنیف کی اور سفر السعادۃ کی فارسی شرح لکھی جو علمی دنیا میں نہایت مقبول ہوئی۔ ۱۰۵۲ھ میں وفات پائی۔[1]

ان کے شاگردوں کی تعداد اچھی خاصی ہے جن میں ان کے بیٹے شیخ نورالحق دہلوی نے اشاعت علم حدیث میں اہم رول ادا کیا۔

اس کے بعد ہمیں تاریخ ہند اسلامی میں دو ایسی عظیم ہستیاں نظر آتی ہیں جنہوں نے علم حدیث کی بھرپور خدمت انجام دی اور پھر ان کے بعد ان کے شاگردوں کی ایسی جماعت تیار ہوئی کہ آج تک پورے ہندستان میں اسی جماعت کا سلسلہ نظر آتا ہے۔ وہ شیخ احمد سرہندی، اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی ذات گرامی ہے۔

---

[1] ماثر الکرام: ۲۰۰ - اتحاف النبلاء: ۳۰۳-۳۰۵، سبحۃ المرجان: ۵۲-۵۳
منتخب التواریخ ۳/۱۱۷

شیخ احمد سرہندی

شیخ احمد سرہندی ۹۷۱ھ میں پیدا ہوئے۔ اکثر درسی کتابیں اپنے والد محترم سے پڑھیں اور حدیث کی کتابیں مولانا عبدالرحمٰن سرہندی اور مولانا یعقوب کشمیری سے پڑھیں۔ اس کے بعد حرمین شریفین تشریف لے گئے اور وہاں کے بڑے بڑے محدثین سے استفادہ کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ ان کی کئی کتابیں تصنیفی یادگار ہیں جن میں علم حدیث کے موضوع پر ایک اربعین نامی کتاب ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے مکتوبات ہیں جن کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حدیث میں آپکو کافی ملکہ تھا، انہوں نے گرچہ اپنی تعلیم کی بنیاد اتباع سنت پر رکھی لیکن اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ علم حدیث اور شمائل نبوی کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول ہوئی، اور ان کے بعد صوفی محدثین کا ایک عظیم الشان سلسلہ شروع ہوا۔ حضرت مجدد کی اولاد نے بھی حدیث کی اہم خدمات انجام دیں۔[1]

شاہ ولی اللہ دہلوی

شاہ ولی اللہ دہلوی ۱۱۱۴ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ تعلیم اپنے والد شیخ عبدالرحیم سے حاصل کی اور ۱۵ برس کی عمر میں فراغت پائی۔ شیخ افضل سرہندی سے حدیث پڑھی۔ تیس برس کی عمر میں عرب گئے اور وہاں شیخ ابو طاہر مدنی سے صحاح ستہ، موطا امام مالک، مسند دارمی پڑھی اور بقیہ کتابوں کی سند ان سے حاصل کی۔ دو برس کے بعد ہندستان واپس آئے اور اپنے فیوض و برکات سے پورے تیس برس تک ہندستان کو سیراب کیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے تقلیدی فقہ کی جگہ پر قرآن و حدیث کی روشنی میں

---

[1] علمائے ہند کی شاندار ماضی ۱/۱۴۳-۱۴۵، سفینۃ الاولیاء: ۱۹۷، ۲۰۲ خزینۃ الاصفیا ۱/۶۰۷-۶۰۹
الیانع الجنی: ۶۲، نزہۃ الخواطر ۵/۴۱-۵۳

تحقیقی فقہ کو رواج دیا۔

حدیث کی دنیا میں حضرت شاہ عبدالحق دہلوی کے بقیہ کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ تالیف و تصنیف کے ذریعہ کتب حدیث کو عام کیا۔ موطا امام مالک کی فارسی اور عربی میں مسوّی اور مصفّٰی کے نام سے دو مجتہدانہ شرحیں لکھیں۔ اور یہ ثابت کیا کہ قرآن کے بعد سب سے زیادہ معتبر کتاب موطا امام مالک ہے۔ اس کے علاوہ صحیح بخاری کے تراجم پر "الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین" نامی ایک رسالہ لکھا۔ انہوں نے حدیث شریف کی ایک اہم خدمت یہ بھی انجام دی کہ دہلی میں علم حدیث کے درس و تدریس کے لئے باقاعدہ حلقہ قائم کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے بعد ان کے شاگردوں نے تمام ملک میں پھیل کر فن حدیث کو عام کیا۔[۱]

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی شاہ ولی اللہ دہلوی کے بڑے لڑکے تھے۔ ۱۱۵۹ھ میں پیدا ہوئے پندرہ سال کی عمر میں تعلیم سے فراغت پائی۔ تمام علوم اپنے والد محترم سے حاصل کیا۔ فراغت کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ تصنیف و تالیف کی طرف خصوصی توجہ دی۔ اصول حدیث میں عجالہ نافعہ کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ اس کے علاوہ محدثین کرام کا تذکرہ بستان المحدثین کے نام سے لکھا۔ سر الشہادتین، تحفہ اثنا عشریہ، اور فتح العزیز ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ انہوں نے درس و تدریس کے ذریعہ اپنے شاگردوں کا ایک ایسا حلقہ تیار کیا کہ ان کے بعد ان لوگوں نے اپنے اپنے علاقوں میں مدرسے قائم کئے اور علم حدیث کی تعلیم سے ان علاقوں کو منور کیا۔ انکے

---

[۱] ابجد العلوم: ۹۱۲، نزھۃ الخواطر ۳/۲۶۴، الیانع الجنی ۷۹

شاگردوں میں مولانا شاہ اسماعیل شہید، شاہ محمد یعقوب شاہ محمد اسحاق، مرزا حسن محدث لکھنوی، مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ان کے دوسرے بھائی شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے بھی درس و تدریس کے ذریعہ حدیث کی اہم خدمت انجام دی ہے۔ ۱۲۳۹ھ میں ان کا انتقال ہوا۔[1]

شاہ محمد اسحاق

حدیث کے میدان میں شاہ محمد اسحاق کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ ۱۱۹۷ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ تمام درسی کتابیں شیخ عبدالقادر سے پڑھیں۔ اس کے بعد درس و تدریس کا کام شروع کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے درس میں بڑی برکت عطا فرمائی تھی۔ اکثر بڑے بڑے علما ان کے شاگرد تھے۔ غدر کے بعد مکہ معظمہ ہجرت کر گئے تھے۔ اور وہاں بھی سلسلہ درس جاری رکھا۔ چند رسالے تصنیف کیے جن میں مسائل اربعین اور اقتای ہندی قابل ذکر ہیں۔ ان کے قابل فخر شاگردوں میں شاہ عبدالغنی مجددی، مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا سید نذیر حسین بہاری ثم دہلوی خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ مولانا محمد اسحاق نے مکہ معظمہ میں ۱۲۶۲ھ میں وفات پائی۔ عرب کے علما نے بھی ان سے استفادہ کیا۔ اور روایت کی[2]

شاہ عبدالغنی

شاہ عبدالغنی مجددی ۱۲۳۵ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ کچھ کتابیں اپنے والد محترم مولانا شاہ ابو سعید سے اور بقیہ کتابیں مولانا مخصوص اللہ، شاہ محمد اسحاق اور دوسرے اساتذہ سے پڑھیں۔

---

[1] آثار الصنادید: ۱۵/۴، ۳۹-۴/۴۲، ابجد العلوم: ۹۱۴، تذکرہ علمائے ہند: ۱۹۷، نزہۃ الخواطر ۷/۲۶۸

[2] ابجد العلوم: ۹۱۶-۹۱۷، تذکرہ علمائے ہند: ۴۰۹، حدائق الحنفیہ: ۴۷۴

اس کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ خاص طور پر حدیث شریف کی تعلیم و تعلم کو اپنا مشغلۂ حیات بنایا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس فن کے باکمالوں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ جب شاہ محمد اسحاق مکہ معظمہ ہجرت کر گئے تو ان کی تدریسی و علمی جانشینی کا شرف حضرت شاہ عبد الغنی مجددی کو حاصل ہوا۔ دہلی پر جب انگریزوں کا تسلط ہو گیا تو وہاں سے مکہ معظمہ کوچ کر گئے۔ اور مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کر لی۔ سنہ ۱۲۹۶ھ میں وہیں وفات ہوئی۔

ان کے شاگردوں کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندستان میں جس قدر حدیث شریف کے سلاسل نظر آتے ہیں ان سب میں کوئی نہ کوئی سلسلہ حضرت شاہ محمد اسحاق یا حضرت شاہ عبد الغنی مجددی تک ضرور پہنچتا ہے۔ اور یہ ان دونوں حضرات کے لئے انتہائی فخر و اعزاز کی بات ہے۔[1]

نواب صدیق حسن خاں

نواب صدیق حسن خاں ہندستان کے مایہ ناز عالم اور اونچے پایہ کے محدث تھے۔ سنہ ۱۲۴۸ھ میں بانس بریلی میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں والد کا انتقال ہو گیا۔ صرف و نحو کی ابتدائی کتاب اپنے بھائی احمد حسین سے پڑھیں اس کے بعد دہلی چلے گئے۔ اور وہاں نواب مصطفےٰ خاں کے گھر مقیم ہوئے جن کا گھر علم و ادب کا مرکز تھا۔ اور جہاں بے شمار ادبا اور اہل علم کی آمد و رفت رہتی تھی۔ نواب صدیق حسن خاں نے اس علمی مجلس سے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ اس کے علاوہ وہاں کے مستند اور مشہور اساتذہ سے استفادہ کیا۔ تلاش معاش میں بھوپال پہنچے اور وہاں قاضی زین العابدین انصاری سے سنن ابن ماجہ سنن نسائی، اور سنن داری کی تعلیم حاصل کی۔ سنہ ۱۲۸۵ھ میں حج کے لئے روانہ ہوئے اور وہاں شیخ محمد یعقوب مہاجر مکی سے اجازت حدیث حاصل کی۔

[1] نزہۃ الخواطر ۷/۲۹۰، خزینۃ الاصفیا ۱/۶۹۸، ابجد العلوم: ۹۲۹

حج سے واپس ہوئے تو بھوپال میں مستقل قیام کیا اور وہاں ۱۲۸۶ھ میں ناظم تعلیم بنا دیئے گئے۔ انتظامی مصروفیتوں کے باوجود مطالعہ کتب میں زیادہ وقت صرف کرتے تھے وہ سینکڑوں کتابوں کے مصنف ہیں جو تفسیر، حدیث، فقہ و اصول فقہ پر مشتمل ہیں، ان کی مشہور کتابوں میں فتح البیان، عون الباری، ابجد العلوم، اتحاف النبلا نیل المرام اور سراج الوہاج خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

انہوں نے قرآن و حدیث کے بعض اہم کتابیں شائع کرائیں اور اس کے لئے کافی پیسے خرچ کئے۔ ۱۳۰۷ھ میں انتقال کیا۔[۱]

مدراس میں علم حدیث

مدراس میں ایک عرصہ دراز سے عرب تاجروں کی آمد و رفت تھی اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ وہاں علم حدیث عرب سے براہ راست آیا ہوگا۔ اس کے بعد عالمگیری عہد میں جب یہ علاقہ مسلمانوں کے زیر نگیں آیا اور پھر بارہویں صدی میں نظام دکن کی وہاں حکومت قائم ہوگئی تو محدثین کرام نے اس کی طرف رخ کیا۔ یہاں کے ممتاز علماء میں شیخ محمد اسعد حنفی مکی قابل ذکر ہیں۔ جو شیخ تاج الدین سبکی کے شاگرد تھے شیخ عبداللہ بن سالم بصری مکی نے ضیاء الساری کے نام سے صحیح بخاری کی جو شرح لکھی تھی اس کا اصل نسخہ شیخ اسعد نے انکے لڑکے سے خریدا تھا۔ یہ ناصر جنگ کی شہادت کے بعد مظفر جنگ کے ساتھ ۱۱۶۴ھ میں شہید ہوئے۔ مولانا آزاد بلگرامی نے ان کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"در منقولات خصوص حدیث و فقہ بے نظیر بود"[۲]

---

[۱] نزہۃ الخواطر ۱۸۷/۸، تذکرہ علمائے ہند: ۲۵۰

[۲] ماثر الکرام: ۱۹۰/۲

بنگال میں علم حدیث

بنگال کی تاریخ پڑھنے سے پتا چلتا ہے کہ وہاں کے بادشاہوں نے علم حدیث کی اشاعت کی طرف بہت کم توجہ دی جس کی وجہ سے محدثین کرام نہایت کم تعداد میں وہاں پہنچے اور پھر نتیجتاً اس فن کی پوری طرح اشاعت نہ ہو سکی۔ شیخ شرف الدین ابو توامہ کے حالات میں بیان کیا جاتا ہے کہ غیاث الدین بلبن (۱۲۲۸ء تا ۱۲۸۱ء) نے جب انہیں دہلی سے ہجرت کر جانے کا حکم دیا تو انہوں نے ۱۲۶۹ھ میں سنار گاؤں میں قیام کیا اور وہاں ایک مدرسہ اور خانقاہ کی بنیاد ڈالی۔ چوں کہ وہ اسلامی علوم و فنون کے ایک متبحر عالم تھے اس لیے علوم عقلیہ کے علاوہ قرآن و حدیث کی بھی اعلیٰ تعلیم دیتے تھے۔ ان کے ممتاز اور اہم شاگردوں میں حضرت مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری کو نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ جنہوں نے بائیس سال تک اپنے استاد کے ساتھ رہ کر قرآن و حدیث میں تبحر حاصل کیا[1]

علاء الدین حسین کے دور حکومت (۹۰۵ھ تا ۹۲۷ھ) میں صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دربار میں بخاری شریف کا ایک نسخہ تھا جس کو محمد یزداں بخش معروف بہ خواجگی شروانی نے خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کیا تھا۔[2]

دوسرا واقعہ اس طرح ملتا ہے کہ سنار گاؤں میں ایک عظیم الشان مسجد ہے جو

---

[1] ترجمہ مکتوبات صدی: ۱۴۴ [2] معارف فروری ۱۹۳۷ء

شاہ حسین کے بیٹے نصرت شاہ حسین کے زمانۂ حکومت میں بنائی گئی تھی۔ اس مسجد پر ایک کتبہ چسپاں ہے۔ اور اس میں ایسی عبارت ملتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے عہد میں علم حدیث کا رواج ہو چکا تھا اور محدث ہونا شرف و بزرگی کی بات سمجھی جاتی تھی۔

کتبہ کی عبارت مندرجہ ذیل ہے۔

قال اللہ تعالیٰ اَنَّ المساجد للہ فلا تدعوا مع اللہ احدا۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ مَن بنی مسجداً للہ یبتغی بہ وجہ اللہ بنی اللہ لہ مثلہٗ فی الجنۃ۔ بنی ھذا المسجد للہ فی عہد السلطان المعظم والمکرم السلطان بن السلطان ناصر الدنیا والدین ابوالمظفر نصرت شاہ السلطان بن حسین شاہ السلطان الحسینی خلد اللہ ملکہ وسلطانہ۔ وبناہ لوجہ اللہ مع بیت السقایہ ملک الامراء والوزراء قدوۃ الفقہاء والمحدثین تقی الدین بن عین الدین المعروف بمبارک ملا ابن المجلس مختار ابن المجلس سرور وسلمہ اللہ تعالیٰ فی الدارین فی سنۃ تسع عشرین وتسع مأۃ ۹۲۹ھ[1]

فرنگی محل میں علم حدیث

لکھنؤ میں علم حدیث کا علمی مرکز عالم گیر کے عہد میں قائم ہوا[2] لیکن ایک طویل عرصہ تک صرف منطق، فلسفہ اور اصول فقہ کی کتابیں داخل درس تھیں۔ حدیث کی کتابوں میں صرف مشکوٰۃ شریف پڑھائی جاتی تھی۔ علمائے فرنگی محل میں سب سے پہلے

---

[1] معارف ستمبر ۱۹۳۴ء [2] مقالات شبلی ۹۳/۳

مولینا عبد العلی (بحر العلوم) نے اپنی تصنیفات میں کتب حدیث کا جابجا حوالہ دیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فن حدیث میں ان کی گہری نظر تھی تاہم حدیث کی کتابوں کو درسیات میں شامل کرنے کا باقاعدہ نظام مولانا عبد الحلیم فرنگی محلی کے زمانہ سے شروع ہوا۔ مولینا عبد الحلیم فرنگی محلی نے مفتی محمد یوسف اور دوسرے فرنگی محلی علما، کرام سے علوم درسیہ کی تکمیل کی۔

۱۲۷۹ھ میں حرمین کی زیارت کے لئے روانہ ہوئے اور وہاں کے علماؤ شیوخ سے کتب حدیث کی سندیں حاصل کیں۔ خاص طور پر احمد بن زین وحلان شافعی۔ شیخ محمد جمال حنفی، محمد بن محمد عرب الشافعی اور شاہ عبد اللہ مجددی سے استفادہ کیا۔ اور حدیث کے فن میں کامل الفن بن کر واپس ہوئے۔ انھوں نے منطق وفلسفہ کے علاوہ حدیث وسیر کے موضوع پر بھی کتابیں تصنیف کیں۔ تذکرہ علمائے ہند میں ان کی ۲۵ تصنیفات کے نام تحریر کئے گئے ہیں۔ جن میں نور الایمان فی آثار حبیب الرحمٰن، برکات الحرمین، خیر الکلام فی مسائل الصیام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۲۸۵ھ میں حیدر آباد میں انتقال کیا[۱]

مولانا عبد الحی فرنگی محلی

مولانا عبد الحی فرنگی محلی ۱۲۶۴ھ میں باندہ میں پیدا ہوئے۔ درسیات کی تکمیل اپنے والد بزرگوار مولانا عبد الحلیم فرنگی محلی سے کی۔ دو مرتبہ عرب گئے اور وہاں کے علماء و شیوخ سے حدیث کی سندیں حاصل کیں۔ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف ان کا خاص مشغلہ تھا۔ ۱۳۰۴ھ میں وفات ہوئی۔ کل چالیس سال کی عمر

---

[۱] ہندستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں ۵۹، احوال علمائے فرنگی محلی: ۲۴، تذکرہ علمائے ہند: ۲۸۴

پائی مگر اس مختصر زمانے میں ان کے درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور تحقیق و تدقیق کے آوازہ سے نہ صرف ہندستان بلکہ پوری دنیائے اسلام گونج اٹھی۔

بعض حدیث اور متعلقات حدیث کی نادر کتابیں نہایت تحقیقی مقدمہ اور تحشیہ کے ساتھ شائع کیں۔ متون حدیث میں مسند امام ابی حنیفہ، موطا امام محمد، کتاب الآثار امام محمد پر مقدمہ اور مفید حواشی لکھے۔ اور انہیں چھپوا کر شائع کیا۔

اس کے علاوہ آثار المرفوعہ فی الاخبار الموضوعہ، فوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ۔ عمدۃ الرعایہ، حاشیہ شرح وقایہ، دافع الوسواس فی اثر ابن عباس وغیرہ ان کی اہم کتابیں ہیں۔ ان کے شاگردوں میں مولانا محمد حسین الہ آبادی، مولانا کلیم عبدالباری عظیم آبادی مولانا قادر بخش سہسرامی، مولانا عبدالکریم پنجابی، مولانا سید ظہور الاسلام، اور مولانا ظہیر احسن شوق نیموی قابل ذکر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فرنگی محل میں فن حدیث کے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا جو تھوڑا بہت کام شروع ہوا تھا وہ مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے دور میں پایہ تکمیل تک پہنچ گیا۔[1]

علمائے دیوبند اور علم حدیث

مولانا محمد قاسم نانوتوی (متوفی ۱۲۹۷ھ) نے ۱۲۸۳ھ میں ایک دینی درسگاہ دارالعلوم کے نام سے دیوبند میں قائم کی۔ جو آج ہندستان کی سب سے بڑی اور اہم دینی درسگاہ سمجھی جاتی ہے۔ اس کے قیام کا خاص مقصد دینی علوم و فنون کی اشاعت تھا۔ اس لئے مولانا قاسم نانوتوی نے قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم کی طرف خصوصی

---

[1] الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ: ۱۰۴، تذکرہ علمائے فرنگی محل: ۱۴۳، تذکرہ علمائے ہند: ۲۸۸ نزہتہ الخواطر ۸/۲۳۴

توجہ دی۔ ان کے شاگردوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ لیکن ان سب میں زیادہ قابل ذکر مولانا محمود الحسن دیوبندی (متوفی ۱۳۳۹ھ) کی ذات گرامی ہے۔ کیوں کہ انھوں نے اپنے استاذ کی طرح خدمت حدیث میں پوری زندگی گزار دی۔ اس کے علاوہ قرآن کا ترجمہ لکھا، اور ہندستان کی عملی سیاست میں حصہ لے کر علمار کے وقار کو بلند کیا۔ انھوں نے طویل عرصہ تک دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ اس لئے ان کے شاگردوں کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ لیکن ان کے وہ شاگرد جنہوں نے حدیث شریف کی سب سے نمایاں خدمات انجام دیں اور ان کے کارنامے تحریری شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں وہ خاص طور پر دو ہیں، ایک مولانا شبیر احمد عثمانی دوسرے علامہ انور شاہ کشمیری۔ ان حضرات کے حالات قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں۔

مولانا شبیر احمد عثمانی

مولانا شبیر احمد عثمانی نے ابتدائی درسی کتابوں کی بعد مولانا محمود الحسن دیوبندی سے حدیث و تفسیر کا علم حاصل کیا۔ اس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہو گئے۔ اور ایک عرصہ تک درس و تدریس کے منصب پر فائض رہے۔ تفسیر و حدیث کی اہم کتابیں پڑھاتے تھے۔ تدریسی خدمات کے علاوہ تصنیف و تالیف سے بھی کافی دلچسپی تھی، چنانچہ انھوں نے ترجمۂ قرآن کا حاشیہ لکھا جو نہایت مقبول ہوا۔ حدیث میں صحیح مسلم کی شرح چار جلدوں میں لکھی جو نہایت اہم اور معیاری شرح تسلیم کی جاتی ہے۔ اس شرح پر تبصرہ کرتے ہوئے مصر کے مشہور عالم علامہ رشید رضا مصری نے لکھا تھا۔ فانتم یا مولانا فخر الحنفیۃ فی ھذا العصر حقا،[1]

---

[1] فتح الملہم ۳/۵۱۹

علامہ انور شاہ کشمیری

علامہ انور شاہ کشمیری (متوفی ۱۳۵۲ھ) نے ابتدائی کتابوں کے بعد مولٰنا محمود الحسن دیوبندی اور مولانا خلیل احمد سہارنپوری سے درسیات کی تکمیل کی، اور پھر دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دینے پر مامور ہوئے۔ ۱۳۳۳ھ میں جب مولٰنا شیخ الہند ایک طویل مدت کے لئے مکہ معظمہ جانے لگے تو اپنی جگہ علامہ انور شاہ کشمیری کو جانشین بنا گئے۔ چنانچہ استاد کے حکم پر علامہ انور شاہ کشمیری صدر مدرس کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ اور ترمذی شریف اور بخاری شریف کا درس دینے لگے۔ تقریباً تیرہ برس تک کتب بینی اور درس و تدریس میں مشغول رہے۔ یہاں تک کہ ان کے علمی فضل و کمال کا شہرہ پورے ملک میں پھیل گیا۔

علامہ انور شاہ کشمیری اپنے وقت کے جلیل القدر عالم اور مایۂ ناز محدث تھے۔ جب درس دینے بیٹھتے تو علم و فن کا دریا بہا دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ انکی درسی تقاریر کے دو مجموعے شائع ہوئے۔ ایک فیض الباری کے نام سے جو بخاری شریف کی شرح ہے، اور چار جلدوں میں ہے، دوسری ترمذی شریف کی شرح ہے اور ایک جلد میں ہے۔ اس کے علاوہ اکفار الملحدین اور مشکلات القرآن ان کی نہایت اہم کتابیں ہیں۔

ان کے شاگردوں کی تعداد اچھی خاصی ہے جن میں مولانا فخر الدین شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند۔ مولٰنا محمد یوسف بنوری اور مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی وفات ۱۳۵۲ھ میں ہوئی۔ [1]

---

[1] نزہۃ الخواطر ۸/۸۰

باب دوم

بہار میں علم حدیث

بہار میں علم حدیث کے آغاز کے سلسلے میں علامہ سید سلیمان ندوی کی رائے ہے کہ اس کا آغاز فخر المحدثین سید یاسین گجراتی کے ذریعہ اکبری دور میں ہوا۔ چنانچہ فرماتے ہیں :۔

"ادپر دور اکبری کے محدثین میں سید یاسین گجراتی کا نام گزرا ہے جو عرب جاکر اس سلسلہ (حدیث) سے بہرمند ہوتے تھے۔ واپسی ہوئی تو پانچ دریاؤں والی زمین (پنجاب) کو سیراب کیا۔ پھر تذکروں میں لکھا ہے کہ وہ اس کے بعد بنگالہ کے ملک کو چلے گئے۔ اس کے بعد ان کا پتا نہیں چلتا۔ لیکن خوش قسمتی سے پھلواری شریف سے سند حدیث کا ایک قلمی نسخہ ہاتھ آیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سید موصوف یہاں سے بہار گئے" اور وہاں بھی اس فیض کو جاری کیا غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ بہار کی خانقاہ سے قال الرسول کا ترانہ سمع نواز ہوا۔ اس سلسلہ سند سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ المحدثین مولینا یاسین کے درس سے وہاں حافظ الوقت مولانا شیخ عبدالرزاق نامی ایک بزرگ نے فائدہ اٹھایا اور ان سے شیخ الوقت مولینا عبدالنبی نے اور ان سے ان کے صاحب زادہ مولینا معتقد محدث اور ان سے ان کے بھتیجے اور شاگرد محمد عتیق بن عبدالسمیع بہاری نے اور انہی کی دی ہوئی یہ سند ہے جو پھلواری شریف میں محفوظ ہے[۱]

[۱] معارف ج ۲۲ شمارہ ۶۵

لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہار میں اس فن کی اشاعت اور اجازت حدیث کا سلسلہ آٹھویں صدی ہجری میں حضرت شیخ شرف الدین احمد مخدوم بہاری کی ذات گرامی سے شروع ہو چکا تھا۔ کیوں کہ حضرت مخدوم بہاری کی ذات گرامی نہ صرف تصوف و معرفت بلکہ تفسیر و حدیث کے لحاظ سے بھی ممتاز تھی۔ ان کی خانقاہ میں معتبر حدیث کی کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود تھا۔ جن کا وہ خود مطالعہ کرتے اور اپنے خلفاء اور مخصوص مریدین کو مطالعہ کا حکم دیتے تھے۔ ان کی مجلسوں میں صوفیانہ موضوع کے علاوہ احادیث کی صحت و ضعف کے سلسلے میں سوالات کئے جاتے اور آپ ان کا تشفی بخش اور عالمانہ جواب دیتے تھے۔ چنانچہ خوان پر نعمت مجلس بست و نہم میں لکھا ہے کہ آپ کے عہد میں کچھ لوگوں نے باذان نماز کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک سنتے ہی اپنی دو انگلیاں اپنی آنکھوں پر رکھنا شروع کر دیا تھا۔ تو اس کے متعلق دریافت کرنے پر آپ نے فرمایا:-

"آں حدیث جائے کتب احادیث کہ معتبر و معروف دراں دیار است نمی یابم۔

اسی طرح ایک حدیث "اکرموا اولادی الصالحون للہ والطالحون لی" کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا:-

"در کتب حدیث در نظر نیامدہ اما حدیث می گویند" [1]

اس کے علاوہ گنج لایخفی میں مختلف مقامات پر آپ نے فن حدیث کی تعریف، اقسام اور رواۃ حدیث پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کی مجلسوں

---

[1] خوان پر نعمت مجلس بست و چہارم

میں حدیث پر بڑے عالمانہ انداز میں گفتگو ہوتی تھی اور اس کا چرچا رہتا تھا۔
جہانتک اجازت حدیث کا سوال ہے تو یہ سلسلہ بھی حضرت مخدوم بہاری کے ہاتھوں شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ ان کے ممتاز خلیفہ مخدوم سید منہاج الدین راستی کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب ان کو حضرت مخدوم بہاری نے طریقہ عرفانی کی اجازت دی تو اس کے ساتھ اجازت حدیث کی بھی سند دی تھی اس سلسلے میں حضرت مولانا شاہ عزالدین پھلواری لکھتے ہیں :۔

"اس سرزمین (پھلواری شریف) کی سب سے پہلی باعزت شخصیت حضرت سید منہاج الدین راستی کی ہے جو ساتویں صدی ہجری کے بزرگ ہیں اور حضرت مخدوم بہاری کے خلفا میں ہیں۔ حضرت مخدوم بہاری نے آپ کو اپنے طریقہ عرفانی کا مجاز بنا دیا تھا جس میں سلسلہ حدیث کی سند بھی تھی"[1]

اس کے علاوہ معدن المعانی میں حضرت مظفر شمس بلخی نے بیان کیا ہے کہ حضرت حسین معز بلخی مکہ معظمہ میں چار سال رہ کر اور شیخ شمس الدین خوارزمی سے علمی فیض حاصل کر کے واپس آئے تو انہوں نے حضرت مظفر شمس بلخی کو صحیح بخاری و مسلم کی اجازت حدیث کی سند بھی دی تھی۔ اصل عبارت ملاحظہ کیجئے۔

"حسین مذکور سند حدیث بریں فقیر صحیح مسلم و صحیح بخاری من اولہ و آخرہ لفظاً بریں فقیر تحقیق کردہ خدائے تعالیٰ دیرا ذہن صاف و طبیعت فیاض دادہ است و سند دیگر بر خطب عدن نیز کردہ است از جہت این فقیر در تدریس این علم مجاز است۔ خدائے تعالیٰ اورا نافع مسلمانان گرداند۔ در این دین و دنیا آمین"[2]

---

[1] معارف جلد ۲۳ [2] معدن المعانی : ۵۰۷

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اجازت حدیث کا سلسلہ حضرت مخدوم بہاری کے علاوہ خود ان کے خلفا میں بھی شروع ہو چکا تھا۔ تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ صوبہ بہار میں حدیث شریف کا باضابطہ تدریسی سلسلہ حضرت سید یاسین گجراتی کی ذات گرامی سے شروع ہوا۔

سید لٰسین گجراتی

حضرت سید لٰسین گجراتی اکبری دور کے مشہور محدث ہیں انہوں نے اکثر مروجہ کتابیں شیخ وجیہ الدین سے گجرات میں پڑھیں۔ اور انہی سے مرید ہوئے۔ حرمین شریفین کی زیارت کی وہاں حدیث کی کتابیں پڑھیں اور اجازت حدیث کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد ہندستان واپس آئے۔ کچھ دنوں تک لاہور میں قیام کیا پھر سرہند میں تبلیغ واشاعت کے کام میں مشغول ہو گئے۔ اس کے بعد بنگال کے لئے روانہ ہو گئے۔ اسی اثنا میں بہار میں ایک مدت تک قیام کیا۔ اور حدیث کی تعلیم اور اجازت دی۔ حدیث میں مہارت کی وجہ سے شیخ المحدثین کے لقب سے مشہور ہوئے۔ [1]

محمد عتیق محدث بہاری

ملا محمد عتیق بہاری عالمگیری عہد کے مشہور فاضل اور محدث ہیں۔ سنہ ھ میں بہار میں پیدا ہوئے، اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ کچھ کتابیں اپنے والد محترم سے پڑھیں حدیث کی کتابیں خاص طور پر شیخ عبد المقتدر سے پڑھیں۔ جن کا سلسلہ حضرت سید لٰسین گجراتی تک پہنچتا ہے۔ اس کے علاوہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے صاحبزادہ شیخ نور الحق محدث دہلوی اور ان کے شاگرد شیخ جمال الدین سے حدیث کی سند

---

[1] تذکرہ علمائے ہند: ۵۵، نزہتہ الخواطر ۴/۳۹۳

حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ بخاص طور پر حدیث شریف کی کتابیں پڑھائیں۔

ان کے تلامذہ میں شیخ محمد وجیہ الحق بہاری ایک اہم عالم اور محدث گذرے ہیں۔ محمد عتیق محدث نے ان کو حدیث کی جو سند دی تھی وہ آج تک پھلواری شریف میں موجود ہے۔

ملا محمد عتیق محدث بہاری کی وفات ۱۱۴۹ھ میں ہوئی ۔[1]

ملا محمد وجیہ الحق محدث بہاری

ملا محمد وجیہ الحق محدث بہاری ۱۱۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی کتابیں اپنے برادر بزرگ سے پڑھیں۔ اسی اثنا میں ایک مہلک مرض میں مبتلا ہو گئے۔ اسی حالت میں اپنے والد محترم سے بیعت ہوئے۔ جب مرض سے شفایاب ہوئے تو ملا محمد عتیق محدث بہاری کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور بقیہ درسی کتابوں کی تکمیل کی۔ اس کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ ۱۱۳۲ھ میں خرقۂ خلافت سے نوازے گئے۔

درس و تدریس اور وعظ و تلقین کے علاوہ آپ نے تصنیف و تالیف کے ذریعہ دینی علوم و فنون کی خدمت انجام دی۔ آپ کی تصنیفات میں "نزہتہ السالکین" تصوف کے موضوع پر بہترین کتاب ہے۔ اس کے علاوہ حدیث میں شمائل ترمذی اور تفسیر میں تفسیر قرآن ان کی اچھی کتابیں ہیں۔

ان کے تلامذہ میں ملا وحید الحق پھلواروی، مفتی غلام مخدوم اور حضرت

---

[1] معارف جلد ۲۲، شمارہ ۵، ۶، نزہتہ الخواطر ۶/۳۳۰

شاہ آیت اللہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی وفات ۱۱۵۰ھ میں ہوئی۔[1]

ملا وحید الحق محدث پھلواروی

ملا وحید الحق اپنے دور کے ممتاز علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ ۱۱۲۴ھ میں پیدا ہوئے۔ پھلواری شریف میں تعلیم و تربیت ہوئی۔ بعض درسی کتابیں اپنے والد محترم ملا وجیہ الحق سے اور بقیہ کتابیں اپنے ماموں شیخ مبین جعفری سے پڑھیں۔ سند حدیث اپنے والد محترم سے حاصل کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ بڑے متقی آدمی تھے۔ فقراء کا لباس پہنتے اور چٹائی پر بیٹھتے تھے۔

ان کے شاگردوں کی تعداد زیادہ تھی جن میں مولینا احمدی، شیخ علی اکبر، مفتی عبد المغنی، شیخ نور الحق، اور شیخ نعمت اللہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

انہوں نے کچھ علمی یادگار چھوڑی ہیں جن میں ہدایۃ الفقہ، تعلیقات بیضاوی تحقیق الایمان، زاد الآخرۃ، اور ذکر الصلوٰۃ قابل ذکر ہیں۔ حدیث میں شمائل ترمذی کی تعلیقات اہم ہیں۔ ان کی خدمات حدیث کا اعتراف کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"شیخ محمد وجیہ کے شاگرد اور ان کے صاحبزادے ملا وحید الحق محدث پھلواروی ہیں انہوں نے درس و تدریس اور تحریر و تالیف سے اس فن (حدیث) کی اشاعت کی لیکن وہ تمام تر شیخ عبد الحق دہلوی کے خوشہ چین تھے۔"[2]

۱۲۰۱ھ میں ان کا انتقال ہوا۔[3]

---

[1] اعیان وطن: ۶۱ [2] معارف جلد ۲۲، شمارہ ۶ [3] ہندستانی مفسرین اور انکی عربی تفسیریں: ۱۳۳۰

جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا کہ شاہ عبدالعزیز اور شاہ محمد اسحاق دہلوی کی وجہ سے دہلی علوم دینیہ اور خاص طور پر حدیث کی تعلیم کے لئے مرکز بن گیا تھا۔ پورے ہندستان کے طلباء وہاں پہنچتے اور استفادہ کر کے واپس ہوتے تھے۔ چنانچہ اس لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں تو اس سرچشمۂ حدیث (دہلی) سے صوبہ بہار بھی مستفیض ہوا۔ اور پھر اس کے بعد یہاں بھی اشاعت حدیث کا ایسا سلسلہ چلا کہ آج تک وہی سلسلہ پورے بہار میں چل رہا ہے۔

بہار کے جن طلباء نے حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی اور شاہ محمد اسحاق دہلوی سے بلا واسطہ درس حدیث حاصل کیا۔ اور پھر اس کی اشاعت و تبلیغ میں زندگی بھر مشغول رہے۔ ان میں شاہ ظہور الحق پھلواروی، شیخ محمد نور علی سہسرامی اور مولینا سید نذیر حسین بہاری ثم دہلوی کا نام خاص طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

شاہ ظہور الحق پھلواروی

مولانا شاہ ظہور الحق پھلواروی حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کے شاگرد تھے۔ ان سے حدیث کا درس حاصل کیا۔ اور حدیث کی سند لے کر واپس ہوتے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔ حدیث شریف کی طرف خصوصی توجہ دی، اس فن سے دلچسپی کا یہ حال تھا کہ مسلم شریف، بخاری شریف اور حصن حصین کی ضخیم جلدیں حفظ کر ڈالیں۔ اور غالباً پھلواری شریف کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہاں کے ایک عالم نے قرآن پاک کے ساتھ ساتھ حدیث شریف کی اتنی ضخیم کتابیں حفظ کر ڈالیں اس کے علاوہ شیخ ظہور الحق نے توضیح تہافت الفلاسفہ اور الاعیان فی المنطق جیسی اہم کتابیں تصنیف کیں۔[1]

[1] معارف ۱۹۲۹ء

شیخ محمد نور علی محدث سہسرامی

مولانا شیخ نور علی محدث سہسرامی ۱۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے۔ فارسی اور کچھ دوسری کتابیں اپنے والد ماجد سے پڑھیں۔ پندرہ برس کی عمر میں تحصیل علوم کے لئے گھر سے روانہ ہوئے۔ بیس برس کی عمر میں دہلی کا سفر کیا۔ اور شاہ محمد اسحاق دہلوی کی خدمت میں حاضر ہو کر صحاح ستہ سبقاً سبقاً پڑھا۔ اور اس اہتمام سے پڑھا کہ جس قدر پڑھتے جاتے تھے اس قدر لکھتے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ افادات شیخ حاشیہ پر تحریر کرتے جاتے تھے۔ ظاہری علوم کے علاوہ باطنی علوم بھی حاصل کئے۔ پورے چودہ برس شاہ محمد اسحاق کی خدمت میں رہ کر اور ظاہری و باطنی علوم سے آراستہ ہو کر سنہ ۱۲۵۰ھ میں گھر واپس ہوئے۔

حضرت شاہ کبیر الدین احمد سجادہ نشیں خانقاہ سہسرام کے ارشاد پر مدرسہ خانقاہ کبیریہ کی ذمہ داری قبول کی، اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔

شیخ کے عہد میں سہسرام میں ایک پورا محلہ شیعوں سے آباد تھا۔ ان کے اثر سے اہل سنت والجماعت شیعیت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ چنانچہ شیخ محمد نور علی نے اپنے دلائل کے زور اور اثر و رسوخ کی قوت سے اس کا قلع قمع کیا۔

شیخ کے فضل و کمال کا شہرہ ہوا تو بہار و بنگال اور بنارس سے طلبا جوق در جوق آنے لگے۔ اور شریک درس ہونے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے شاگردوں کی تعداد کافی بڑھ گئی۔ چند شاگردوں کے نام یہ ہیں، شیخ شاہ محی الدین سابق سجادہ نشیں خانقاہ سہسرام، حکیم ابراہیم علی خاں سہسرام، مولوی یار محمد (فرزند محدث موصوف) مولوی محب حسین بلہاری، مولوی مرزا بیگ۔

تفسیر و حدیث اور فقہ کی جن کتابوں کو آپ نے شاہ محمد اسحاق دہلوی سے

سبقاً سبقاً پڑھاتا تھا اور ان پر حاشیہ لکھا تھا۔ ان میں بیشتر محفوظ ہیں۔ ان میں سے چند کتابیں شرح وقایہ محشی، ہدایہ آخرین محشی، تفسیر جلالین محشی، فوز الکبیر، فوز الخبیر اور مشکوٰۃ شریف محشی، شرح موطا محشی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان سب نسخوں پر اتمام درس کی تاریخ بھی دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ صحاح ستہ کی اور کتابیں ہیں۔ جن پر ان کا حاشیہ ہے۔ شیخ نے پوری عمر درس و تدریس، اور اشاعت و تبلیغ میں بسر کی۔ ۱۲۶۲ھ میں وفات پائی۔[۱]

مولانا سید نذیر حسین بہاری ثم دہلوی

مولانا سید نذیر حسین بہاری ہندستان کے مشہور محدث اور عالم دین ہیں۔ ۱۸۰۵ء میں سورج گڑھ (مونگیر) میں پیدا ہوئے۔ فارسی و عربی کی ابتدائی کتابیں اپنے والد محترم سے پڑھیں۔ اس کے بعد الہ آباد چلے گئے۔ اور وہاں صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں پڑھ کر دہلی کے لئے روانہ ہو گئے۔ تفسیر و فقہ کی کتابیں مولانا کرامت سے پڑھیں۔ اس کے بعد مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی کے حلقہ درس میں شریک ہو گئے۔ اور ان سے صحاح ستہ، جامع صغیر، تفسیر بیضاوی کا درس حاصل کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ تفسیر، حدیث اور فقہ وغیرہ کی تعلیم دیتے تھے لیکن حدیث کے لئے خاص طور پر ان کی درسگاہ مشہور تھی۔ تقریباً نصف صدی تک دہلی میں بیٹھ کر حدیث اور دینی علوم و فنون کی تعلیم دی جس کی وجہ سے نہ صرف ہندستان بلکہ بیرون ہند میں بھی انکے شاگرد پھیلے ہوئے تھے۔

---

[۱] معارف جلد ۲۹ شمارہ ۲۵

بہار میں بھی ان کے شاگردوں کی تعداد خاصی تھی جن میں خاص طور پر مولانا ابراہیم آروی، مولٰینا شمس الحق ڈیانوی، مولٰینا عبدالغفور داناپوری، مولانا محمد سلیمان پھلواروی اور مولٰینا تلطف حسین قابل ذکر ہیں۔

درس و تدریس کے علاوہ آپ نے تصنیف و تالیف کے ذریعہ بھی دینی علوم و فنون کی خدمت انجام دی۔ ان کی چند اہم کتابیں یہ ہیں۔ الایمان یزید و ینقص، توثیق عبادۃ بن صامت، رسالہ در قرأۃ فاتحہ خلف الامام، تراویح سنت موکدہ، تحقیق حدیث جابر بن سمرہ در باب رفع یدین۔ تقویۃ الایمان، معیار الحق، مصرف مال زکوٰۃ اور حدیث شرط ابی داؤد۔ ۱۳۲۰ھ میں آپ کا وصال ہوا۔[۲]

مولٰینا ابراہیم آروی

مولٰینا ابراہیم آروی صوبہ بہار کے مشہور عالم اور محدث گذرے ہیں۔ ۱۲۶۴ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اس کے بعد دیوبند پھر علی گڈھ چلے گئے جہاں مولٰینا شیخ یعقوب بن مملوک علی نانوتوی اور مفتی لطف اللہ علی گڈھی سے استفادہ کیا۔ کچھ دنوں کے بعد سہارنپور کا سفر کیا اور مولانا احمد علی سہارنپوری سے صحاح ستہ اور حدیث کی دوسری کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد حج بیت اللہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ اور وہاں شیخ احمد بن زینی دحلان اور شیخ عبدالغنی بن ابی سعید دہلوی وغیرہ سے حدیث کی سند حاصل کی۔ ہندستان واپس آئے تو شیخ نذیر حسین بہاری ثم دہلوی اور شیخ غلام حسین بن محسن انصاری سے اجازت حدیث کی سند لی۔

انھوں نے آرہ میں مدرسہ احمدیہ کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا۔ اور تدریسی

---

[۱] الحیات بعد الممات

خدمات انجام دینے لگے، وہ غیر مقلد تھے اور اسی کی تبلیغ کرتے تھے۔ درس و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ طریق النجات، فقہ محمدی، ارکان اسلام، القول المزید فی احکام التقلید وغیرہ چند اہم کتابیں لکھیں اخیر عمر میں عرب گئے۔ اور وہیں ۱۳۱۹ھ میں انتقال کیا۔[1]

مولانا شمس الحق ڈیانوی

مولانا شمس الحق ڈیانوی ہندستان کے مشہور و معروف علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ ۱۲۷۳ھ میں رمنہ محلہ (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ پانچ سال کی عمر میں اپنی والدہ کے ساتھ اپنے ننیہال ڈیانواں چلے گئے۔ اور وہیں مستقل سکونت پذیر ہو گئے۔ ابتدائی کتابیں وہیں پڑھیں اس کے بعد لکھنؤ مرادآباد چلے گئے۔ جہاں درسیات کی تکمیل کی۔

۱۲۹۵ھ میں دہلی گئے اور وہاں مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی سے استفادہ کیا، اور حدیث کی سند حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد گھر واپس ہوئے۔ اور درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ درسی کتابیں نہایت عرق ریزی اور محنت سے پڑھاتے۔ یہانتک کہ دور دور تک ان کے علمی فضل وکمال کا شہرہ ہوا۔ اور پھر ہندستان کے علاوہ بیرون ہند سے طلبا بھی شریک درس ہونے لگے، طلبا کی کفالت خود ہی کرتے اور نہایت محبت و شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ تصنیف و تالیف کا اچھا ذوق پایا تھا۔ تقریباً ۳۰ کتابیں تصنیف کیں جو حدیث وفقہ کے موضوع پر تھیں۔ حدیث میں انہیں ایک اہم مقام حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ابوداؤد کی دو شرحیں غایۃ المقصود اور عون المعبود کے نام سے لکھیں جو اپنی تحقیق اور علمی برتری کی وجہ سے نہایت اہم سمجھی جاتی ہیں۔ ۱۳۲۹ھ میں ان کا انتقال ہوا۔[2]

---

[1] تراجم علمائے اہل حدیث ۱/۳۶ [2] مولانا شمس الحق عظیم آبادی: ۶۷

مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی

مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی (متوفی ۱۳۰۴ھ) بہار کے مشہور عالم دین اور محدث ہیں۔ مولانا حکیم سید عبدالحیٔ نے ان کی حدیث دانی کا تعارف اس طرح کرایا ہے۔[1]

"الشیخ العالم المحدث محمد سعید بن واعظ علی بن عمر وراز الجعفری الزینبی العظیم آبادی"

اس کے علاوہ ایک بار جب مولانا احمد علی محدث سہارنپوری بہار آئے تو انہوں نے فرمایا، کہ "صوبہ بہار میں مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی اس فن (حدیث) کے جامع بزرگ ہیں"

مولانا ظفر الدین بہاری

مولانا ظفر الدین بہاری ۱۳۰۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی کتابیں اپنے والد محترم سے پڑھیں۔ ۱۳۲۰ھ میں مدرسہ حنفیہ پٹنہ میں داخلہ لیا اور شاہ وصی احمد محدث سے اکتساب فیض کیا۔ اس کے بعد بریلی گئے، اور وہاں مولانا حامد حسن رام پوری، مولانا شبیر احمد علی گڈھی اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی سے خاص طور پر درسی کتابیں پڑھیں جس میں تفسیر وحدیث کے علاوہ منطق وفلسفہ اور اقلیدس کی کتابیں شامل تھیں۔ ۱۳۲۵ھ میں تحصیل علم سے فراغت کی۔ کچھ دنوں تک مدرسہ منظر الاسلام (بریلی) میں بحیثیت مدرس کام کرتے رہے۔ پھر مدرسہ حنفیہ میں مدرس ہوئے۔ اخیر میں مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں استاذ حدیث کی حیثیت سے بحال ہوئے آگے چل کر وہاں کے پرنسپل بھی ہوئے۔

آپ علوم نقلیہ کے ساتھ علوم عقلیہ کے بھی ممتاز علماء میں شمار ہوتے۔ آپ نے

---

[1] نزہۃ الخواطر: ۸/۴۳۰

درس و تدریس کے علاوہ درجنوں کتابیں تصنیف کیں۔ جو علوم نقلیہ، عقلیہ دونوں پر مشتمل تھیں۔ لیکن فن حدیث میں ان کا سب سے اہم کارنامہ وہ مجموعہ احادیث ہے جو "صحیح البہاری" کے نام سے معروف ہے۔ اور چھ جلدوں میں ہے۔ جلد اوّل عقائد، جلد دوم طہارت، جلد سوم زکوٰۃ، روزہ، حج، جلد چہارم نکاح، رضاع، طلاق، ایمان، جلد پنجم بیوع، قضا، شہادت، اور جلد ششم مزارعت، جنایات، اور رہن پر مشتمل ہے۔

آپ کی علمی عظمت اور برتری کی وجہ سے ملک العلماء کا خطاب ملا۔ ۱۳۸۲ھ میں وفات ہوئی۔[1]

---

[1] تذکرہ علمائے اہلسنت

باب سوم

خاندانی حالات

نیمی۔ تاریخ کی روشنی میں

نیمی (بروزن دہلی) پٹنہ ضلع کی ایک نہایت قدیم اور مشہور بستی ہے۔ جس کو آباد ہوئے کئی سو برس ہو گئے۔ یہ شہر پٹنہ سے پورب، دکھن جانب تقریباً ۲۸ کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس کی آبادی تقریباً ڈھائی سو ہے، یہاں تقریباً بائیس بگھہ کا ایک بڑا تالاب ہے۔ اس کے کنارے ایک خوب صورت اور عظیم الشان مسجد ہے۔ اس کے اتر جانب قبرستان اور تین طرف بستیاں ہیں، پورب والی بستی کو نیمی دکھن والی کو ممن پور (مؤمن پور) اور پچھم والی کو میاں چک کہتے ہیں۔ مؤخرالذکر دونوں بستیاں نیمی سے نہایت قریب ہیں جس کی وجہ سے اس کے محلے معلوم ہوتی ہیں۔

نیمی میں ہندو مسلم دونوں قومیں رہتی ہیں۔ علامہ ظہیر احسن شوق نیموی کی حیات تک یہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی۔ اور انہی لوگوں کا بول بالا تھا لیکن آج کل غیر مسلموں کی آبادی زیادہ ہے اور انہی لوگوں کا اثر و رسوخ بھی ہے۔ مسلم گھرانوں میں اب صرف پانچ چھ گھرانے باقی رہ گئے ہیں۔ جن میں علامہ شوق نیموی کے گھرانے کے کچھ افراد شامل ہیں۔ ورنہ بقیہ مسلم گھرانے یا تو دوسرے شہروں میں منتقل ہو گئے یا موت سے ہم کنار ہو گئے۔

مسلمانوں میں زیادہ تر شرفا تھے، اور یہ تمام شرفا صرف ایک فرد یعنی

شیخ شبیر محمد بن شیخ عبدالرزاق صدیقی مرحوم کی نسل سے تھے۔ علامہ شوق نیموی نے اپنی مشہور کتاب "یادگار وطن" میں ان حضرات کا مکمل شجرۂ نسب تحریر کیا ہے۔

نیمی کا علمی و مذہبی مقام

چوں کہ نیمی میں مسلم شرفا کی اکثریت تھی اسلئے یہاں ایک مخصوص مسلم تہذیب تھی۔ ان لوگوں میں لکھنے پڑھنے کا ذوق اور مذہبی امور سے خصوصی شغف تھا۔ اس بستی کی بڑی خوش نصیبی ہے کہ یہاں دو نامور صاحب کرامات بزرگ مدفون ہیں۔ ایک ملک الاولیا مخدوم حضرت بخش شہید قدس سرہٗ جن کے بارے میں علامہ شوق نیموی نے لکھا ہے کہ وہ بڑے ولی اور صاحب کرامات بزرگ تھے۔ ان کے مزار پر چراغ اکثر خود بخود روشن ہو جاتا تھا۔ ان کے مزار کے آس پاس لوگوں نے بعض اوقات کثیر جماعت کا صف باندھنا اور پھر نظروں سے غائب ہو جانا دیکھا ہے۔ پہلے ان کے مزار کی چہار دیواری پختہ تھی مگر رفتہ رفتہ امتداد زمانہ سے ایسی منہدم ہو گئی کہ اب اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

دوسرے بزرگ پیر راز غیب کے لقب سے مشہور رہیں۔ یہ بھی صاحب کرامات بزرگ تھے۔ درحقیقت یہ دونوں بزرگ نیمی کے دو قطب تھے۔[1]

اس کے علاوہ شیخ ابوالبرکات سید شاہ اکبر علی قدس سرہٗ بھی بڑے بزرگ آدمی تھے۔ یہ منی پور کے سادات میں تھے۔ بڑے صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ ان کے یہاں بیعت و ارادت کا سلسلہ جاری تھا، بہت سے لوگ ان کے مرید تھے۔ ۱۲۰۰ھ میں ان کا انتقال ہوا اور حضرت بخش شہید کے مزار سے

---

[1] یادگار وطن: ۹

دکھن جانب مذکورہ تالاب کے کنارے مدفون ہوئے۔[1]

حضرت شیخ چمن بن شیخ فتح علی قدس سرہٗ بھی ممن پور کے نہایت معزز اور بزرگ آدمی تھے۔ ان کا اصلی نام سبحان علی تھا۔ یہ دراصل موضع سالار پور کے رہنے والے تھے لیکن بعد میں ممن پور چلے گئے اور وہیں بس گئے۔ یہ مولینا شاہ عبدالوہاب[2] عرف شاہ دیدار علی مرحوم (ساکن داؤد نگر، گیا) کے مرید تھے۔

علامہ شوق نیموی نے لکھا ہے کہ نیمی وغیرہ کے اکثر پرانے لوگ فارسی زبان و ادب میں ان کے شاگرد تھے۔ خود علاّمہ شوق نیموی نے رقعات عالمگیری کے دو ایک اسباق کی تعلیم ان سے حاصل کی تھی۔ ۱۲۹۲ھ میں ان کا وصال ہوا اور برڑھونہ میں مدفون ہوئے جو نیمی سے قریب ایک موضع ہے۔[3]

شیخ الطاف حسین بن شیخ فضل علی بھی نیمی کے مشہور عالم تھے۔ وہ شروع سے اللہ والوں کی صحبت سے فیضیاب ہوتے رہے۔ پھر حضرت سید احمد شہید بریلوی قدس سرہٗ کے خلیفہ جناب محمد علی رام پوری کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور ان سے مذہبی کتابوں کا درس حاصل کیا۔ اس کے بعد اپنے وطن واپس آئے اور دعوت وارشاد کے کام میں مشغول ہو گئے۔ علامہ شوق نیموی نے لکھا ہے کہ ان کے دعوتی کام کی وجہ سے نیمی میں دینی امور کی کافی اشاعت ہوئی، اور دین کی اچھی خاصی فضا تیار ہو گئی۔ انہیں قرآن پاک کی تلاوت سے خصوصی شغف تھا، اور بالآخر

---

[1] یادگار وطن۔ ۱۱

[2] یہ حضرت سید احمد شہید بریلوی رح کے خلیفہ تھے۔ ان کے آباد اجداد دارانگر علاقہ بارڑھ کے رہنے والے تھے۔ جب ان کی شادی داؤد نگر میں ہوئی تو وہ وہیں رہنے لگے۔ وعظ ونصیحت میں زندگی بسر کی۔ نگرنہسہ کے اکثر عمائدین ان کے مرید تھے۔ ۱۲۶۲ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

[3] یادگار وطن: ۲۴

قرآن پاک سنتے ہی سنتے ۱۳۰۹ھ میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی [1]
علامہ شوق نیموی نے ان کے انتقال پر مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ کہا ہے۔

شیخ الطاف حسین مرحوم — جامع زہد و کمالات و ہمم
ششم ماہ ربیع الآخر — زین جہان رفت بگلزار ارم
شوق تاریخ وفاتش گفتم — کردہ رحلت بجنان کان کرم [2]
۱۳۰۹ھ

خلاصہ یہ کہ یہی چند بزرگان دین اور علمائے کرام ہیں جن کے فیوض و برکات اور علمی فضل و کمال کی وجہ سے نیمی میں دین کی بہت زیادہ اشاعت ہوئی اور علمی و ادبی ماحول پیدا ہوا۔

نیمی۔ علامہ شوق نیموی کی نظر میں

چوں کہ یہ بستی نہایت خوبصورت جگہ پر واقع ہے۔ یہاں کے خوب صورت تالاب، اس کے قریب عالی شان مسجد، باغات اور سبزہ زار اپنے اندر خاص کشش رکھتے ہیں اور مذہبی، علمی و ادبی ماحول کو زینت بخشتے ہیں۔ اس لئے ہر آدمی اس کو دیکھ کر متاثر ہوتا ہے، اور اس کی ظاہری و باطنی خوبصورتی کی مدح سرائی کرتا ہے۔

علامہ شوق نیموی چوں کہ یہیں پیدا ہوئے تھے اور ان کی زندگی کا بیشتر حصہ یہیں گذرا تھا، اس لئے وہ اپنے وطن کی خوبصورتی اور حسن سے بہت زیادہ متاثر تھے، انہوں نے اپنے وطن کی یاد میں خاص طور پر ایک کتاب لکھی جس کا نام "یادگار وطن" رکھا۔ اور نہایت والہانہ انداز میں یہاں کے

---

[1] یادگار وطن: ۱۶
[2] یادگار وطن: ۱۷

واقعات تحریر کیے۔ انہوں نے اس کتاب میں نیمی کی تعریف میں دو نظمیں لکھی ہیں اور اس کے ساتھ اپنی الفت و محبت کا اظہار کیا ہے۔ ایک نظم ملاحظہ ہو ؎

بہار اس کی نہ کیوں بھائے کہ ہے میرا وطن نیمی
بنا ہیں خوشنوا بلبل بنی صحن چمن نیمی
جو کوئی شام غربت کا تھکا ماندا پہنچتا ہے
دکھاتی ہے بہار جلوہ صبح وطن نیمی
چلو اب سبزہ زاروں سے بہار بوستاں لوٹیں
بنی ہے آج کل برسات سے رشک چمن نیمی
جوانان صنوبر قد و گل اندام کے صدقے
نہیں رکھتی مقرر حاجت سرو و سمن نیمی
وہ تالاب اور وہ آب رواں وہ سرخ نیلوفر
لبھا لیتے ہیں دل رکھتی ہے وہ دلکش پھبن نیمی
کسی کے خانۂ مشکیں رقم کی عطر بیزی سے
اگر سچ پوچھئے ہے غیرت ملک ختن نیمی
نہاں تھی گرد گمنامی میں لیکن ابر رحمت سے
چمک اٹھی یکایک صورت دُرِّ عدن نیمی
ہوا جوہر عیاں جس دم کھینچا دل ایک عالم کا
ہوئی مشہور بنگالے سے لے کر تا دکن نیمی
دل ہندوستاں بیشک عظیم آباد پٹنہ ہے
مقرر ہے سویدا اس کا اے اہل سخن نیمی

جدائی ایک دم کی جیتے جی کیوں کر گوارا ہو
کہ میں روح رواں ہوں اور ہے میرا بدن نیمی

مزار حضرت بخشش یہاں ہے باعث رحمت
نہ ہو کیوں مورد الطاف خلاق زمن نیمی

یہی اے شوق میری التجا ہے حضرت حق میں
رہے آباد محشر تک مرا پیارا وطن نیمی [1]

خاتمہ کتاب پر تقریباً ایک صفحہ پر علامہ شوق نیموی نے اپنے وطن کی تعریف کی ہے جو نثر میں ہے۔ چند جملے ملاحظہ ہوں:۔

"اے میرے پیارے وطن نیمی خدا تجکو آباد رکھے، تیرا ذکر بھی عجب لطف آمیز ہے۔ غضب کا لذت انگیز ہے۔ جی نہیں چاہتا کہ میں چھوڑوں۔ سکوت اختیار کروں، مگر کیا کروں اگلی باتیں کہاں تک لکھوں .... اور سچ کہتا ہوں کہ مجکو تجھ سے ایسی محبت ہے کہ قیامت تک تیری دلکش صورت نہ بھولے گی۔ ہر دم تیرا سماں آنکھوں میں رہے گا۔ اے میرے خدا جو دعا دل سے نکلتی ہے تو اس کو رد نہیں کرتا۔ میں اس وقت نہایت عاجزی کے ساتھ تیری درگاہ عالی میں ہاتھ اوٹھا کے التجا کرتا ہوں کہ جو لوگ نیمی میں پیدا ہوئے یا یہاں آکے بسے یا یہاں کی خاک کے پیوند ہوئے یا جن کو میرے پیارے وطن سے کچھ بھی تعلق ہے تو اپنی رحمت واسعہ اور شان کریمی کے صدقے اون کو باایمان اوٹھانا، اور اون کے گناہوں کو معاف کرنا، اور جنت میں داخل کرنا۔ آمین ثم آمین!"

---

[1] یادگار وطن: ۱۰

اس کے بعد دوسری نظم تحریر کی ہے۔ جو نہایت خوب صورت اور والہانہ ہے۔ وہ یہ ہے ؎

اے خداوند آسمان و زمیں
خالق عرش پاک و خلد بریں
عالم الغیب ہے لقب تیرا
حال تو جانتا ہے سب میرا

ہوں میں دلدادہ بہار وطن
مجکو ہمی سے خاص الفت ہے
بلبل گلشن وطن ہوں میں
جوش الفت میں نغمہ زن ہوں میں

مجکو ہر خار میں یہاں کے بہار
نظر آتی ہے صورت گل زار
ہیں نظر میں کچھ اور جھاڑ پہاڑ
ہر شجر پر یہاں کے ہوں میں نہال

دل میں حب الوطن جو ہے جاگیر
ہے یہاں کا غبار مجھ کو عبیر
ٹوٹے پھوٹے جو ہیں در و دیوار
دل عاشق کے ان میں ہیں آثار

بلبلوں کو چمن مبارک ہو
مجکو میرا وطن مبارک ہو

یا خدا ہے یہی دعا میری
صدق دل سے ہے التجا میری

ہے جو نیمی مرا وطن پیارا
اک جہاں کی ہو آنکھ کا تارا

رہے یہ گاؤں حشر تک آباد
رہنے والے رہا کریں یہاں کے شاد

شوق کب تک یہ زمزمہ خوانی
ہو چکی آپ کی گل افشانی

لکھئے تاریخ سال رشک چمن
ہے طرازندہ ذکر اہل وطن[1]
۱۳۱۲

علامہ شوق نیموی کے جد امجد

علامہ شوق نیموی کے جد امجد نہایت غریب پرور، بہادر، خلیق، اور مالدار آدمی تھے۔ ان کا نام شیخ دھومن تھا جو موضع بر ڈیہہ میں ۱۱۹۷ھ میں پیدا ہوئے۔ ستودۂ اخلاص تاریخ ولادت ہے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت وہیں ہوئی۔ بی بی حیدن سے انکا عقد ہوا جو جناب شیخ اکبر علی نیموی کی صاحب زادی تھیں۔ علامہ نیموی نے اپنے دادا کا واقعہ خود لکھا ہے، کہ موضع چک دھری کے دو زمیندار دعویدار تھے اور دونوں اس پر قبضہ چاہتے تھے۔ ایک طرف شیخ دھومن علامہ نیموی کے جد امجد تھے اور دوسری جانب شیخ دوست علی، اشرف پوری تھے۔

---

[1] یادگار وطن: ۱۵۴

جب دھان کی فصل تیار ہو گئی تو شیخ دھومن اپنے چند آدمیوں کو لے کر کھلیان پہنچے۔ مخالفین کو اس کی خبر ہوئی تو ایک جماعت کے ساتھ تلوار، گنڈاسہ اور لاٹھی وغیرہ لے کر یکایک ٹوٹ پڑے۔ شیخ دھومن انبوہ کثیر دیکھ کر گھبرا گئے کیوں کہ چاروں طرف سے گھر گئے تھے اور جان بچانی مشکل نظر آرہی تھی لیکن پھر خدا پر بھروسہ کیا اور صبر و ضبط سے کام لیا۔ اور اپنی جماعت کو پکار کر کہا کہ کیا تم لوگوں کے رہتے ہوتے میری جان چلی جائے گی۔ ایک آدمی پر اس کا کافی اثر ہوا جوان کا نمک خوار تھا۔ وہ اپنے مالک کی بے بسی دیکھتے ہی ایک دوسرے آدمی کی تلوار چھین کر مخالفین پر سخت حملہ آور ہوا جس کے نتیجہ میں کئی مخالفین زخمی ہوئے اور شیخ دوست علی کا ایک ہاتھ کٹ گیا۔ اس کے بعد معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا اور لوگ منتشر ہو گئے۔

مخالفین کی طرف سے محکمۂ فوجداری میں مقدمہ دائر ہوا اور کئی مہینے تک چلتا رہا۔ جھوٹے گواہوں کی گواہی سے شیخ دھومن کے بارے میں ثابت ہوا کہ شیخ دوست علی کا ہاتھ انہوں نے ہی کاٹا ہے۔ اس بنا پر شیخ دھومن کو سات برس کی قید کی سزا ہو گئی چنانچہ شیخ دھومن جیل بھیج دیئے گئے۔ جب رہائی کے چند روز باقی رہ گئے تو ۱۲۷۴ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اور صاحب گنج میں دفن ہوئے [۱]

شیخ دھومن کے چار لڑکے تھے جو شیخ سبحان علی، شیخ شجاعت علی، شیخ سعادت علی اور شیخ سخاوت علی کے نام سے معروف تھے۔ ان میں سب سے بڑے علامہ نیموی کے والد محترم شیخ سبحان علی تھے۔

علامہ نیموی نے اپنے چچا اور اپنے والد محترم کے حالات اس طرح لکھے ہیں:۔

---

[۱] یادگار وطن : ۲۷

شیخ سخاوت علی | یہ علامہ نیموی کے سب سے چھوٹے چچا تھے۔ نہایت خلیق اور جواں مرد تھے۔ ڈنڈ مگدر کا بہت شوق تھا۔ ۱۲۷۵ھ میں انتقال کیا، اور حضرت بخش شہید کے جوار میں مدفون ہوئے۔[۱]

شیخ سعادت علی | یہ علامہ نیموی کے منجھلے چچا ہیں۔ ۱۲۳۲ھ میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی استعداد بڑی اچھی تھی۔ نہایت خوش نویس تھے۔ شاہنامہ فردوسی، گنج شائیگاں[۲] اور ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دوسری کتابیں علامہ نیموی کے کتب خانہ میں موجود تھیں۔[۳]

---

[۱] یادگار وطن: ۳۵ [۲] علامہ نیموی کا کتب خانہ گرچہ تباہ و برباد ہوگیا۔ لیکن خوش قسمتی سے گنج شائیگاں کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری میں آگیا ہے۔ اور وہ اس وقت میرے سامنے ہے۔ جنوری ۱۹۵۶ء میں مولانا عبدالرشید فوقانی نے اس نسخہ کو خدابخش لائبریری میں ہدیۃً دے دیا تھا۔ یہ لالہ رام چند فرحت عظیم آبادی کی ایک نہایت اہم اور خوبصورت غیر مطبوعہ فارسی مثنوی ہے۔ جو ۱۱۰۸ھ میں مکمل ہوئی اور جس میں حاتم طائی کا قصہ نظم کیا گیا ہے۔ چوں کہ گنج شائیگاں کا نسخہ نہایت نایاب تھا۔ اس لئے علامہ نیموی کی فرمائش پر شیخ سعادت علی نے کسی دوسرے نسخہ سے یہ نسخہ اپنے ہاتھ سے لکھا۔ یہ نسخہ نہایت خوب صورت اور واضح ہے۔ اس کے آخر میں علامہ شوق نیموی کا مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ درج ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ ۱۲۹۹ھ میں یہ نسخہ لکھا گیا۔

جذا این کتاب جود وسخا — کہ نظیرش کسی ندید و شنود
بہزار آب و تاب شد منقول — از عنایات و لطف رب ودود
از ابتدائش بانتہا مجموعی — حسب فرمائشم رقم فرمود
سال تحریر بروز گفتمش شوق — ماہ ذوالقعدہ روز جمعہ بود

(گنج شائیگاں (قلمی)، کتاب نمبر ۲۳۲۶ ص ۷۰)

[۳] یادگار وطن: ۳۵

شیخ شجاعت علی

یہ علامہ نیموی کے منجھلے چچا تھے۔ فارسی کے علاوہ عربی بھی کسی قدر جانتے تھے اور نہایت خوش خط تھے شرح نصاب صبیانی اور صرف کی چند کتابیں انہوں نے اپنی ہاتھ سے لکھی تھیں، جو علامہ نیموی کے کتب خانہ کی زینت تھیں۔ مور اور کبوتر وغیرہ کے پالنے کا شوق تھا۔ ۱۲۷۴ھ میں ان کا وصال ہوا۔ علامہ نیموی نے مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ کہا ہے ؎

شد بجہاں شیخ شجاعت علی
طالب خلاق جہاں حق پسند
خامۂ من سال وفاتش نوشت
رفت بہ گلزار جناں حق پسند[۱]
۱۲۷۴ھ

والد محترم

علامہ شوق نیموی کے والد محترم کا نام شیخ سبحان علی تھا ۱۲۲۱ھ میں نیمی میں پیدا ہوئے۔ "صاف ضمیر" تاریخِ ولادت ہے۔ تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی۔ جب جوان ہوئے تو مولانا محمد فصیح غازی پوری کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ چوں کہ زیادہ وقت علماء کی صحبتوں میں گذارتے تھے۔ اس لئے دینی علوم و فنون اور علما کرام سے خصوصی لگاؤ تھا۔ مولانا محمد ابراہیم نگرنہسوی سے ان کے نہایت گہرے تعلقات تھے اور مولانا بھی نہایت شفقت و محبت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ ان کا کوئی لڑکا عالم دین ہو چنانچہ انہوں نے اپنے بڑے لڑکے مولوی محمد نظیر احسن کی تعلیم کی طرف

---

[۱] یادگار وطن: ۱۴

خصوصی توجہ دی جس کی بنا پر وہ درجہ فضیلت تک پہنچ چکے تھے لیکن درمیان میں دنیاوی مشغولیتیں حائل ہوگئیں جس کی وجہ سے وہ اس تعلیم کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ بالآخران کی یہ آرزو علامہ شوق نیموی نے پوری کردی۔

ان کے علمی ذوق کا یہ حال تھا کہ کتابیں خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر اپنے پاس جمع کرتے یا دوسروں سے لکھوا کران کی حفاظت کرتے تھے۔ علامہ شوق نیموی نے لکھا ہے کہ شاہنامہ فردوسی جلد سوم، دیوان حافظ، قصّہ حاتم طائی اور دیوانِ جوشش جیسی اہم اور گراں قدر کتابیں انھوں نے اپنے ہاتھ سے لکھی تھیں اور یہ کتابیں علامہ نیموی کے کتب خانہ میں محفوظ تھیں۔

شیخ سبحان علی ۱۲۹۶ھ میں یکایک لقوہ کے مرض میں گرفتار ہوئے لاکھ علاج ہوا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا اور بالآخر دو ایک روز کے بعد اس دار فانی سے کوچ کر گئے اور حضرت بخش شہیدؒ کے مزار کے قریب مدفون ہوئے[1]

علامہ شوق نیموی اس عظیم حادثہ سے نہایت متاثر ہوئے۔ انھوں نے اپنے شفیق والد کے انتقال پر تین تاریخی قطعات کہے جن میں سے ایک قطعہ حاضر خدمت ہے

حسرتا شد انتقال والد مرحوم من
رحمت حق باد نازل بر مزارش دمبدم

بود روز پنجشنبہ از مہ ذی الحجہ آہ
روز عیشم شد سیہ از ظلمت شام الم

خواستم تاریخ فوت آنجناب پاکذات
تا کنم بر صفحہ لوح دل محزوں رقم

---

[1] یادگار وطن: ۲۹

عندلیب فکر شوق بے نوا شد نعرہ زن
عیسوی تاریخ فوتش داخل باغ ارم[1]

شیخ سبحان علی کی دو شادیاں ہوئی تھیں۔ پہلی بیوی سے حکیم محمد نذیر احسن اور منشی ظہور احسن تھے۔ دوسری بیوی سے دو لڑکیاں، علامہ شوق نیموی، اور فرید احسن تھے۔ علامہ نیموی نے صرف منشی ظہور احسن اور فرید احسن کے حالات بیان کئے ہیں وہ یہاں تحریر کئے جاتے ہیں۔

منشی ظہور احسن

یہ علامہ شوق نیموی کے منجھلے علاتی بھائی ہیں۔ ۱۲۶۷ھ میں پیدا ہوئے۔ "خدا پرست" تاریخ ولادت ہے اردو و فارسی کی اعلیٰ استعداد تھی۔ دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ علامہ نیموی نے یادگار وطن میں جابجا ان کے تاریخی قطعات پیش کئے ہیں منشی ظہور احسن نے اپنے والد کے انتقال پر تاریخی قطعات کہے تھے۔ تین قطعات علامہ نیموی نے تحریر کئے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ قطعات یہاں بھی نقل کر دیئے جائیں، تاکہ منشی ظہور احسن کی شعری صلاحیت کا ہمیں پوری طرح اندازہ ہو سکے۔ قطعات ملاحظہ ہوں ؎

چوں بہ ذی الحجہ روز بست و ششم
والدم عازم جناں ــــ گردید
سرد آہے کشید و گفت ظہور
روح سبحان علی بخلد پرید
۹۶ ۱۲ھ

* ــــــــ *

[1] یادگار وطن: ۳۳

والدم چوں وفات کرد ظہور
آہ من خواست سینہ ام بدرد
سال فصلی شد اذن حق چون یافت
روح سبحان علی بخلد برد

روح سبحان علی را رضوان
چوں زد نائے دنی برد بخلد
سال فصلی اش رقم کرد ظہور
روح سبحان علی برد بخلد[1]

محمد فرید احسن فرد

یہ علامہ شوق نیموی کے چھوٹے حقیقی بھائی ہیں ۱۲۸۱ھ میں پیدا ہوئے غازی پور میں علامہ نیموی کے ساتھ تھے۔ اور ان سے عربی کی کتابیں پڑھتے تھے۔ غازیپور کی ادبی مجلسوں میں شریک ہونے کی وجہ سے انہیں شعرگوئی کا شوق ہوا اور فرد تخلص رکھ کر شاعری شروع کی، ان کی ایک مثنوی نیرنگ الفت" کے نام سے لکھنؤ سے چھپی پھر دوبارہ اسٹار آف انڈیا آرہ سے شائع ہوئی۔

علامہ نیموی جب لکھنؤ تشریف لے گئے تو ان کا تعلیمی سلسلہ منقطع ہوگیا اور شعر و شاعری سے بھی دلچسپی ختم ہو گئی۔ چند غزلیں کہی تھیں جو ضائع

---

[1] یادگار وطن: ۳۳، ۳۴

ہوگئیں۔ علامہ نیموی نے ان کی گمشدہ غزلوں کے ۱۲۱ اشعار بطور نمونہ کلام تحریر کئے ہیں۔ یہاں ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

جب پوچھتا ہوں ان سے کہ دل کیا مرا ہوا — کہتے ہیں ناز سے کہ خدا جانے کیا ہوا
خوب روتے جان کے اپنا شکستہ دل — دیکھا جو جام مے کوئی ٹوٹا پڑا ہوا
دل پھنس چکا ہے زلف میں کنگھی نہ کیجئے — پھندے سے چھوٹ جائے گا طائر پھنسا ہوا
آیا وہیں خیال کسی گل عذار کا — گلشن میں کوئی پھول جو دیکھا کھلا ہوا

رکھتے ہو دل سے فرد عبث تم کوئی امید
عالم میں کب کسی کا کوئی آشنا ہوا

علامہ نیموی نے یہ بھی لکھا ہے کہ جناب ضیغم حیدرآبادی نے تذکرہ یادگار ضیغم میں محمد فرید احسن فرد کے حالات لکھے ہیں اور ان کے متفرق اشعار بطور نمونہ کلام درج کئے ہیں[1]

اس کے علاوہ چوں کہ فرید احسن نہایت خوش نویس تھے اور علم و ادب سے دلچسپی رکھتے تھے اس لئے انہوں نے کئی قلمی کتابیں اپنے ہاتھ لکھی تھیں۔ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک نسخہ جو گنج باد آور کے نام سے ہے خدابخش لائبریری میں موجود ہے۔ گنج باد آور لالہ رام چند فرحت عظیم آبادی کی ایک دوسری فارسی مثنوی ہے جو گنج شائیگاں کا دفتر دوم ہے اور نہایت نایاب ہے اس کی ندرت ہی کی وجہ سے شیخ محمد فرید احسن نے اپنے ہاتھ سے ۱۳۰۰ھ میں اس کی کتابت کی۔ اس نسخہ کے حاشیہ پر مولانا عبدالرشید فوقانی نے لکھا ہے کہ اس وقت شیخ محمد فرید احسن کی عمر انیس سال تھی[2]

۱؎ یادگار وطن، ص ۱۳۱ ۲؎ گنج باد آور (قلمی) کتاب نمبر ۳۳۲۷ ص ۴۲۹

باب چہارم

حالات زندگی

پیدائش، نام، کنیت

علامہ شوق نیموی ۱۴ جمادی الاولیٰ بروز بدھ ۱۲۷۸ھ ہجری صالح پور ضلع پٹنہ میں اپنی خالہ کے ہاں پیدا ہوئے۔ نام محمد ظہیر احسن رکھا گیا، کنیت ابو الخیر اور ظہیر الاسلام مادۂ تاریخ قرار پایا۔ علامہ نیموی نے اپنی پیدائش اور کنیت وغیرہ کے بارے میں خود ہی ایک رباعی کہی ہے جو اس طرح ہے [1]

شوق است تخلصم ظہیر احسن نام
در قریۂ دلنواز نیمی است مقام
شد از پے کنیتم، ابو الخیر الہام
تاریخ تولدم ظہیر الاسلام ۱۲۷۸ھ

سلسلۂ نسب

علامہ شوق نیموی کا سلسلۂ نسب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ انہوں نے اپنا شجرۂ نسب اس طرح تحریر کیا ہے:۔

محمد ظہیر احسن بن شیخ سبحان علی بن شیخ دھومن بن شیخ فتح علی بن شیخ محمد وزیر بن شیخ محمد ولی بن شیخ غلام بدر بن شیخ عبد الہادی بن شیخ نصیر بن شیخ محمد صالح بن شیخ ضیاء اللہ بن شیخ عبد الغنی بن شیخ عبد الرحمن بن شیخ عبد اللہ بن شیخ نور اللہ بن شیخ حضرت محمد زاہد قدس سرہٗ بن شیخ محمد عابد صدیقی بن شیخ اسماعیل بن شیخ ابراہیم بن عبد السلام بن عبد الغفار بن عبد الرزاق

---

[1] یادگار وطن، ۵۰

بن عبدالعزیز بن عثمان بن سالم بن سعید بن عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن عبدالحمید بن جعفر بن یحیٰ
بن عبداللہ بن عیسیٰ بن خلیل بن عاصم، بن قاسم بن علی بن عبدالرحمٰن بن قاسم بن محمد بن ابی
بکر رضی اللہ عنہم[1]

ابتدائی تعلیم و تربیت

علامہ نیموی کی ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی۔ جب پانچ چھ برس کے ہوئے تو بسم اللہ شروع ہوئی اور مکتب میں بٹھائے گئے۔ فارسی کی دو چار کتابوں کے بعد عربی شروع کر دی مختلف معلمین نے انہیں پڑھایا، لیکن کسی معلم سے مار کھانے کی نوبت نہیں آئی کیوں کہ بچپن ہی سے نہایت محنتی مہذب اور تربیت یافتہ تھے۔ اس کے برخلاف ان کے والد صاحب تعلیم و تربیت کی خاطر انہیں اکثر مارتے تھے اور اس بری طرح مارتے تھے کہ دیکھنے والے ترس کھاتے تھے۔

علامہ شوق نیموی اس مار کو اپنے لئے نہایت مفید قرار دیتے ہیں، اور نہایت لطف اندوزی کے ساتھ اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:۔

"مختلف حضرات سے تعلیم ہوئی مجھے یہ تو خیال نہیں کہ کسی اور معلم سے مار کھائی یا نہیں، مگر یہ خوب یاد ہے کہ والد محترم کے ہاتھوں مجھ پر اس قدر چھڑیاں پڑی ہیں کہ دیکھنے والے ترس کھاتے تھے اور جن کا مزا اب تک یاد ہے۔ اس وقت وہ چھڑیاں خار سے بھی بدتر تھیں مگر کیا خبر کہ ضرب الصبیان کالماءِ فی البستان ایک دن یہ مار کی چھڑیاں پھولوں کی چھڑیاں ہو کر گلزار کی بہار دکھائیں گی"[2]

شعری ذوق

قدرت نے علامہ شوق نیموی کو شعری ذوق فطری طور پر ودیعت کی تھی۔ ابھی وہ نہایت کم سن تھے کہ فی البدیہہ اشعار موزوں کر لیتے تھے۔ اردو اور فارسی کے سیکڑوں اشعار انہیں زبانی یاد تھے۔

---

[1] یادگار وطن ۱-۵۶ [2] یادگار وطن ۵۰

بیت بازی میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے لیکن کبھی شکست نہیں کھاتے تھے کیوں کہ بروقت اساتذہ کا شعر یاد نہیں آتا تو خود فی البدیہہ شعر کہہ کر پیش کر دیتے اور حریف کو گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ شعر ان کا اپنا کہا ہوا ہے۔ اسی واقعہ کو انھوں نے بڑے اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں :-

• لڑکپن ہی میں خدا نے طبیعت ایسی موزوں بنائی تھی کہ جب میں گلستاں ہی پڑھتا تھا تو فی البدیہہ شعر موزوں کر لیتا تھا۔ ان میں غلطیاں تو ضرور ہوں گی مگر ایسی نہ تھیں کہ غیر شاعر کوئی تمیز کر سکتا۔ والد مرحوم نے بیت بازی کے لئے بہ ترتیب حروف تہجی اساتذہ کے بہت سے اشعار جمع کر دیئے تھے جن کے آخر میں راء مہملہ تھی اور وہ اشعار مجھے یاد کرا دیئے تھے۔ میں جب کسی برات کے ساتھ غیر بستی میں جاتا اور وہاں کے لڑکے بیت بازی کے لئے پہنچتے اور بیت بازیاں شروع ہوتیں تو میں وہی رائے مہملہ والے اشعار پڑھتا جس کے جواب میں ان لوگوں کا قافیہ تنگ ہو جاتا۔ بارہا ایسا بھی ہوا کہ حریف کو بھی کسی خاص حرف کے اشعار بہت یاد تھے جن سے مجھ کو وقت پڑتی مگر جب استاد کا کوئی شعر یاد نہیں آتا تو نظم کر کے جواب دے دیتا۔ اون بیچاروں کو وہم تک نہ ہوتا کہ یہ شعر اس کا طبع زاد ہے۔ کہاں تک جواب دیتے آخر مات کھا جاتے۔ مجھے خوب خیال ہے کہ بیت بازی کے معرکے میں کبھی بھی کسی سے مات نہیں ہوا "[1]

---

[1] یادگار وطن : ۵۰

پٹنہ اور غازی پور کا تعلیمی سفر

فارسی و عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد علامہ نیموی کو شوق ہوا کہ اب دوسرے علمی مراکز میں پہنچکر علوم دینیہ کی تکمیل کی جائے اور علم کی تشنگی بجھائی جائے چنانچہ اس غرض سے سب سے پہلے وہ پٹنہ (عظیم آباد) پہنچے اور شمس العلما، مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی[1] (متوفی ۱۳۰۴ھ) کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا نے بھی ہونہار طالب علم کی عزت افزائی کی اور ان کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ دی۔ علامہ نیموی

---

[1] مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی ہندستان کے مشہور و معروف علما میں شمار ہوتے ہیں۔ ۲۷ ذیقعدہ سنہ ۱۲۳۱ھ میں عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی واعظ علی تھا۔ جو عظیم آباد کے ایک معزز رئیس تھے۔ حسرت عظیم آبادی نے ابتدائی تعلیم گھر پر مکمل کی بعد میں کانپور جاکر مولانا شاہ محمد سلامت اللہ کی خدمت میں رہ کر علوم دینیہ کی تکمیل کی۔ ۱۳۰۳ھ میں سرکار عالی نے شمس العلما کا خطاب دیا۔ شاعری بچپن ہی سے شروع کر چکے تھے۔ مگر زیادہ تر عربی و فارسی میں شعر کہتے اردو سے کم تعلق تھا۔ احباب کے اصرار پر کبھی کبھی کچھ کہہ دیتے تھے۔ آپ فارسی میں حسرت اور عربی میں سعید تخلص کرتے تھے۔ تاریخ گوئی میں کمال تھا۔ فارسی میں دو دیوان قسطاس اور مقصد البلاغہ چھپ چکی ہیں۔ عزیز الدین بلخی نے اپنی کتاب میں اردو کے ۱۲ اشعار اور لالہ سری رام نے ۴ اشعار تحریر کئے ہیں۔ ثانی الذکر مصنف کے پیش کردہ اشعار اس طرح ہیں: ؎

دل ترا جور پہ مائل نہ ہوا تھا سو ہوا — تجھ سے آزردہ مرا دل نہ ہوا تھا سو ہوا
زخم دل پر مرے ہنس ہنس کے چھڑکتے ہو نمک — یہ مزا عشق کو حاصل نہ ہوا تھا سو ہوا
کیا تڑپ کر دل مجروح نے کی بے لطفی — خون سے تر دامن قاتل نہ ہوا تھا سو ہوا

پا گیا عشق مجازی سے حقیقت کو سعید
للہ الحمد کہ کامل نہ ہوا تھا سو ہوا

۲ر شعبان المعظم سنہ ۱۳۰۴ھ میں انتقال کیا۔
خمخانۂ جاوید ۲/۵۶۴، تاریخ شعرائے بہار ۱/۱۰

وہاں کئی سال رہے، کچھ کتابیں مولانا حسرت عظیم آبادی سے اور کچھ کتابیں دوسرے اساتذہ سے پڑھیں، لیکن ان کی سیری یہاں بھی نہ ہوئی اور پھر کسی دوسرے بڑے علمی مرکز میں جانے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ اس کے بعد غازی پور گئے جہاں مولانا مفتی محمد فرنگی محلی[1] (متوفی ۱۳۰۵ھ) نے مدرسہ چشمۂ رحمت قائم کیا تھا اور پورے ملک میں ان کے علم وفضل کا شہرہ تھا۔ ان کے یہاں دو چار روز قیام کیا۔ اس کے بعد مدرسہ چشمۂ رحمت میں داخلہ لے لیا۔ اس وقت مولانا حافظ

---

[1] مولانا مفتی محمد فرنگی محلی کے بارے میں علامہ نیموی نے خود ہی لکھا ہے کہ وہ اولوالعزم بزرگ تھے۔ ۱۸۵۷ء تک لکھنؤ میں مفتی کی حیثیت سے کام کرتے رہے اس کے بعد غازی پور چلے گئے۔ وہاں کی جہالت اور تعلیم کی کمی دیکھ کر انہوں نے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی جو آگے چل کر دکٹوریہ اسکول کے نام سے مشہور ہوا۔

اس کے بعد ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی جو مدرسہ چشمۂ رحمت سے معروف ہے۔ اس مدرسہ سے سیکڑوں لڑکے تعلیم یافتہ اور عالم بن کر نکلے۔

انہوں نے کئی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جن میں ہدایۃ الصبیان فی حل المیزان، کاشف الابواب، شرح منشعب۔ عمدہ شرح زبدہ اور رحمت شرح خلاصۃ الحساب چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔

ان کا انتقال ۱۷ رجمادی الاولی روز سہ شنبہ ۱۳۰۵ھ میں ہوا۔

(یادگار وطن: ۵۱)

عبداللہ[1] اور مولانا عبدالاحد شمشاد لکھنوی[2] ہندستان کے نامی گرامی علماء ہیں

---

[1] مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری فقہ وحدیث کے مشہور عالم تھے۔ والد کا نام عبدالرحیم تھا۔ وہ مئوناتھ بھنجن (اعظم گڑھ) میں ۱۲۶۱ھ میں پیدا ہوئے پہلے غازی پور اور جونپور میں علم دین حاصل کیا۔ اس کے بعد دہلی گئے وہاں مولینا سید نذیر حسین دہلوی سے فقہ اور حدیث کا علم حاصل کیا۔ ۱۲۹۷ھ میں حج بیت اللہ کے لئے گئے، اور پھر واپس آکر غازی پور میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا، اس کے علاوہ ڈیانوان (ضلع پٹنہ)، اور آرہ گئے اور تدریسی خدمات انجام دیں۔ عامل بالحدیث تھے، اور تقلید ائمہ کے مخالف۔ مشہور عالم شیخ محمد بشیر سہسوانی کے انتقال کے بعد لوگوں نے اصرار کیا کہ وہ ان کی جگہ پر دہلی جاکر درس دیں چنانچہ وہ دہلی چلے گئے، اور درس دینے لگے۔ پھر لکھنؤ آئے اور وہیں ۱۳۳۷ھ میں انتقال کیا۔

انہوں نے صرف ونحو اور فقہ کے موضوع پر کئی کتابیں تصنیف کیں۔ پچیس برس سے زیادہ مسند درس وتدریس پر فائز رہے اور علوم دینیہ کی اشاعت کی۔ (نزہتہ الخواطر ۸/۲۸۷)

[2] مولانا عبدالاحد شمشاد لکھنوی ۲ صفر ۱۲۶۶ھ کو پیدا ہوئے۔ والد کا نام عبدالرحیم تھا۔ جو ہندستان کے مشہور عالم مولانا قطب الدین سہالوی کے خاندان سے تھے حضرت شمشاد نے ۱۴، ۱۵ برس کی عمر سے شاعری شروع کردی تھی پہلے حضرت قلق کے شاگرد ہوئے۔ اس کے بعد مولانا عبدالعلیم آسی کو اپنا کلام دکھانا شروع کیا۔ اپنے ذوق مطالعہ کی بنا پر بہت جلد ہندستان کے مشاہیر علماء اور شعرا میں شمار ہونے لگے۔ تمام عمر درس وتدریس میں بسر کی۔ آخر عمر تک مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور میں معلم رہے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد کافی تھی۔ علامہ شوق نیموی بھی ان کے شاگردوں میں تھے۔ ۱۹۲۵ء میں انتقال ہوا۔ ان کے تین دیوان چھپ چکے ہیں وہ اپنے اشعار میں نازک سے نازک مضامین نہایت سادگی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ عربی الفاظ کے بجائے اردو وہندی کے الفاظ بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ عمر بھر غزل کہی۔ آپ کی غزل میں اخلاق، صداقت۔ صبر، رضا (بقیہ اگلے صفحہ پر)

شمار ہوتے تھے۔ بلکہ مولانا عبدالاحد شمشاد تو دنیائے شعر و ادب میں بھی اہم مقام رکھتے تھے۔ علامہ شوق نیموی کی خوش قسمتی تھی کہ یہ دونوں بزرگ ان دنوں مدرسہ چشمۂ رحمت میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے۔ علامہ نیموی نے ان دونوں اساتذہ سے پورا پورا کسب فیض کیا جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

شوق تخلص

جن دنوں علامہ شوق نیموی غازی پور میں زیر تعلیم تھے اسی زمانے میں منشی سید محمد شفیع سے ان کی دوستی ہو گئی تھی جو استھانواں (ضلع پٹنہ) کے باشندہ تھے لیکن اب غازی پور میں مستقل سکونت اختیار کر چکے تھے۔ موج تخلص کرتے تھے، نوآموز شاعر تھے اور مولانا شمشاد لکھنوی سے اپنے کلام کی اصلاح لیتے تھے۔ اسی زمانے میں میر ذاکر حسین ہنر غازی پوری نے یہ طرح دی ؎

جامۂ ہستی میرے تن پر بہت بوسیدہ ہے

اور اس زمین میں شعر کہنے کی ہدایت کی چنانچہ سید محمد شفیع موج نے غزل کہنی شروع کی اور علامہ نیموی سے اصرار کیا کہ وہ بھی کوئی غزل کہیں۔ چنانچہ علامہ نیموی نے شوق اپنا تخلص رکھ کر اس زمین میں مندرجہ ذیل غزل

توکل کے مضامین زیادہ ملتے ہیں۔ الفاظ کی تراش خراش اور نازک خیالی کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشش کرتے تھے۔ غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

زمانہ کی طرح وہ شوخ ... کسی کا دوست ہے دشمن کسی کا
آنکھیں لڑتے ہی صلح ہوتی ہے ... فائدہ کیا ہے اس لڑائی کا
دختر رز کی لالہ گوں صورت ... خون کرتی ہے پارسائی کا
غم کلیجہ تک ہمارا کھا گیا ... ہم نے غم کھایا تو کیا بیجا کیا (خم خانہ جاوید ۳/۵۰۴)

کہی جوانی کی سب سے پہلی غزل ہے۔

علامہ نیموی کی سب سے پہلی غزل

سوزِ غم سے آبلہ اپنا دل تفتیدہ ہے
اور سارا جسم شکل موئے آتش دیدہ ہے

کارگر کیا مرہم کافور ہوائے چارہ گر
زخم دل شوق محبت سے نمک پاشیدہ ہے

قدر ملیم کیوں نہ ہو جائے خزف پاروں سے کم
جس کو دیکھو محو دندان مسی مالیدہ ہے

کر دیا ہے آتش فرقت نے کس کس کو کباب
چشم ہے گریاں تو بریاں یہ دل آزردہ ہے

تاب دیدار جمال یار ہی مجھ میں نہیں
وصل کا سودا عبث سر میں مرے چکیدہ ہے

مثل سنبل ایک الجھن میں پڑا رہتا ہوں میں
جب سے میرا دل اسیر کاکل ژولیدہ ہے

گلشن رخسار جاناں میں نہیں خط جلوہ گر
صورت سبزہ نگاہ عاشقاں روئیدہ ہے

موسم گل ہے اکڑتے ہیں جوانان چمن
آہ محبوس قفس اک بلبل شوریدہ ہے

کر تجسس گوہر مقصود مل جائیں گے شوقؔ
دل کے ویرانے میں گنج معرفت پوشیدہ ہے[1]

شمشاد لکھنوی کی شاگردی

علامہ نیموی نے یہ غزل کہہ کر اپنے احباب کو سنائی جنہوں نے اس کی نہایت تعریف کی۔ ۱۵ر شوال المکرم ۱۲۹۶ھ کو غازی پور میں ایک مشاعرہ ہونے والا تھا۔ سید محمد شفیع موجؔ نے علامہ نیموی کو مشاعرہ میں شریک ہونے اور مذکورہ غزل پڑھنے کی درخواست کی لیکن علامہ نیموی نے چوں کہ اس وقت تک کسی استاد کو اپنا کلام

---

[1] یادگار وطن، ۵۳

نہیں دیکھایا تھا اور نہ اصلاح لی تھی اس لئے معذرت کی اور اصلاح کے بغیر اپنی غزل سنانا مناسب نہیں سمجھا۔

موج نے حضرت شمشاد لکھنوی سے اصلاح لینے کا مشورہ دیا چنانچہ انہیں کے مشورہ پر علامہ نیموی اپنی یہ غزل لے کر حضرت شمشاد لکھنوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اصلاح کی درخواست کی۔ حضرت شمشاد لکھنوی نے کمال شفقت کے ساتھ ان کی غزل دیکھی، اور جابجا اصلاح کر کے واپس کر دی اس سے علامہ نیموی کی نہایت ہمت افزائی ہوئی اور اس طرح وہ شعر گوئی میں حضرت شمشاد لکھنوی کے باضابطہ شاگرد ہو گئے۔

اسی تاریخ کی شام کو مشاعرہ تھا، علامہ نیموی نے مشاعرہ میں مذکورہ غزل پڑھی جس کو سن کر سامعین نے خوب داد دی اور خود حضرت شمشاد نے کھل کر تعریف کی اس کے علاوہ غازی پور کے زمانۂ قیام میں علامہ نیموی نے حضرت شمشاد لکھنوی سے درسیات میں سہ نثر ظہوری، قصائد عرفی، قصائد خاقانی اور حدائق البلاغت کی تعلیم حاصل کی۔ له

ادبی ذوق مطالعہ

علامہ نیموی بچپن سے لکھنے پڑھنے کے نہایت شوقین تھے جب غازی پور پہنچے تو نامور اساتذہ کی صحبت اور علمی و ادبی ماحول نے ان کے ذوق مطالعہ کو مزید پروان چڑھنے کا موقع دیا۔ خاص طور پر جب حضرت شمشاد لکھنوی کی صحبت نصیب ہو گئی تو درسی کتابوں کے علاوہ اردو شعر و شاعری کی کتابیں زیادہ تر مطالعہ میں رہنے لگیں عربی، فارسی، اردو کی جو کتاب ہاتھ آجاتی اس کا نہایت انہماک اور دلچسپی کے گیا تھ مطالعہ کرتے کبھی کبھی دو دو بجے رات تک کتب بینی میں مصروف رہتے۔

له یادگار وطن: ۳۵

نتیجہ یہ ہوا کہ اسی زمانے میں شعر و شاعری شروع کر دی ہفتہ میں ایک آدھ غزل موزوں کرنے لگے اور حضرت شمشاد سے اصلاح لینے لگے یہاں تک کہ اس وقت تک طبیعت کافی موزوں ہو گئی اور پست مضامین و رکیک الفاظ سے پرہیز کرنے کا شعور پیدا ہو گیا، چنانچہ اس کا اظہار خود ہی ایک جگہ اس طرح کرتے ہیں:-

"پھر یہ حالت رہی کہ کتب عربیہ کے درس و تدریس سے جب کچھ مہلت ملتی تو شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوتا۔ ہفتے میں ایک آدھ غزل ضرور کہتا، اور اصلاح لیتا۔ حضرت اوستاد جو کچھ ارشاد فرماتے محفوظ کر لیتا اور فن شاعری کے متعلق جو کتاب نظر سے گذرتی اسکو بالاستیعاب دیکھ جاتا۔ اس زمانے میں جس قدر میں نے محنت کی ہے میرا ہی دل جانتا ہے۔ اور لطف یہ کہ حضرت شمشاد سے میں نے فارسی بھی شروع کر دی۔ سہ نثر ظہوری، قصائد عرفی، قصائد خاقانی، حدائق البلاغت ان سے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ غرض کہ عربی و فارسی کی تحصیل میں نظم و نثر اردو کی مشق میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ اکثر بارہ بجے رات تک اور کبھی دو ایک بجے تک کتابیں دیکھا کرتا[1]"

دوسری غزل

مشاعرہ میں پہلی غزل پڑھنے اور داد و تحسین حاصل کرنے کے بعد علامہ نیموی نے شعر گوئی کی طرف خصوصی توجہ دینی شروع کر دی۔ مشاعروں میں شرکت کرنے کا بھی شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ مذکورہ مشاعرہ کے دو تین مہینے بعد غازی پور میں ایک دوسرا طرحی مشاعرہ ہوا جس میں مولوی عبدالصمد صاحب صمد وکیل غازی پور نے یہ طرح دی ع آباد کبھی گوشۂ ویرانۂ دل تھا

[1] یادگار وطن: ۵۳

علامہ نیموی نے اس زمین میں ایک غزل کہی اور حضرت شمشاد سے اصلاح لے کر شریک مشاعرہ ہوئے۔ غزل یہ تھی ؎

وہ پردہ نشیں جلوہ گر خانۂ دل تھا
آباد کبھی گوشۂ ویرانۂ دل تھا

دم بھر نہ شب وصل زباں اپنی ہوئی بند
کچھ اپنی کہانی تھی کچھ افسانۂ دل تھا

کیوں کر نہ اوبلتا میں سر محفل جاناں
لبریز مئے عشق سے پیمانۂ دل تھا

سمجھے تھے جسے شمع افروز وہ تم تھے
جو جان سے تھا صدقے وہ پروانۂ دل تھا

آنکھوں میں بھر آئے کسی بے درد کے آنسو
پر دردیہاں تک مرا افسانۂ دل تھا

جو بات کہی تم نے وہ پتھر سے تھی بھاری
توڑا جسے وہ گوہر یک دانۂ دل تھا

کیوں چاروں طرف شوق پریشان رہے تم
مطلوب تو رونق دہ کاشانۂ دل تھا

جب یہ غزل مشاعرہ میں پڑھی گئی تو سامعین نے نہایت داد دی اور تحسین و آفریں کی آوازیں بلند کیں۔

مشاعرہ کرنے کا ذوق

مذکورہ مشاعرہ کے بعد ایک مدت تک غازی پور میں مشاعرہ نہیں ہوا۔ اس لئے علامہ نیموی نے خود مشاعرے کرنے شروع کئے۔ یہ مشاعرے محلہ چہل ستون میں منعقد ہوتے اور وہاں کے ممتاز شعراء مدعو کئے جاتے۔ سب سے پہلا مشاعرہ جو علامہ نیموی کے زیر اہتمام منعقد ہوا اس کی طرح یہ تھی ؏

ذرا انصاف او صیاد کرنا

اس مشاعرہ میں شہر کے بہت سے نامی گرامی شعرا نے شرکت کی۔ علامہ نیموی نے اس زمین میں جو غزل کہی اور شریک مشاعرہ ہوئے وہ غزل یہ تھی ؎

کچھ اگلے عہد و پیمان یاد کرنا — پھر اے بیداد گر بیداد کرنا
تمہارے ہی تصور کا یہ گھر ہے — سمجھ کر دل مرا برباد کرنا
برنگ غنچہ گو صد چاک ہے دل — نہیں آتا مگر فریاد کرنا
شب ہجر اے خیالی دل ربا تو — تسلی دل ناشاد کرنا
رہے کچھ دیر تک دیدار قاتل، — کمی اے خنجر فولاد کرنا
بہ گستاخی معاف اے بندہ پرور — کہاں سیکھا ہے یہ بیداد کرنا
لب نے سیکھ لے ہم دل جلوں سے — ہجوم درد میں فریاد کرنا
رہے گلزار میں تو ہم قفس میں — ذرا انصاف او صیاد کرنا
ہمیں بھی یاد کر لینا پس مرگ — جو غیروں پر بیداد کرنا
چلے آنا سوئے ویرانۂ دل — جو ہو منظور اسے آباد کرنا

مزاج ان کا بہت نازک ہے اے شوقؔ
سمجھ کر نالہ و فریاد کرنا[1]

سخت زمین میں طبع آزمائی

آپ نے پچھلے صفحات میں علامہ نیموی کی جن غزلوں کا مطالعہ کیا وہ ان کی دو ایک سال کی مشق اور محنت کا نتیجہ تھیں، لیکن اس تھوڑی سی مدت میں علامہ نیموی کا شعری ذوق اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ سخت سے سخت زمین میں بھی طبع آزمائی کرنے لگے تھے چنانچہ اسی زمانے میں لکھنو سے خبر آئی کہ وہاں ایک طرحی مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے۔ جس کی طرح یہ ہے ع

زمیں شعر میں کرتے ہیں ہم تعمیر پتھر کی

---

[1] یادگار وطن: ۵۴

شعراء کرام جانتے ہیں کہ یہ نہایت سخت زمین ہے اسی اس میں پتھر ردیف اور تعمیر قافیہ ہے کسی نو آموز کے لئے آسان نہیں کہ ایسی سخت زمین میں کوئی غزل کہے لیکن علامہ نیموی نے اس سخت زمین میں بھی غزل کہی اور خوب اچھی کہی۔

غزل ملاحظہ ہو ؎

ہوا جب جل کے سرمہ بڑھ گئی توقیر پتھر کی — کیا چشم بتاں میں گھر نہ ہے تقدیر پتھر کی
کیا کہسار میں جب نالۂ خارا شگن میں نے — سلیں اڑ اڑ گئیں صدمے سے دو دو تیر پتھر کی
ہوئے آوازۂ گوش بتاں یاقوت کے بندے — خدا کی شان ہے چمکی عجب تقدیر پتھر کی
گرے گا قصر تن جب ایک دن سنگ حوادث سے — عمارت منعمو کرتے ہو کیوں تعمیر پتھر کی
مٹائے نقش جور اس بت کی لوح دل سے اشکوں نے — تعجب ہے کہ پانی سے مٹی تحریر پتھر کی
دھوئیں اس کے اڑا دے آہ سینے سے اگر کھینچوں — جو ہو سقف فلک بالفرض والتقدیر پتھر کی
صدائے تیشہ بھی اے کوہکن ڈھوتا ہے کیوں پتھر — لہو میں تجھ کو نہلائے گی جوئے شیر پتھر کی

نہایت کاوش دل سے جو میں نے یہ غزل لکھی
زمین شعر میں اے شوقؔ کی تعمیر پتھر کی

چوں کہ علامہ نیموی پتھر کی ردیف میں غزل کہنے میں کامیاب ہو گئے اور شعرا سے داد و تحسین حاصل کر چکے تو اب شوق پیدا ہوا کہ اس طرح کی دوسری مشکل زمینوں میں بھی طبع آزمائی کی جائے چنانچہ انہوں نے اسی زمانے میں پتھر کی ردیف بدل کر لوہے، چاندی اور سونے کی زمین میں بھی چند غزلیں کہہ ڈالیں وہ غزلیں یہ تھیں:

(1)

ترے دروازے میں ہے اے پری زنجیر لوہے کی — کریں کیوں کر نہ دیوانے ترے توقیر لوہے کی
دل شوریدہ کی تدبیر پہلے چارہ گر کر لے — بہنا پھر دست و پا میں ہتکڑی زنجیر لوہے کی

بنایا غیرت مجنوں مجھے لیلائے گیسو نے
نہ ہو کیوں دست و پا میں ہتھکڑی زنجیر لوہے کی

پڑا آئینہ فولاد میں عکس رخ خود بیں
دل روشن سے میرے بڑھ گئی توقیر لوہے کی

بہار آئے قفس سے ہم پہنچ جائیں گے گلشن میں
پھڑک کر تیلیاں توڑیں گے بے تاخیر لوہے کی

مرا لوہا عدو نے سنگ دل نے جان سے مانا
جو دیکھی دیدۂ انصاف سے تحریر لوہے کی

مرا جوہر بھی دیکھیں شوقؔ جو ارباب بینش ہیں
بدل دیتا ہوں میں چاندی سے اب تقدیر لوہے کی

(۲)

جو کی زیب گلو اس شوخ نے زنجیر چاندی کی
ہوئی کندن سے بھی بڑھ کر کہیں توقیر چاندی کی

یہاں تک محو اے قاتل ہوئے شوق شہادت میں
کہ ہم سمجھے ہلال عید کو شمشیر چاندی کی

تجھے ایسا حسیں اے سیم تن پایا کہ ہم سمجھے
ڈھلی ہے نور کے سانچے میں یہ تصویر چاندی کی

پسند دل ہوئی ہے جب حسینوں کو پئے زیور
قیامت تک رہے گی عزت و توقیر چاندی کی

ملا یہ نسخۂ نایاب حال کیمیا گر سے
رہا مفلس جسے ہے حرص دامن گیر چاندی کی

بڑھاؤ قدر و قیمت اور سونے کی غزل لکھ کر
بہت اے شوقؔ باتیں کر چکے تحریر چاندی کی

(۳)

نہیں کچھ قدر پیش صاحب اکسیر سونے کی
ہنر کے آگے مثل خاک ہے توقیر سونے کی

سنہرا گوکھرو اس شوخ نے کنٹھے میں ٹانکا ہے
نہیں دیکھی ہو جس نے دیکھ لے شمشیر سونے کی

ہوا ہم رنگ اس کا چہرۂ عشاق زردی میں
عجب کیا اب حسینوں میں بھی ہو تحقیر سونے کی

سمجھ کر شعلہ کو زر شمع پر تو چوٹ کرتا ہے
مجھے بھی پھونک دے گی حرص اے گلگیر سونے کی

سنہرے رنگ کا تیرے پڑا پرتو جو پانی پر
اٹھی جو موج دم میں بن گئی زنجیر سونے کی

ہوئے وابستہ دونوں فرق عشق و حسن ہے اتنا — مری کڑیاں ہیں لوہے کی تری زنجیر سونے کی

سنہرے رنگ کا اس کے جو وصف اے شوق لکھتا ہوں
مرے ہر صفحہ دیواں میں ہے تحریر سونے کی

حضرت تسلیم لکھنوی کی شاگردی

اس زمانے میں حضرت تسلیم[1] لکھنوی کی ایک مثنوی "شام غریباں" علامہ شوق نیموی کی نظر سے گذری۔ اس کے طرز ادا اور اسلوب بیان سے علامہ نیموی نہایت

---

[1] منشی امیر اللہ تسلیم ہندستان کے معروف شعراء میں ہیں، اصل وطن فیض آباد ہے۔ ۱۸۱۹ء میں پیدا ہوئے۔ مدتوں لکھنؤ میں سکونت پذیر رہے پھر ریاست رام پور چلے گئے اور وہاں نواب کلب علی خاں کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ دربار میں کافی پذیرائی ہوئی۔ ان کے ایک دیوان کا نام "نظم دل افروز" ہے۔ کلام میں فصاحت و بلاغت، متانت و شوخی کمال درجے کی پائی جاتی ہے ان کے شاگردوں کی تعداد اچھی خاصی ہے جس میں حسرت موہانی، عرشؔ، لالہ سری رام اور علامہ شوقؔ نیموی خاص طور پر قابل ذکر ہیں ـــ لالہ سری رام نے اپنے استاد کی تعریف کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے۔
"آپ کے مسلم الثبوت استاد، اور موجودہ شعراء میں نہایت بلند پایہ اور عالی مرتبہ ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے" ـــ لالہ سری رام نے اپنی کتاب میں ان کا نمونہ کلام پیش کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کعبہ سے بت کدہ کو گیا تو کیا ہوا — میں دیکھتا وہاں بھی تری شان ہی رہا
شان خدا جو دیکھ لی حسن بتاں میں شیخ — اتنی سی بات میں گنہ گار کیا ہوا
دم دیا ہے حرم و دیر میں کسی کافر نے — کلمہ پڑھتے ہیں یہ سب گبر و مسلماں کس کا
جلوہ گر ہے کوئی کس کا کرتی حسرت طواف — کعبہ دل پر مرے عالم ہے بیت اللہ کا
شبنم گری تو مجھے دیا آسماں نے غسل — خاک اڑ کے آ پڑیں تو ہمارا کفن ہوا

(خم خانہ جاوید ۲/ ۷۲)

متاثر ہوئے، پھر ان کے ایک دوست کے یہاں حضرت تسلیم کی کلیات مل گئی۔ اس کا بھی بغائر مطالعہ کیا، اور حضرت تسلیم کی استادی اور ان کی شعری و ادبی خوبی کے قائل ہو گئے ارادہ کیا کہ ان کے حلقہ تلمذ میں داخل ہو جائیں چنانچہ ان کا پتا معلوم کر کے ان کی خدمت میں اپنی چند غزلیں اصلاح کے لئے بھیجیں حضرت تسلیم نے وہ غزلیں دیکھیں اور جا بجا اصلاح کر کے واپس کر دیں۔ اس روز سے علامہ نیموی حضرت تسلیم لکھنوی کے باضابطہ شاگرد ہو گئے۔[۱]

نکاح

علامہ شوق نیموی ابھی غازی پور میں زیر تعلیم ہی تھے کہ ان کی شادی کا دن مقرر ہو گیا اور بالآخر ۱۲ جمادی الآخر ۱۳۰۰ھ کو علامہ نیموی کے خالو شیخ بشارت علی کی بڑی لڑکی سے عقد ہو گیا۔ شمس العلما حضرت مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی نے اس موقع کی مناسبت سے مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ کہا:

مشفق مولوی ظہیر احسن کتخدا گشت چون بفضل خدا

سال تاریخ شد بروئے جمیل از دواج ظہیر احسن[۲]

لکھنو کا تعلیمی سفر

جب علامہ شوق نیموی کو غازی پور کی تعلیم سے کچھ سیری ہوئی تو ارادہ کیا کہ اب لکھنو چلنا چاہیے اور وہاں کے اجلہ اساتذہ سے مستفید ہونا چاہیے چنانچہ ۱۳۰۰ھ کے کسی مہینہ میں گھر سے لکھنو کے لئے روانہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر ہندستان کے مشہور عالم حدیث مولانا عبد الحئی فرنگی محلی[۳] (متوفی ۱۳۰۴ھ) کے حلقہ درس میں شامل ہوئے۔ اور ان کی خدمت میں

---

[۱] یادگار وطن: ۵۸ [۲] یادگار وطن: ۵۸

[۳] مولانا عبد الحئی فرنگی محلی ہندستان کے ان علما میں شمار ہوتے ہیں جن پر ہمارا ملک بلا شبہ فخر کر سکتا ہے۔ وہ ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۸ء میں باندہ میں پیدا ہوئے۔ پانچ سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا

[باقی آگے صفحہ]

رہ کر علوم دینیہ کی تکمیل میں مصروف ہو گئے اس کے علاوہ فن طبابت سے بھی دلچسپی تھی اس لئے اس کی تعلیم حکیم سید باقر حسین ساکن محلہ پاٹا نالہ سے حاصل کرنے لگے۔ تقریباً چار پانچ برس تک لکھنؤ میں مقیم رہے اور وہاں کے اساتذہ سے زیادہ سے زیادہ فیض یاب ہوئے۔ اختتام تعلیم کے بعد نہایت کامیابی کے ساتھ گھر واپس ہوئے۔[1]

اور سترہ سال کی عمر میں علوم دینیہ کے حصول سے فارغ ہو گئے۔ درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ دو بار حج کیا۔ —— شیخ احمد وحلان شیخ الشافعیہ مکہ معظمہ سے علوم دینیہ کی اجازت حاصل کی —— تذکرہ علماء ہند میں ان کے ۴۷ نامور شاگردوں کے نام تحریر کئے گئے ہیں۔ علامہ شوق نیموی بھی ان کے نامور شاگردوں میں شامل ہیں۔

ان کی وفات ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء لکھنؤ میں ہوئی۔ اور وہیں دفن ہوئے۔ کثیر التصانیف علماء میں شمار ہوتے ہیں انہوں نے خود ۸۰ تصنیفات کے نام گنوائے ہیں۔ جن میں خاص طور پر الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ عمدۃ الرعایہ۔ الانصاف فی حکم الاعتکاف، ھدایۃ الورٰی الی لواء الھدیٰ، آثار المرفوع فی اخبار الموضوع قابل ذکر ہیں۔

تذکرہ علمائے ہند : ۲۸۷ تذکرہ علمائے فرنگی محل : ۱۳۱

---

[1] یادگار وطن : ۵۹

مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی سے بیعت

علامہ شوق نیموی نے مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی بزرگی، عظمت، خداترسی اور علمی فضل و کمال کا شہرہ پہلے ہی سے سن رکھا تھا جب لکھنؤ پہنچے تو ان سے ملاقات کا اشتیاق بڑھ گیا۔ چنانچہ لکھنؤ اترنے کے بعد تین چار روز وہاں قیام کر کے پہلے رام پور پہنچے اور اپنے استاد حضرت تسلیم لکھنوی سے ملاقات کی ہفتہ عشرہ رام پور میں رہے پھر گنج مرادآباد کے لئے روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی سے ملاقات کی اور بیعت ہوئے[۲]

لکھنؤ کی ادبی سرگرمیاں

علامہ شوق نیموی نے جب سے لکھنؤ جیسی علمی و ادبی سرزمین پر قدم رکھا تب سے علوم دینیہ اور طبی علوم کے حصول میں ہمہ تن مصروف رہے تاہم اردو شعر و شاعری کا جو مذاق غازی پور میں پیدا ہو چکا تھا وہ کم نہیں ہوا، بلکہ وہاں کے ادبی و شعری ماحول اور اساتذہ کی صحبت نے ان کے مذاق سخن میں مزید نازک خیالی اور معنی آفرینی پیدا کی۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ نیموی نے جب یہاں کے مشاعرے میں کوئی غزل پڑھی تو اساتذۂ لکھنؤ نے اس کی داد دی اور ان کے کلام کو سراہا۔

---

[۱] مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی ہندوستان کے مشہور و معروف صوفیا میں شمار ہوتے ہیں۔ والد کا نام اہل اللہ تھا۔ ۱۲۰۸ھ میں قصبہ گنج مرادآباد میں پیدا ہوئے۔ درسیات کی تکمیل شاہ عبدالعزیز دہلوی، مرزا حسن علی کبیر محدث لکھنوی اور مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی سے کی۔ چوں کہ سن شعور ہی سے طبیعت اشغال باطن کی طرف مائل تھی۔ اس لئے جلد ہی اہل اللہ میں شمار ہونے لگے۔ آپ حضرت شاہ محمد آفاق دہلوی اور شاہ محمد غلام علی دہلوی کے خلیفہ تھے۔ آپ نے ربیع الاول ۱۳۱۳ھ میں گنج مرادآباد میں انتقال کیا۔ اور وہیں دفن ہوئے۔

(تذکرہ علمائے ہند ۳۸۰۔ تذکرہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی، مصنفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی)

[۲] یادگار وطن: ۵۹۔

علامہ نیموی کی قادر الکلامی اور مقبولیت کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک بار فصاحت لکھنوی کے کسی شاگرد نے بڑی دھوم دھام سے ایک طرحی مشاعرہ کیا جس میں لکھنو کے بڑے بڑے اساتذہ مدعو کئے گئے :

"خداں کا ایماں کا" کی زمین تھی۔ علامہ نیموی نے بھی اس زمین میں مندرجہ ذیل غزل کہی، اور پیام یار کے ناظم جناب نثار کے ساتھ شریک مشاعرہ ہوئے ؎

جنوں میں ایک دن ڈنکا بجے گا جوش ایماں کا
ہے الا اللہ آوازہ مرے چاک گریباں کا

ورق مجکو جو ہاتھ آجائے خورشید درخشاں کا
تو لکھوں وصف روی پاک کچھ محبوب یزداں کا

کوئی پیغام لاتی ہے مقرر حور و غلماں ... کا
نسیم خلد رستا پوچھتی ہے کوئے جاناں کا

خیال تن نہ پھر آیا جو نکلی روح قالب سے
رہا ہو کر نہ دیکھا خواب بھی یوسف نے زنداں کا

لگی دل کی بھڑک اٹھی دہن تک شعلے آتے ہیں
مرا جو دم ہے رشتہ ہے چراغ داغ پنہاں کا

نہ ہوں کیوں کر غبار دشت کا ممنون وحشت میں
جہاں کپڑے پھٹے اس نے تو عریاں ویں ڈھانکا

کسی کا صانع کونین کھینچے گا مگر نقشہ
ورق سادہ پڑا ہے آج تک مہر درخشاں کا

ہنسے زخم جگر نام مداوا سن کے سینے میں
دکھائی آنکھ آنسو نے جب آیا ذکر طوفاں کا

لبوں پر مل کے مسی کیا کرو گے مات نیلم کو
کرو گے پان کھا کر خون کیا لعل بدخشاں کا

تجسس کر رہے ہیں وہ مجھے کیسی ندامت ہو
کوئی ٹکڑا نکل آئے اگر سینے میں پیکاں کا

وہ محروم مداوا ہوں گل صد چاک کی صورت
نہ دیکھا منہ کبھی زخم جگر نے میرے درماں کا

گری بجلی غضب کی پرتو رخسار روشن سے
جو وہ پردہ نشیں کل روزن دیوار سے جھانکا

ہزاروں بلبلیں کیوں دامن گلچیں سے لپٹی ہیں
چرا کر لے چلا ہے کیا کوئی پتا گلستاں کا

خیال دشت گردی گور میں طرفہ تماشا ہے
کفن شاید ملا ہے مجکو دامان بیاباں کا

وہاں جوش جنوں میں آجکل سرگرم جولاں ہوں
ہے یہ آسماں بھی اک بگولہ جس بیاباں کا

بسر کرتا ہوں مثل نخل شعلہ باغ عالم میں
نہ بے مرگی کا میں شاکی ستائش گر نہ ساماں کا

خدا جانے کہاں دست جنوں نے پھاڑ کر پھینکا
گریباں کا پتا پایا نشاں ابتک نہ داماں کا

کسی پردہ نشیں کے عشق میں کپڑے جو پھاڑے ہیں
تو چلمن کی طرح عالم ہے ہر چاک گریباں کا

عجب شادابئ لاکھوں گل زخم اس میں کھلتے ہیں
نہال دل مرا سینچا ہوا ہے آب پیکاں کا

ہزاروں غول صحرائی میں مجھ وحشی کی تربت پر
دکھایا جذبۂ وحشت نے اک عالم چراغاں کا

برنگ قد شعلہ پیرہن سے عار ہے مجھ کو
نہ دامن کا پشیماں میں، نہ شرمندہ گریباں کا

توقع نفع کی بے سود ہے ارباب رفعت سے
ملا ہے کس کو دانہ خرمن ماہ درخشاں کا

فروغ اس کی نہ قسمت میں نہ صبح اس کے مقدر میں
مگر روز سیہ اختر ہے گویا شام ہجراں کا

ہوئے ارباب محفل خوش خدا نے آبرو رکھ لی
کہ تھا شوقؔ امتحاں اس دم ترے طبع درافشاں کا

جب یہ غزل پڑھی گئی تو پورے مجمع نے اس کو پسند کیا۔ اور خود وہاں کے شعراء نے کھل کر داد دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد لکھنؤ کے شعری و ادبی حلقہ میں علامہ نیموی نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔

حضرت عظیم آبادی کی خدمت میں چار غزلیں

اسی زمانہ میں علامہ شوقؔ نیموی نے مزید چار غزلیں کہیں اور پھر انہیں، اپنے استاد مولانا سید حسرتؔ عظیم آبادی کے یہاں اصلاح کے لئے بھیجیں وہ غزلیں یہ تھیں:۔

تمہاری بے وفائی سے ہمارا دم نکلتا تھا۔
پشیماں ہو کے پھر تم کو کف افسوس ملنا تھا

کسی کو دیکھ کر قابو سے کب اے دل نکلتا تھا
بلا سے چوٹ کھائی تھی سر محفل سنبھلنا تھا

کہاں تک آنسوؤں کو ضبط کرتے تیری فرقت میں
مقدر میں تو چاہ خشک سے دریا ابلنا تھا

تمہارا جی بہلتا اور میری روح خوش ہوتی / کبھی تو میری تربت پر تمہیں آکر ٹہلنا تھا

مرے آگے نہ کیوں وہ گرم جوشی غیر سے کرتے / کہ مجکو ان کی محفل میں برنگ شمع جلنا تھا

برا یا وہ بھلا سمجھیں، کہوں گا سنگدل ان کو / نہیں تو میری آہ گرم سے آخر پگھلنا تھا

عدو کے سینے پر ہاتھ آپنے کس پیار سے رکھا / دل بیتاب کی قسمت میں دو دو ہاتھ اچھلنا تھا

حسینوں کو عبث تھا ناز اتنا اپنے جوبن پر / انہیں جب دو ہی دن میں دوپہر کی طرح ڈھلنا تھا

شب فرقت جو میں نے سرد آہیں بھول کر کھینچیں / ندامت مجکو ہوتی تھی تمہارا جی دہلنا تھا

نہ کیوں وہ غیر کو ہمراہ لاتے میرے بالیں پر / کسی کی جان جاتی تھی کسی کا دم نکلنا تھا

رقیبوں پر بھی اشکو ہوگیا درد نہاں ظاہر / تمہیں کچھ ضبط کرنا تھا نہ یوں مجمع میں ڈھلنا تھا

نہ کیوں دل میں لگاتا آگ عشق کا کل پیچاں / ہماری آرزوؤں کو دھواں بن کر نکلنا تھا

جنازہ آج نکلا تھا ترے عاشق کا اے ظالم / تجھے منہدی لگانا پاس تابوت چلنا تھا

سر محفل کہیں اے شوقؔ تم نے راز کی باتیں
شراب معرفت پی کر نہ یوں تم کو ابلنا تھا

(۲)

کیوں پریشاں ہو اے جاں کھلے سر کیوں ہو / غیر کا حال ہے کیا غیر مکدر کیوں ہو

ستم و جور کی فریاد سے ہم درگذرے / ایسے گھبرائے ہوئے تم سر محشر کیوں ہو

میں نے مانا کہ یہ بیتاب رہا کرتا ہے / پھیر دو مجکو مرا دل تمہیں دوبھر کیوں ہو

اور بھی روح پریشان ہوئی جاتی ہے / بال بکھرائے کھڑے میری لحد پر کیوں ہو

سینے پر ہاتھ جو رکھ دو تو بھی ہو تسکین / تم علاج دل بیتاب میں ششدر کیوں ہو

اے مرے جذبۂ دل اور ٹھہر جا دم بھر / شرم آتی ہے کہ بے پردہ باہر کیوں ہو

دل دکھا دیتی ہیں آہیں تو خطا کیا میری / تمہیں انصاف سے سوچو کہ ستم گر کیوں ہو

آج کچھ اور ہی سامان نظر آتے ہیں دل دھڑکتا ہے کہ بدلے ہوئے تیور کیوں ہو

رنگ چہرے کا تو کچھ اور کہے دیتا ہے
سچ کہو شوقؔ پریشاں سراسر کیوں ہو

(۳)

یاد مژگاں جو عمر بھر نہ گئی جیتے جی کاوش جگر نہ گئی
خانہ دل کو چھوڑ کر نہ گئی کبھی حسرت ادھر ادھر نہ گئی
جب کہ تھا یہ ہجوم درد و الم آرزو دل میں دب کے مر نہ گئی
کس کا پاس ادب یہ تھا اے آہ آسماں سے جو تو ادھر نہ گئی
تھا پس مرگ ضعف کا یہ اثر کہ مرے یار تک خبر نہ گئی
اس دل حسن دوست کا ہو برا ہوس دید عمر بھر نہ گئی
پھول جوڑے میں تم نے تو رکھا اب سنبھالو کمر د گر نہ گئی
ہاتھا پائی کی خو نہیں اچھی دیکھو زلف رسا بکھر نہ گئی
تم تو پہلو میں رات بیٹھے تھے بدگمانی کدھر کدھر نہ گئی
خاک چھنوائی اس تمنا نے مجھ سے پہلے ہی کیوں یہ مر نہ گئی

عرش ہی گو ہلا دیا تو کیا
یار تک آہ شوقؔ اگر نہ گئی

---

(۴۲)

خبر ہے ڈھونڈنے والو وہ کس منزل میں رہتے ہیں ۔ سراپا آرزو بن کر کسی کے دل میں رہتے ہیں
جو پامال اس کو کرتے ہو کرو لیکن سمجھ رکھو ۔ تمہارے ہی تو ارماں آج کل اس دل میں رہتے ہیں
نقاب الٹو کہیں جھگڑا چکے گبر و مسلماں کا ۔ کہ اک مدت سے یہ جنگ حق و باطل میں رہتے ہیں
دھڑکتا ہے کلیجا بدگمانی بڑھتی جاتی ہے ۔ سنا ہے آج کل وہ غیر کی محفل میں رہتے ہیں
اگر کچھ جھوٹ سمجھے ہو شب فرقت کی کیفیت ۔ تم اپنی یاد سے پوچھو کہ کس مشکل میں رہتے ہیں
چرا رکھتے ہو ارادے وہ چھپیں گے کب چھپانے سے ۔ کہ ہم یاد عدو بن کر تمہارے دل میں رہتے ہیں
شب غم چین آتا ہے نہ دم اپنا نکلتا ہے ۔ تمہارے وعدۂ دیدار سے مشکل میں رہتے ہیں
یہ کچھ اچھا نہیں اے درد اٹھنا بیٹھنا تیرا ۔ لحاظ اس کا نہیں تجھ کو کہ وہ اس دل میں رہتے ہیں
اگر ایفا نہ کرنا ہو تو یونہی جھوٹ سچ کہہ دو ۔ کہ لاکھوں لطف پھر بھی وعدۂ باطل میں رہتے ہیں
تصور بھی تمہارا اے صنم پردہ نشیں نکلے ۔ جو تم آنکھوں میں رہتے ہو تو یہ دل میں رہتے ہیں
لب معشوق کی صورت دہان زخم نے چوسا ۔ مزے کیا کیا زبان خنجر قاتل میں رہتے ہیں
تمنائے شہادت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی ۔ کہ ہم اکثر لہو بن کر رگ بسمل میں رہتے ہیں
جنہیں سب پتلیاں سمجھے ہیں وہ تو عکس ہیں ان کے ۔ کہ آنکھوں میں کبھی آجاتے ہیں گو وہ دل میں رہتے ہیں
جو آنکھوں سے ہوا کرتی ہیں باتیں غیر کیا سمجھیں ۔ اشارے تیر اداؤں کے بھری محفل میں رہتے ہیں
سمجھتے ہیں یہی دل میں جو جلتے ہیں یہ پروانے ۔ کہ نور شمع کے پردے میں وہ محفل میں رہتے ہیں
نہ پائیں گے کبھی اغیار انہیں گو لاکھ ڈھونڈیں گے ۔ کہ مدت سے وہ اک خلوت سرائے دل میں رہتے ہیں

عبث اے شوق تم بے سمجھے بوجھے آہ کر بیٹھے
تمہیں دیکھو وہ بے تابی سے کس مشکل میں رہتے ہیں

مولینا سعید حسرت عظیم آبادی کا اظہار خیال

ان غزلوں کو بغور پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی کہنہ مشق شاعر یا استاد کے کلام ہوں۔ لیکن نہایت تعجب ہے کہ علامہ شوق نیموی نے یہ غزلیں اس وقت کہیں جب ان کی عمر تقریباً بائیس سال تھی اور غزل گوئی کے لحاظ سے دوسرا سال تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کی غزلیں مولانا سعید حسرت عظیم آبادی کے یہاں پہنچیں جو خود ایک بہت بڑے شاعر اور فن کار تھے تو وہ نہایت متاثر ہوئے اپنے ہونہار شاگرد کی کھل کر داد دی اور اپنے خط کے ذریعہ اپنے "تاثرات کا اظہار کیا۔ وہ خط ملاحظہ کیجئے اور دیکھئے کہ ہندستان کا ایک کہنہ مشق اور مستند شاعر شوق نیموی جیسے ہونہار اور نومشق شاعر کی ہمت افزائی اور اس کی صلاحیت کا اعتراف کس طرح کر رہا ہے۔ وہ خط فارسی زبان میں ہے۔ لکھتے ہیں،

یگانۂ زمن بلبل نغمہ سرائے شعر و سخن سلمہ اللہ ذوالمنن،

پس از سلام ممنون الاسلام و ادعیہ وافیہ حصول مقصد و مرام واضح ضمیر محبت ارتسام باد کہ نامہ محبت طرازہ در قیمہ دل از غم پرواز با غزلہائے آبدار در نثار بتاریخ چہارم ربیع الآخر روز شنبہ گوہی گریبان و دمدو گرویدہ۔ دیدہ را نور و سینہ را سرور بخشیدہ۔

ذوقیکہ بدیدن کلام حلاوت التیام آں عزیز نصیب این مستہام گردید خارج از شرح و بیان و بیرون از احاطہ تقریر قلم و زبان است۔ بندہ ہرچند از کوچہ اشعار اردو نابلد ہستم لیکن این قدر می توانم گفت کہ لطف زبان و ادابندی و نازک خیالی و تلاش مضامین ہمہ در این اشعار فراہم آمدہ۔

آفریں بر طبع وقاد و ذہن نقاد آں صاحب استعداد خدا داد یا دکہ
دریں کم عمری چندیں علوم و فنون حاصل کردند۔ وآنچہ در بارہ
دیوان پریشان فقیر نوشتہ اند مقتضائے محبت ایشان است۔ بالجملہ
تمنائے راقم ہمیں است کہ آں دیوان از اوّل تا آخر از نظر آں
عزیز بگذرد۔ وائے بر جان سخن گر بسخندان نرسد۔ واین خط
از کمال شغف خاطر بآں عزیز بدست خود نوشتہ ام۔ فقط [1]

زمانہ طالب علمی کی اہم تصنیفات

علامہ شوق نیموی گرچہ ابھی لکھنؤ میں طالب علمی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور اپنے دامن کو اسلامی و طبی علوم و فنون سے بھر رہے تھے تاہم یہاں پہنچ کر علمی و ادبی لحاظ سے اتنی صلاحیت پیدا کر چکے تھے کہ کوئی مستقل معیاری کتاب تصنیف کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۳۰۳ھ میں انھوں نے سب سے پہلے ایک پر درد مثنوی لکھی جس کا تاریخی نام "نغمہ راز" ہے۔ اسی زمانہ میں "ازاحۃ الاغلاط" اور "اصلاح" نامی دو کتابیں تصنیف کیں، جو عربی و فارسی الفاظ کی تحقیق اور اردو زبان و بیان کی درستگی کے لئے نہایت مفید ہیں۔ جب یہ کتابیں چھپ کر منظر عام پر آئیں تو اہل علم نے ان کی کافی تعریف کی اور ہندستان کے مختلف اہم اخبار و رسائل نے ان پر بڑے اچھے انداز میں تبصرے لکھے۔ یہانتک کہ لکھنؤ کے مشہور شاعر حضرت جلالؔ لکھنوی کی مخاصمت کی بنیاد انہیں کتابوں میں سے ایک کتاب کی وجہ سے پڑی۔ ان تمام واقعات کی تفصیلات آگے آرہی ہیں۔

---

[1] یادگار وطن، ۶۳

نواب رام پور کے یہاں طلبی اور داغ دہلوی کی داد تحسین

جب ازاحۃ الاغلاط چھپ گئی تو علامہ شوق نیموی نے اس کا ایک نسخہ نواب کلب علی خاں رام پوری کے یہاں بھیجا۔ جس کو پڑھ کر وہ نہایت خوش ہوئے۔ اور علامہ نیموی کی قدر دانی اور ہمت افزائی کی خاطر رام پور بلایا۔ چنانچہ علامہ نیموی ان کے دربار میں حاضر ہوئے۔ اور مندرجہ ذیل قصیدہ پیش کیا۔

وحشت زدہ ہوں بوئے گل تر سے زیادہ
مشکل ہے ٹھہرنا کہیں دم بھر سے زیادہ

تقدیر اوڑائے لئے پھرتی ہے شب و روز
ہر تار نفس ہے مجھے شہپر سے زیادہ

دن رات مجھے راہ طلب میں مری امید
سرگرم سفر رکھتی ہے صرصر سے زیادہ

ٹکراتا ہوں سر چار حد دہر میں دن رات
دنیا ہے مجھے خانۂ بے در سے زیادہ

غم سے ہے مرے نشۂ شادی کو ترقی
خون جگری ہے مئے احمر سے زیادہ

نقش قدم مور ہوں ہر دم تہ پامال
ذرہ ہے مجھے چرخ ستم گر سے زیادہ

کیوں کر نہ رہوں سب سے الگ باغ جہاں میں
بے برگ و ثمر ہوں میں صنوبر سے زیادہ

ہوں اشک چکیدہ نہیں جز خاک مجھے چین
ہے فرش زمیں بالش و بستر سے زیادہ

امید سے نادم دل ناکام تمنا
امید پشیماں دل مضطر سے زیادہ

پابندئ زنجیر تعلق ہے مجھے تنگ
آزاد ہوں میں مرد قلندر سے زیادہ

دوری وطن باعث راحت ہے جہاں میں
میدان قیامت ہے مجھے گھر سے زیادہ

ہر چند کہ ہے تا بگلو چشمۂ حیواں
لیکن ہوں جگر تشنہ سکندر سے زیادہ

صد شکر کہ با اینہمہ ہر دم تہ گردوں
حاصل ہے تفاخر مجھے قیصر سے زیادہ

ایسے کا ثنا خواں ہوں کہ اوصاف ہیں جس کے
وسعت گہ تخئیل سخنور سے زیادہ

جمشید حشم ظل خدا کلب علی خاں
دارائے جہاں بخش سکندر سے زیادہ

دے آبرو ادنی کو جو وہ بحر سخاوت
شبنم کا ہر اک قطرہ ہو گوہر سے زیادہ

پھیرے سر منقاد اگر حکم سے اوس کے
دشمن کو گریباں ہو خنجر سے زیادہ

ہو معرکہ آرا تو صف فوج عدو کو
تنہا تہ خنجر کرے لشکر سے زیادہ

پیغام اجل ہے پئے دشمن غضب اوسکا
ہے چیں جبیں تیغ دو پیکر سے زیادہ

بڑھ کر دم شمشیر زنی ترک فلک سے
آفاق ستان خسرو خاور سے زیادہ

مشہور جہاں جود میں ہمت میں کرم میں
قوت میں شجاعت میں غضنفر سے زیادہ

دیکھے نگہ کم سے اگر جانب الماس
بے قدر زمانے میں ہو پتھر سے زیادہ

شیریں سخن ایسا کہ دم سحر بیانی
باتوں میں مزا قند مکرر سے زیادہ

ہر شمسۂ ایوان فلک اوج ہے روشن
دن رات مہ و مہر منور سے زیادہ

گھر کرتی ہے آنکھوں میں مکانوں کی سپیدی
دیوار ہے مجبوب سمن بر سے زیادہ

کیا اسپ سبک گام کی لکھوں میں ستائش
بے چین دل عاشق مضطر سے زیادہ

جانے میں خیال حکما آنے میں ادراک
ہر حال میں ہے اشہب صرصر سے زیادہ

پڑ جائے اگر عکس ہلال سم توسن
تابندہ ہر اک ذرہ ہو اختر سے زیادہ

اعزاز و حشم اوس کی سخاوت کی بدولت
حاصل ہے فقیروں کو تونگر سے زیادہ

دریا دلی اوس کی جو یہی ہے تو عجب کیا
ہو جائے بلند آب گہر سر سے زیادہ

اس دور میں رکھتا ہے ہر شخص بغل میں
اسباب طرب شیشہ و ساغر سے زیادہ

مینائے مئے عیش ہے شادی دل خلق
ہر لب متبسم ہے گل تر سے زیادہ

کس درجہ ہے شوق رقم مدح شہنشاہ
لکھ جاتا ہے خامہ حد مسطر سے زیادہ

لکھوں میں اگر ایک صفت لاکھ کے بدلے
ہو جزو قصیدہ مرادفتر سے زیادہ

اے شوقؔ شب و روز یہ ہے حضرتِ ممدوح | کر عرض یہی خالقِ اکبر سے زیادہ
یارب مرے سلطان کو صحت رہے حاصل | ہو عمر عطا خضر پیمبر سے زیادہ
ہو دیدۂ بدبیں کے لئے جنبشِ مژگاں | ہنگام نظر کاوش نشتر سے زیادہ
اقبال و حشم دیکھ کے حاسد تہ افلاک | جلتے رہیں دن رات سمندر سے زیادہ

نواب کلب علی خاں اس قصیدہ سے بہت خوش ہوئے اور خلعت و انعام سے نوازا انکے دربار کے مصاحب منزل میں حضرت داغ دہلوی جیسے عظیم شاعر وغیرہ موجود تھے انہوں نے بھی یہ قصیدہ سنا اور پھڑک گئے اور نہایت داد دی اس کے علاوہ نواب صاحب نے اپنے دربار سے منسلک رہنے کے لئے کہا لیکن علامہ نیموی نے اپنی تعلیمی مصروفیت کی وجہ سے معذرت کر دی۔ اور وہاں ہفتہ عشرہ رہ کر لکھنؤ واپس ہو گئے۔ چلتے وقت نواب صاحب نے معقول روپے پیسے سے نوازا اور سال بھر میں دو ایک بار آنے کی تاکید کی [1]

تعلیم سے فراغت

شعبان المعظم ۱۳۰۵ھ میں علامہ نیموی نے علوم دینیہ سے فراغت حاصل کی اور پٹنہ، غازی پور اور لکھنؤ کے اہم اساتذہ سے فیضیاب ہو کر مستقل طور پر گھر واپس ہوئے۔

فراغت کے بعد کی پہلی تصنیف

علامہ شوق نیموی اپنی بعض گرانقدر تصنیفات کی بنا پر زمانہ طالب علمی میں کافی مشہور ہو گئے تھے۔ اسی زمانے میں جلال لکھنوی نے ان کی کتاب ازاحۃ الاغلاط کے جواب میں ایک رسالہ لکھا جو "رد تردید" کے نام سے شائع ہوا۔ علامہ شوق نیموی کو یہ رسالہ لکھنؤ کے زمانۂ قیام ہی میں مل چکا تھا لیکن وہ

[1] یادگار وطن: ۷۰

چوں کہ گھر آنے کے لئے رخت سفر باندھ چکے تھے اس لئے وہ رسالہ اپنے ساتھ گھر لیتے آئے اور گھر آنے کے بعد سب سے پہلے اس کا جواب لکھا اور "سرمۂ تحقیق" کے نام سے شائع کیا۔ تحقیق و معیار کے لحاظ سے یہ رسالہ نہایت مقبول ہوا اور خود جلال لکھنوی لاجواب ہو کر رہ گئے۔ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

درس و تدریس اور طبابت

نیمی میں کچھ دنوں تک قیام کرنے کے بعد علامہ نیموی پٹنہ چلے گئے۔ اور وہیں محلہ سلطان گنج میں مستقل طور پر مقیم ہو گئے۔ ذریعہ معاش کے لئے طبابت شروع کردی لیکن چوں کہ ان کا ذوق خالص علمی، دینی اور ادبی تھا اس لئے طبابت کیساتھ ساتھ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔

وعظ و نصیحت

علامہ نیموی عام طور پر قرآن، حدیث، فقہ، منطق و فلسفہ وغیرہ کی تعلیم دیتے تھے اور نہایت ذوق و شوق اور محنت کے ساتھ طلبا کو پڑھاتے تھے۔[1]

درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے علاوہ وعظ و نصیحت سے بھی علامہ نیموی کو کافی دلچسپی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ہر جمعہ کو وعظ کہنا شروع کیا۔ وعظ میں عام طور پر قرآن کی تفسیر بیان کرتے ان کی خواہش تھی کہ پورے قرآن مجید کی تفسیر بیان کردیں مگر افسوس ہے کہ زندگی نے وفا نہ کی۔[2]

---

[1] یادگار وطن: ۱۱۹

[2] یادگار وطن: ۱۲۰

اولاد علامہ شوق نیموی نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی شادی ان کی خالہ زاد بہن سے ۱۲؍جمادی الاخریٰ ۱۳۰۰ھ میں ہوئی تھی جن کا نام غالباً مخدومن تھا ان سے دو اولاد پیدا ہوئی تھی۔ ایک لڑکی جس کا نام معلوم نہ ہو سکا اور دوسرے مولانا عبدالرشید فوقانی۔ دوسری شادی ان کی چچازاد بہن سے ہوئی تھی۔ جو بیوہ ہو چکی تھیں۔ ان سے ایک لڑکا عبدالسلام نامی پیدا ہوا تھا۔ جو زیادہ دنوں زندہ نہ رہ سکا۔

مولانا عبدالرشید فوقانی، ولادت علامہ شوق نیموی نے مولانا عبدالرشید فوقانی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ۲۲؍صفر المظفر ۱۳۱۲ھ میں بمقام نیمی پیدا ہوئے، عبدالرشید نام رکھا گیا۔ اور تاریخی نام محمد مظفر، محمد ابوالمظفر اور ظفر الاسلام قرار پایا۔ اس موقع پر علامہ نیموی نے ایک قطعہ تاریخ بھی کہا ہے جو اس طرح ہے؎

شد چو پیدا پور حسن عبدالرشید

مایہ آرام جان نور بصر

شوق کلکم زد رقم تاریخ سال

جلوہ یک شنبہ و شہر صفر[1]
۱۳۱۲ھ

تعلیم و تربیت ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی۔ علامہ شوق نیموی سے درسی کتابیں پڑھیں۔ تکمیل درس کے بعد عام طور پر گھر پر رہے۔ کبھی کبھی پٹنہ چلے جاتے تھے لیکن ۱۹۴۶ء میں جب نیمی پر غیر مسلموں کا زبردست حملہ ہوا اور یہ بستی

[1] یادگار وطن :- ۱۲۳

تباہ و برباد ہو گئی۔ ان کا گھر اور کتب خانہ نذر آتش کر دیا گیا تو اس سے نہایت متاثر ہوتے۔ اور پھر انہوں نے ٹینی کو مستقل طور پر خیر باد کہہ دیا اور پٹنہ میں سکونت پذیر ہو گئے۔ کچھ دنوں کے لئے لکھنو گئے اور وہاں ٹیلہ والی مسجد میں مقیم رہے۔

عادات وخصائل

مولانا عبدالرشید فوقانی نہایت متوکل، متواضع اور منکسر المزاج آدمی تھے، سادگی کو پسند کرتے تو نہایت سادہ زندگی گزارتے تھے۔ وہ عام طور پر موٹیا کا معمولی کرتا اور تہبند پہنتے۔ معمولی کھانا کھاتے اور فرش پر سوتے تھے۔ اکثر اوقات مسجد میں گزارتے۔ راقم السطور نے جب ۱۹۶۷ء میں لکھنؤ میں ملاقات کی تو اس وقت وہ وہاں کی ٹیلہ والی مسجد میں مقیم تھے۔ اور نہایت سادگی و اخلاق کے نمونہ نظر آتے۔

کتب بینی

مطالعہ کتب کا خصوصی ذوق پایا تھا۔ اکثر اوقات کتب بینی میں مشغول رہتے اور تفسیر، حدیث، فقہ، کی کتابوں کا خاص طور پر مطالعہ کرتے کبھی کبھی شعری و ادبی کتابیں بھی زیر مطالعہ رہیں۔ جس کی وجہ سے شعر گوئی کا ذوق پیدا ہو گیا تھا۔

تصنیفات وتالیفات

انکی تصنیفات وتالیفات حدیث، فقہ، عروض ادب کے موضوع پر مبنی ہیں۔ انہوں نے القول الحسن مطبوعہ نامی پریس لکھنو کے اخیر میں اپنی گیارہ تصنیفات وتالیفات کا ذکر کیا ہے۔ اور ان کا اجمالی تعارف کرایا ہے، جو اس طرح ہے:۔

(۱) القول الحسن فی ما لس دعلی البکار المنن

یہ کتاب حدیث کے موضوع پر عربی زبان میں ہے جو دراصل

ابکار المنن" مولفہ مولانا عبد الرحمن مبارکپوری کی رد میں اور آثار السنن مولفہ علامہ شوق نیموی کی تائید میں لکھی گئی ہے۔ اس پر تفصیلی گفتگو آثار السنن کی شرح وحواشی کے ذیل میں آگے آرہی ہے۔

(۲) ضمیمہ وسیلۃ العقبیٰ یہ وسیلۃ العقبیٰ مصنفہ علامہ شوق نیموی کا ضمیمہ ہے جو فارسی زبان میں ہے

(۳) تذکار الشوق اس میں تذکرۃ الشوق مولفہ محمد بشیر مرحوم ابکاکوئی ضلع بلیا کے علاوہ علامہ شوق نیموی کے مزید حالات بیان کئے گئے ہیں۔

(۴) البلاغ المعلی فی عدم ثبوت الجلوس للامام بعد الخطبۃ فی المصلےٰ

یہ ایک فقہی رسالہ ہے جس میں امام کا خطبہ کے بعد مصلے میں نہ بیٹھنے کو ثابت کیا گیا ہے۔

(۵) نسب نامہ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم

(۶) تعقبات فوقانی یہ فن عروض پر ہے۔ اور اس میں ایک اہل علم کے اقوال کی تردید کی گئی ہے۔

(۷) رباعی نامہ رباعی کہنے کا قاعدہ اور اس کے اوزان تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔

X **(۸) آداب الجماع** اس میں اپنی بیوی کے ساتھ ہم بستری کرنے کو احادیث اور طب کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔

(۹) جدال خفقانی اس میں خفقانی کے علمی جدال کو بیان کیا گیا ہے۔

(۱۰) نالۂ فوقانی اس میں ۱۴ر نومبر ۱۹۴۶ء کو نیمی میں جو زبردست خون ریزی اور فساد ہوا، اس کو نثر اور نظم دونوں میں بیان کیا گیا ہے۔

(۱۱) افکار فوقانی اس میں مولانا عبدالرشید فوقانی نے اپنی اہلیہ کے مختصر حالات اور تاریخ انتقال نظم کی ہے۔ اس میں دو اشعار عربی زبان میں ہیں جو اس طرح ہیں ؎

نوّر اللّٰہ قبر بنت الفاطمہ　　قدس اللّٰہ سر بنت الفاطمہ
فیہ بنتل زوج ابن النیموی　　قل علیہا رحمۃ اللّٰہ القوی ؎[۱]

(۱۲) الکلام الجلی فی المولود النبوی یہ اردو زبان میں ۱۵ ورق کا قلمی نسخہ ہے۔ جو خدا بخش لائبریری میں موجود ہے۔ اور نسخہ تاریخ ایجاد محفل میلاد کے نام سے درج ہے۔ اس کے مؤلف کا نام علامہ شوق نیموی لکھا گیا ہے، جو غلط ہے۔ یہ در اصل الکلام الجلی کا نسخہ ہے جو مولانا فوقانی کی تالیف ہے۔

تاریخ ایجاد محفل اس رسالے کا نام نہیں بلکہ مذکورہ رسالے کا ایک ذیلی عنوان ہے۔ اس مختصر رسالے میں میلاد کی تاریخ، اس کے جواز و عدم جواز انواع بدعت پر مختلف طریقے سے بحث کی گئی ہے۔ جابجا احادیث اور علما کے اقوال پیش کیے گئے

اخیر میں مورخہ ۸ ار دسمبر ۱۹۵۹ء کی تاریخ پڑی ہوئی ہے۔ جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ تاریخ کتابت یہی ہو گی۔

شاعری نثر کے علاوہ شاعری سے بھی دل چسپی رکھتے تھے۔ اس بنا پر فوقانی تخلص کرتے تھے۔ نالۂ فوقانی اور افکار فوقانی میں

[۱] القول الحسن:۔ ۱۷۵

نہیں مل سکی کہ نمونہ کلام پیش کر سکوں۔ القول الحسن کے اخیر میں انھوں نے اپنی چار نظمیں تحریر کی ہیں۔ ایک علامہ نیموی سے مولانا آزاد کی شاگردی کے سلسلے میں جو اردو زبان میں ہے اور ۱۹ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ ۶ مارچ ۱۹۵۹ء کے اخبار صدائے عام پٹنہ میں شائع ہوئی۔ دوسری مولانا آزاد کے انتقال پر ہے۔ جو فارسی زبان میں ہے اور ۱۱ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ ۲۸ فروری ۱۹۵۸ء کے اخبار ساتھی پٹنہ میں شائع ہوئی تھی، تیسری مناجات کے عنوان سے ہماری زبان علی گڑھ میں ۲۰ مئی ۱۹۶۱ء کے شمارہ میں شائع ہوئی تھی۔ یہ بھی فارسی زبان میں ہے۔
چوتھی نظم اجازت نامہ کے عنوان سے ہے جو اردو زبان میں ہے اور اس میں ۴۳ اشعار ہیں یہ اشعار علامہ نیموی اور مولانا فوقانی کی تصنیفات کی طباعت کی اجازت کے سلسلے میں کہے گئے ہیں۔

مولانا آزاد کی شاگردی والی نظم جو اردو میں ہے۔ ملاحظہ کیجئے ؎

چھپی آزاد کی نامی کہانی — جو ہے آزاد کی اپنی زبانی
ملیح آباد کے نامی گرامی — کہ ہے رزاق جن کا نام نامی
انہیں آزاد نے اپنی کہانی — لکھا دی جیل میں جب تھے مقامی
ہوئی مطبوع دہلی میں کہانی — یہی ہے تذکرہ کی جلد ثانی
بیاں ہے ابوالکلام دہلوی کا — کہ ہوں تلمیذ شوق نیموی کا
بیاں ان کا ہے ذکر نیموی میں — کہ ہوں شاگرد اردو شاعری میں
ہوا اشعار میں اصلاح لینا — پسند دل ہوا شاگرد ہونا
توجہ خوب شوق نیموی کی — میرے اشعار کے اصلاح میں تھی
یہ قول ان کا کہانی سے لکھا ہے — روایت میں نے بالمعنی کہا ہے [۱]

۱۔ القول الحسن ص ۶۰

وفات

مولانا عبدالرشید فوقانی اپنی آنکھ کے علاج کے سلسلے میں جنرل ہاسپیٹل پٹنہ میں داخل کئے گئے لیکن صحت یاب نہ ہوسکے اور اپریل ۱۹۷۱ء میں اس دارفانی سے رحلت فرما گئے۔ لاش محمد صادق باغ کالوخاں کے گھر پر لائی گئی اور تجہیز وتکفین کے بعد شیخ کے روضہ (پٹنہ سیٹی) میں دفن کئے گئے۔



باب پنجم

شاگرد

علامہ شوق نیموی ایک متبحر عالم اور اردو زبان کے ایک بڑے شاعر تھے وہ طلبا کو پڑھاتے اور شعراء کو مشورۂ سخن دیتے تھے۔ اس لئے قدرتی طور پر ان کے شاگردوں کی تعداد زیادہ تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ مجھے تلاش و جستجو کے باوجود ان کے تمام شاگردوں کی کوئی جامع اور مکمل فہرست دستیاب نہیں ہوسکی۔ علامہ نیموی نے یادگار وطن میں صرف سترہ ایسے شاگردوں کے نام اور نہایت مختصر حالات تحریر کئے ہیں جو شعر و سخن میں مستقل طور پر ان سے اصلاح لیتے اور اکثر صاحب دیوان تھے۔ جبکہ دینی علوم حاصل کرنے والے طلباء اور بے ضابطہ اصلاح لینے والے شعراء کی تعداد اس سے کئی گنا یقیناً زیادہ ہوگی۔

علامہ نیموی نے اپنے شاگردوں کے حالات بیان کرنے سے قبل خود ہی لکھا ہے فرماتے ہیں:۔

"احیاناً خدا جانے کتنے لوگوں نے مجھ سے مشورہ لیا ہے۔ اور دوستانہ بعض اوقات دیوان کا دیوان بنظر اصلاح دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ مگر جو لوگ بحیثیت شاگردی آج تک اپنا کلام دکھاتے ہیں اور مجھ سے اصلاح لیا کرتے ہیں اور اکثر ان میں صاحب دیوان ہیں انکے نام وغیرہ لکھے جاتے ہیں"۔[1]

اب ہم علامہ نیموی کے شاگردوں کے نام اور حالات یادگار وطن سے

---

[1] یادگار وطن: ۱۱۶

اخذ کر کے تحریر کریں گے۔ حالات کے سلسلے میں جو مزید معلومات دوسری کتابوں سے دستیاب ہو سکی ہیں ان کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ضیا عظیم آبادی زبیر دہلوی، مولانا ابوالکلام آزاد کے نام بھی ان کے شاگردوں کی فہرست میں شامل کئے گئے ہیں کیوں کہ دوسری کتابوں میں ان کی شاگردی کے ثبوت موجود ہیں۔

اختر نام عبدالحی اور تخلص اختر ہے ــــ والد کا نام ہادی تھا۔ حاجی پور ضلع سلہٹ کے باشندہ تھے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

دل حزیں گلۂ ہجر یار کر موقوف　　ہر ایک کام تو ہے اپنے وقت پر موقوف
طبیعت اس سے بہلتی ہے اے ہجوم الم　　نہ اک دم ہو یہ بیتابی جگر موقوف[1]

بسمل نام سید محمد یوسف۔ ابوالبقا کنیت، اور بسمل تخلص ہے۔ محلہ چوہٹہ شہر پٹنہ کے باشندہ تھے۔ شہر کے اچھے شعرا میں شمار تھا۔ مولانا عبدالرشید فوقانی نے یادگار وطن کے حاشیہ میں اپنے قلم سے ایک جگہ لکھا ہے کہ سیّد محمد یوسف خدا بخش خاں بانی خدا بخش لائبریری پٹنہ کے بھتیجے تھے۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

جی میں ہے آج گل کھلائیں ہم　　ان کو داغ جگر دکھائیں ہم
جام بھر کر پلا دے اے ساقی　　دیں گے داتا تجھے دعائیں ہم[2]

بشیر محمد بشیر نام ہے، والد کا نام قاضی عبدالحمید تھا۔ بکا کوٹ ضلع بلیا کے رہنے والے تھے۔ ان کا ایک رسالہ چھپ چکا ہے، جو تذکرۃ الشوق کے نام سے ہے۔ اور علامہ شوق نیموی کے حالات زندگی پر مشتمل ہے

۱؎ یادگار وطن: ۱۱۶　　۲؎ یادگار وطن: ۱۱۷

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

صد شکر اثر کر گئی فریاد کسی کی
کہتے ہیں بلا دیتی ہے کیوں یاد کسی کی[1]

کس درجہ تھی ظالم ترے ناوک سے محبت
پیکان سے لپٹا ہوا دل بھی نکل آیا

تسطیر نام امیر الدین ہے۔ تخلص تسطیر کرتے تھے۔ محلہ عالم گنج شہر پورنیہ کے باشندہ تھے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

کوچۂ عشق میں چلنے کا ارادہ پھر ہے
خیر ہے حضرت دل آپ یہ کیا کرتے ہیں

مظلوم کی آہوں کی بری ہوتی ہے تاثیر
پچھتاؤ گے تم نے جو ستایا مرے دل کو[2]

تفسیر نام معز الدین محمد اور تخلص تفسیر ہے۔ محلہ سید باڑا شہر پورنیہ کے باشندہ تھے، اچھے شعراء میں شمار تھا۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

رنج و غم اپنا کوئی کیا جانے
درد دل درد آشنا جانے

نزع میں بالیں سے اٹھ کر گھر چلے
آپ میرے حق میں یہ کیا کر چلے[3]

خیر ابو الخیر نام اور خیر تخلص ہے۔ والد کا نام محمد شفیع الدین تھا۔ جو ایک اچھے طبیب تھے۔ ابو الخیر موضع قاضی بہیڑہ (دربھنگہ) کے باشندہ تھے، ان کا تاریخی نام مظہر عالم ہے۔ جس سے ان کا سن پیدائش ۱۲۷۱ھ نکلتا ہے۔ نثر نویسی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اکثر مشہور اخباروں کے نامہ نگار رہے خاص طور پر اپنچ میں مضامین لکھتے تھے۔ پنچ میں ابو الظرفا کے نام سے بھی چھپتے تھے۔ ان کے مضامین بہت ہی دل کش اور خوبصورت ہوتے تھے جن کو لوگ نہایت ذوق و شوق سے پڑھتے تھے۔ ان کا ایک رسالہ رجم الشہاب کے نام سے

---

[1] یادگار وطن: ۱۱۷ [2] یادگار وطن: ۱۱۷ [3] یادگار وطن: ۱۱۷

چھپ چکا ہے۔ شعر بھی اچھا کہتے تھے۔ تلمذ علامہ شوق نیموی سے حاصل تھا۔
نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

ستم بے جا کئے ہم پر رقیبوں سے وہ درگذرے
ہمارے دل دکھانے میں جو کرنا تھا وہ کر گذرے

ہاتھ میں کیوں لئے ہو تم خنجر
لاؤ اس کو گلے لگائیں ہم[1]

راغب نام عبدالعزیز اور تخلص راغبؔ ہے۔ والد کا نام شاہ کریم بخش تھا۔ محلہ نور سرائے بہار شریف کے باشندہ تھے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

جذبۂ دل اگر دکھائیں ہم — اپنے گھر ان کو کھینچ لائیں ہم
ادھر آجاؤ تم اگر اے جان — پردۂ چشم میں بٹھائیں ہم[2]

شاغل نام امیر الحسن اور تخلص شاغلؔ ہے محلہ چوہٹہ شہر پٹنہ کے باشندہ تھے۔ صحافت سے بھی دلچسپی تھی۔ اخبار دارالسلطنة کلکتہ اور اردو گائڈ کے ایڈیٹر تھے۔ ان کا ایک رسالہ رجم الشہاب چھپ چکا ہے، اچھے شاعر تھے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

حشر میں تو یوں خراماں اے پری پیکر نہ ہو
داور محشر کے آگے فتنۂ محشر نہ ہو
ہم وہ مے کش ہیں کہ چلو ہی سے مے پی لیں گے آج
کچھ نہیں پروا جو اے ساقی کوئی ساغر نہ ہو[3]

[1] یادگار وطن، ۱۱۷، [2] تذکرہ مسلم شعرائے بہار، ۱۲۶، [3] یادگار وطن، ۱۱۷

شفق نام حسن مصطفیٰ اور تخلص شفق ہے۔ تاریخی نام مظہر سعید ہے جس سے ۱۲۸۹ھ سال پیدائش نکلتا ہے۔ والد کا نام حسن رضا خان تھا۔ عماد پور ضلع گیا کے باشندہ تھے۔ عربی و فارسی کی ابتدائی درسی کتابیں وہیں پڑھیں پھر متفرق جگہ جاکر علوم دینیہ حاصل کئے۔ آغاز سخن میں آپ نے محمد عابد علی کوثر خیر آبادی طبیب شہر گیا سے مشورہ لیا اور انہیں سے طب کی کتابیں پڑھیں۔ پھر کئی برس تک حضرت امیر مینائی سے شرف تلمذ حاصل رہا۔ علامہ شوق نیموی کی شاگردی میں بھی رہے۔ اور ان سے اصلاح لیتے رہے۔ انہیں علامہ نیموی کی شاگردی پر فخر تھا، جس کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں ؎

شفیق المحترم و مخدوم مولانا ظہیر احسن ؛ کہ منت کش رہا ہوں برسوں میں جن کے لطف و احساں کا

انہوں نے فن شاعری میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ دہلی اور لکھنؤ کے معرکۃ الآرا مشاعروں میں شریک ہوئے اور نام پیدا کیا۔ لکھنؤ کی انجمن معین الادب اور معراج الادب نے ان کو اساتذہ کی صف میں جگہ دی۔ مختلف اہم مشاعروں کی صدارت کی۔ ان کا کلام دہلوی اور لکھنوی دونوں رنگ میں خاص طور پر ممتاز ہے۔
حکیم احمد اللہ ندوی نے تذکرۂ مسلم شعرائے بہار میں ان کی کئی تصنیفات کا ذکر کیا ہے۔ جن میں خاص طور پر تحقیق سخن، رکن عروض، گنجینۂ آخرت قابل ذکر ہیں اس کے علاوہ شاعری میں اردو غزلوں کے دو دیوان ایک مجموعۂ قصائد اور چار سو رباعیوں کا ایک مجموعہ بھی نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ جن کے مطالعہ سے حضرت شفق کا شعری و ادبی مقام واضح ہوتا ہے۔ حضرت شفق کے ممتاز

تلامذہ میں مندرجہ ذیل شعرا قابل ذکر ہیں۔

(۱) جناب سریر کابری (۲) جناب شمس شیر گھاٹوی (۳) جناب خوق شہرامی ــــــ تذکرہ مسلم شعرائے بہار کے مؤلف نے ان کے اکیاسی اشعار بطور نمونۂ کلام تحریر کئے ہیں، جو غزل اور رباعیات پر مشتمل ہیں۔

غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

سبق عبرت کا، غم کی داستاں، دفتر رلانے کا
بھرا ہے درد دل سے ہر ورق میرے فسانے کا

جسے رونا ہو بادل کی طرح دل کھول کر روئے
نہیں قائل میں شبنم کی طرح آنسو بہانے کا

عیادت کو نہ آتے تھے جنازے پر مگر آئے
میں اب سمجھا بہانہ ڈھونڈتے تھے آپ آنے کا

ڈراتی ہے نگاہ گرم سے اے برق کیا مجھ کو
یہاں ہے آپ دشمن تنکا تنکا آشیانے کا

شفق میں اس امیر نکتہ داں کا نام لیوا ہوں
کہ جس سے نام روشن مصحفی کے ہے گھرانے کا

حضرت شفق کی وفات ۱۳۶۲ھ میں ہوئی[۱]

طالب نام خدا بخش اور تخلص طالب ہے۔ محلہ گیریاں شہر ملتان کے باشندہ تھے۔ والد کا نام عبداللہ تھا۔ ان کا ایک مجموعۂ کلام کلیات کے نام سے ۱۳۱۰ھ میں لکھنؤ سے چھپا تھا جس میں دو دیوان ہیں ایک نعتیہ دوسرے عشقیہ۔ علامہ شوق نیموی سے باضابطہ اصلاح لیتے تھے اور انہیں اس پر فخر تھا، چنانچہ اپنے فخر کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ؎

حضرت شوق سخن ور کا یہ اے طالب ہے فیض
ورنہ مشکل ہے سراسر دھوپ سونے کا ورق

---

[۱] تذکرہ مسلم شعرائے بہار: ۲/۲۵۱، یادگار وطن: ۱۱۸، دیوان شوق: ۱۲۲

حضرت طالب نے اپنے استاد علامہ نیموی کی وفات پر تاریخی اشعار کہے ہیں جو ۱۶ اشعار پر مشتمل ہیں اور دیوان شوق کے آخر میں درج ہیں۔

علامہ شوق نیموی نے مندرجہ ذیل اشعار بطور نمونہ کلام پیش کیا ہے۔

دل لگانا ایک دن ہوگا وبال — دیکھو طالب تم کو سمجھاتے ہیں ہم

کہنا یہ دم نزع قیامت تھا کسی کا — طالب تمہیں کچھ ہوش ہے ہم آئے ہوئے ہیں[۱]

عرشی

محمد عبدالشکور نام اور تخلص عرشی ہے۔ کرائے پر سرائے ضلع پٹنہ کے باشندہ تھے، والد کا نام سید سعادت علی تھا۔ عرشی نے انگریزی کی تعلیم میٹرک تک حاصل کی۔ عربی کی کتابیں مولوی عبدالحی الہ آبادی سے پڑھیں۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ کئی سال تک اینگلو عربک محمڈن اسکول پٹنہ سیٹی میں ہیڈ مولوی کی حیثیت سے تعلیمی فرائض انجام دیتے رہے ۱۹۰۷ء میں بھوپال گئے اور بیگم بھوپال کے پرائیوٹ سیکریٹری مقرر ہوئے اس کے بعد ریونیو منسٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ بھوپال میں پانچ سال قیام کیا پھر وہاں سے اورنگ آباد چلے گئے اور وہیں ۱۹۱۴ء میں انتقال کیا۔ ان کا ایک قلمی دیوان ان کے صاحب زادے سید عبدالحفیظ (کراچی) کے پاس تھا۔ جو تلف ہوگیا۔ انہیں کی روایت سے حکیم احمداللہ ندوی نے مندرجہ ذیل اشعار بطور نمونہ نقل کئے ہیں۔

رمز معراج کوئی کیا جانے — مصطفٰے جانیں یا خدا جانے

عرشی مری الفت تو نہ ظاہر تھی کسی پر — پردہ مرا سب کھول دیا جامہ دری نے

ناتوانی مانع رفتار ہے — پانو کو پھر حاجت زنجیر کیا

---

[۱] یادگار روطن ۱۱۸، دیوان شوق: ۱۱۵[۲]

دونوں ہی کرتے ہیں گھائل دل کو — تیز ابرو بھی ہیں مژگاں کی طرح

ہے سیہ پوش جہانِ اسلام — ظلمتِ شام غریباں کی طرح

موت کی نیند جب آئی پایا — عمر کو خواب پریشاں کی طرح

علامہ شوق نیموی نے مندرجہ ذیل اشعار بطور نمونہ تحریر کئے ہیں ؎

داورِ محشر نے تو طے سارے جھگڑے کر دیئے
تم ہمارے ہو گئے یہ دل تمہارا ہو گیا

نہ کی فراق میں اسی ڈر سے آہ اے ظالم
کہیں نہ ٹوٹ پڑے آسماں مرے سر پر[1]

کامل

تفضل نام اور کامل تخلص ہے۔ والد کا نام سید شاہ حاجی وصی علی تھا محلہ بارہ دری بہار شریف کے رہنے والے تھے۔ ان کی دو کتابیں انجاح التواریخ اور فتح کامل چھپ چکی ہیں۔ اچھے شاعر تھے نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

دل کچھ تو خون ہو کے بہا ہجرِ یار میں — کچھ اشک بن کے دیدۂ گریاں میں رہ گیا

گھر سے باہر نکل آؤ گے سنو گے جو کبھی — نالۂ دل کی وہ پر درد صدا ہوتی ہے[2]

کاہش

محمد معین الحق نام اور تخلص کاہش ہے۔ موضع امتھوا ضلع گیا کے باشندہ تھے۔ وہیں ۱۲۹۱ھ میں پیدا ہوئے اور اس جگہ ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد پٹنہ چلے گئے، اور بقیہ علوم کی تکمیل کی۔ گیا میں امین کمشنر مقرر ہوئے اور وہیں سے ملازمت ترک کر کے پاکستان چلے گئے۔

---

[1] یادگار وطن : ۱۱۸، تذکرہ مسلم شعرائے بہار ۳ : ۱۲[2] یادگار وطن : ۱۱۸

۲۲ ذی قعدہ ۱۳۷۷ھ مطابق ۲۱ جولائی ۱۹۵۷ء بروز جمعہ اپنے فرزند سید فہیم الحق کے مکان پر کراچی میں انتقال کیا۔

شعر و شاعری سے دل چسپی بچپن ہی سے تھی۔ اچھے شعرا میں شمار تھا۔ علامہ شوق نیموی سے اصلاح لینے پر انہیں فخر تھا۔ چنانچہ مندرجہ ذیل شعر میں فخریہ کہتے ہیں ؎

شاگرد ہوں شوق سے سخنداں کا میں ایک نطق ہوں اس بلبل خنداں کا میں

ان کے مجموعۂ کلام کے بارے میں حکیم سید احمد اللہ ندوی نے لکھا ہے کہ بہار کالونی (کراچی) میں جہاں وہ مقیم تھے۔ زبردست سیلاب کی وجہ سے ضائع ہوگیا۔ تاہم جو حصہ محفوظ رہ گیا تھا اس میں سے حمد، نعت، دعا، اور غزل کے انیس اشعار منتخب کرکے حکیم احمد اللہ ندوی نے اپنی کتاب میں پیش کیے ہیں۔ اس میں ایک رباعی بھی ہے، جو اس طرح ہے ؎

یارب غرض و مراد و مقصود ہے تو
ڈھونڈوں تجھے جس جا وہیں موجود ہے تو
نازش ہے اس پر ہم گنہگاروں کو
میں بندہ ہوں تیرا اور معبود ہے تو

علامہ شوق نیموی نے مندرجہ ذیل اشعار بطور نمونہ کلام پیش کیا ہے ؎

وعدہ اگر کرو تو نباہو اسے ضرور
اقرار اگر کرو تو کبھی پھر نہیں نہ ہو
اٹھکھیلیوں کی چال جو چلتے ہیں آپ آج
برپا حضور فتنہ محشر کہیں نہ ہو[۱]

[۱] یادگار وطن: ۱۱۸، تذکرہ مسلم شعرائے بہار: حصہ ۲، ۱۰۶

مائل عبدالسبحان نام اور مائل تخلص ہے۔ والد کا نام حافظ عبداللہ ہے محلہ لودی کٹرہ شہر پٹنہ کے باشندہ تھے۔ اچھے شاعر تھے۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

مجھے پروانہ اپنا صورت موسیٰ بنانا تھا | مری آنکھوں کو شمع طور کا جلوہ دکھانا تھا
نہ ہوتے کس طرح مائل غریق بحر وحدت ہم | حباب آسا وجود بے ثبات اپنا مٹانا تھا[1]

مذاق عبدالواسع نام اور مذاق تخلص ہے۔ ان کے والد کا نام شیخ ولایت علی تھا۔ گنپورہ ضلع پٹنہ کے باشندہ تھے۔ شعر اچھا کہتے تھے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

دیکھ کر آئینۂ رخ مجھ کو سکتا ہو گیا | وہ پری گھبرا کے بول اٹھا کہ یہ کیا ہو گیا
پہلے تو تیغ ناز سے کشتہ بنا دیا | اعجاز لب سے پھر مجھے دم میں جلا دیا[2]

واصل محمد محفوظ الحق نام اور تخلص واصل ہے۔ والد کا نام سید شاہ ابوالحسن تھا۔ محلہ کنگھیا شہر پٹنہ کے باشندہ تھے۔ نثر اور نظم دونوں لکھتے تھے۔ ان کے متعدد رسالے چھپ کر قبولیت حاصل کر چکے ہیں جن میں خاص طور پر لوح محفوظ یعنی شرح حزب البحر غایۃ التسہیل اور مثنوی نغمۂ ہزار قابل ذکر ہیں۔

علامہ شوق نیموی نے مندرجہ ذیل اشعار بطور نمونہ تحریر کئے ہیں ؎

ادھر اس حور شمائل نے اٹھائی چلمن | اور ادھر بیٹھ رہے تھام کے دل ہم اپنا
جو دوزخ کو واصل گنہ لے چلیں گے | تجھے کھینچ لے گی شفاعت کسی کی[3]

---

1. یادگار وطن: ۱۱۸، تذکرہ مسلم شعرائے بہار: ۱۰۶/۴
2. یادگار وطن: ۱۱۹، تذکرہ مسلم شعرائے بہار: ۱۵۲/۴
3. یادگار وطن: ۱۱۹، تذکرہ مسلم شعرائے بہار ۱۲۶/۵

واقف

نام سید شاہ ناظر حسین اور تخلص واقف ہے۔ والد کا نام سید شاہ محمد مہدی ہے۔ محلہ بارہ دری بہار شریف کے رہنے والے تھے۔ اچھے شاعر تھے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

زلفیں الجھی ہیں آنکھیں ہیں مخمور رات بھر آپ تھے جناب کہاں
تم خراماں ادھر بھی آ جاؤ ہے عیادت بھی دل لگی بھی ہے[1]

اب ہم ان شعراء و ادباء کے حالات لکھیں گے جن کی شاگردی کا ذکر علامہ نیموی نے اپنی کتاب یادگار وطن میں تو نہیں کیا ہے لیکن دوسری کتابوں میں اس کا ثبوت موجود ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد ہندستان کے مشہور و معروف عالم دین، صحافی مجاہد آزادی اور ادیب و انشا پرداز ہیں۔ وہ ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ مطابق ستمبر ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولانا خیرالدین ہندستان کے اچھے علماء میں شمار ہوتے تھے۔ مولانا آزاد کا آبائی وطن دہلی اور مادری وطن مدینہ منورہ تھا۔ دس برس کی عمر میں والدین کے ہمراہ کلکتہ چلے گئے۔ تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی۔ ۱۹۰۷ء میں درس نظامیہ سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد کثرت مطالعہ کی بنا پر مختلف علوم و فنون کے متبحر عالم ہو گئے۔

گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے۔ ابتدائی غزلیں ارمغان فرخ بمبئی اور خدنگ نظر لکھنؤ میں چھپیں۔ نیرنگ عالم کے نام سے خود بھی ایک گلدستہ

---

[1] یادگار وطن: ۱۱۹، تذکرہ مسلم شعرائے بہار ۵/۱۲۶

نکالا اسی زمانے میں نثر نگاری کا آغاز ہوا۔ ابتدائی مضامین احسن الاخبار اور تحفہ احمدیہ کلکتہ اور مخزن لاہور میں شائع ہوئے۔

۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء کو کلکتہ سے ہفت روزہ الہلال نکالا جس کا خاص مقصد مسلمانوں میں مذہبی و سیاسی بیداری پیدا کرنا اور ایک بلند پایہ رسالہ کا اجرا تھا۔ پہلی جنگ یورپ کے متعلق بعض مضامین کی اشاعت کی بنا پر ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو یہ رسالہ بند ہو گیا۔ ۱۳ر نومبر ۱۹۱۵ء کو البلاغ نکالا۔ اس کا مقصد بھی وہی تھا جو الہلال کا تھا۔ جنگ آزادی کے ایک عظیم مجاہد ہونے کی وجہ سے کئی بار جیل گئے۔ لیکن کبھی بھی سیاسی و مذہبی بیداری کی دعوت سے منحرف نہیں ہوئے۔ دو بار کانگریس کے صدر ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں حکومت ہند کے وزیر تعلیم بنے اور آخر عمر تک اس عہدے پر فائز رہے۔ ۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء میں ان کا انتقال ہوا۔

ان کی تصنیفات میں ترجمان القرآن، تذکرہ، غبار خاطر، اور انڈیا ونز فریڈم نہایت اہم اور قابل قدر کتابیں ہیں [۱]

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے مولانا آزاد نے گیارہ برس کی عمر میں شعر گوئی شروع کر دی تھی۔ اسی زمانے میں انھوں نے علامہ شوق نیموی کی تصنیفات اصلاح اور ازاحۃ الاغلاط وغیرہ منگائیں اور ان کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ چوں کہ ان کتابوں میں اردو زبان کے اصول و قواعد اور متروک و مروج الفاظ سے بحث کی گئی تھی اس لئے مولانا آزاد ان کے مطالعہ سے نہایت متاثر ہوئے اور

---

[۱] دائرہ معارف اسلامیہ ۱/ ۹۹ — ۱۰۴

اور اس طرح علامہ شوق نیموی کی شعری داد بی (صلاحیت) اور زبان دانی کے قائل ہو گئے
اس کے بعد انہوں نے علامہ شوق نیموی سے خط و کتابت شروع کر دی۔
اور ان سے اپنے اشعار کی اصلاح لینے لگے۔ اور تا آخر مشق سخن ان سے
اصلاح لیتے رہے۔ اس طرح مولانا آزاد علامہ نیموی کے حلقہ تلمذ میں
داخل ہو گئے۔ اس کا ایک ثبوت تو "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی"
میں موجود ہے جیسا کہ مولانا آزاد خود فرماتے ہیں۔

"اس زمانے میں ایسا ہوا کہ شاعری کے متعلق کتابوں کی جستجو
میں رسالہ "اصلاح" اور "ازاحتہ الاغلاط" لکھنؤ سے منگوایا۔ یہ
دونوں رسالے مولوی ظہیر احسن نیموی کے تھے۔ اور فوائد متعلق
شعر گوئی اور مبحث متروکات و تصریح الفاظ میں بہت مفید ہیں
ان رسالوں سے ان کی دیگر تصانیف کا حال معلوم ہوا اور پھر
پٹنہ سے براہ راست انہیں لکھ کر تمام کتابیں منگوائیں۔ ان میں سرمۂ
تحقیق اور یادگار وطن بھی تھی۔

اس وقت جیسی طبیعت اور معاملات تھے اس کے لحاظ سے ان حالات
کا زیادہ اثر پڑا اور ان کی شاعرانہ واقفیت دل پر نقش ہو گئی۔
علی الخصوص یہ کہ شعر گوئی کے ساتھ قواعد و اصول اردو زبان کے
مباحث پر ان کو ایسا عبور ہے کہ ایک پوربی دیہاتی ہو کر جلال
مرحوم جیسے صاحب دعویٰ کو شکست فاش دے دی۔ نتیجہ یہ ہوا
کہ میں نے ان سے خط و کتابت کی اور اصلاح لینا شروع کر دیا۔"[1]

---

[1] آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی۔ ۲۴۱-۲۴۲

دوسرے یہ کہ جب مولانا عبدالرشید فوقانی ابن علامہ شوق نیموی کی مولانا آزاد سے کلکتہ میں ملاقات ہوئی تو مولانا آزاد نے خود اس کا انکشاف کیا۔ مولانا عبدالرشید فوقانی لکھتے ہیں:۔

"میں ۱۹۳۸ء میں محلہ بالی گنج کلکتہ مولانا آزاد کی خدمت میں حاضر ہوا تو مولانا آزاد نے فرمایا کہ آپ کے آنے سے ہم بہت خوش ہوتے۔ آپ کے والد مرحوم کو ایک راوی کے متعلق دریافت کرنا تھا اور اس وقت تہذیب التہذیب نہیں چھپی تھی۔ اس غرض سے کلکتہ ایشیاٹک سوسائیٹی کا کتب خانہ دیکھنے آتے اور میرے والد مرحوم کے یہاں ٹھہرے۔ میرا سن اس وقت چودہ برس کا تھا اس سال ہم فارغ ہوتے تھے۔ ہم نے مولانا کو ایک غزل لکھ کر دکھائی تھی"۔[1]

آخر میں ہم ہندستان کے مشہور اہل علم جناب مالک رام کی تحریر پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنے علمی مجلہ "تحریر" میں لکھتے ہیں۔

"مولانا آزاد نے امیر مینائی مرحوم اور داغ مرحوم سے ابتدا میں اصلاح لی مگر اصلاح پسند نہ آئی تو ظہور میرٹھی سے جو نسبتاً کم معروف تھے اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے اس کے بعد تا آخر مشق سخن مولانا ظہیر احسن شوق نیموی کے حلقہ تلمذ میں داخل رہے"۔[2]

بہرحال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا آزاد نے علامہ نیموی سے باضابطہ طور پر اصلاح لی اور ان کے حلقہ تلمذ میں داخل ہوتے۔

---

[1] القول الحسن: ۱۸۰ [2] مجلہ تحریر ۱۹۶۸ء

جناب مالک رام نے یہ شعر بطور نمونہ کلام پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

آزاد زندگی کے نشیب و فراز دیکھ　　پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

زبیر دہلوی

مرزا محمد رئیس بخت نام زبیر تخلص اور عرف مرزا محمد زبیر الدین گرگانی ہے والد کا نام مرزا محمد دارا بخت دہلوی ہے جو مغل بادشاہت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے لڑکے تھے زبیر غدر کے بعد جودھ پور میں مقیم رہے پھر ریاست دربھنگہ چلے گئے۔ جہاں مہاراجہ دربھنگہ نے ان کی کافی آؤ بھگت کی۔ یہی وجہ ہے کہ دربھنگہ میں تقریباً بیس پچیس برس تک سکونت پذیر رہے اور ایک سو پچاس روپیہ ماہانہ وظیفہ پاتے رہے۔

بہادر شاہ ظفر کے پوتہ ہونے کی وجہ سے مہاراجہ دربھنگہ ان کی نہایت عزت و احترام کرتا تھا۔ تصنیف و تالیف کا ذوق تھا — چنانچہ مہاراجہ کی فرمائش پر تاریخ موج سلطانی نامی ایک کتاب لکھی۔ چند رسالے بھی شائع کئے۔

پروفیسر نجیب اشرف ندوی مرحوم نے ندیم کے بہار نمبر ۱۹۳۵ء میں ان کی تین کتابوں کی نشاندہی کی ہے۔

(۱) امواج سلاطین۔ جس میں مغل بادشاہوں کے حالات لکھے گئے ہیں۔

(۲) چمنستان سخن:۔ یہ درحقیقت ان کا دیوان ہے جس میں اردو غزل کے علاوہ ایک قصیدہ، نعتیہ کلام اور ایک فارسی غزل ہے۔ اس کے علاوہ داغؔ، امیرؔ، شمشادؔ لکھنوی، تسلیم لکھنوی اور علامہ شوق نیموی کی وفات پر تاریخی قطعات بھی درج ہیں۔

(۳) درِ شہوار: یہ پانچ تاریخی مثنویوں کا مجموعہ ہے۔

زبیرؔ دہلوی اپنے عہد کے بہترین شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے شاعری میں علامہ شوق نیموی سے اصلاح لی، اور انہیں اس بات پر نہایت فخر تھا کہ علامہ نیموی جیسے باکمال شاعر اور ماہر فن استاد کی شاگردی نصیب ہوئی۔۔ یہی نہیں بلکہ ان کے بعض اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ وہ علامہ شوق نیموی کے رنگ و آہنگ اور اسلوب بیان کی پوری طرح پیروی کرتے تھے اور انہیں اس پر فخر تھا چنانچہ اس کا اظہار انہوں نے مختلف پیرایہ میں مختلف جگہ کیا ہے۔ دیکھئے مندرجہ ذیل اشعار میں فرماتے ہیں:۔

حضرت شوقؔ کا ہے فیض زبیرؔ　　تجھ میں ایسی جو خوش بیانی ہے

جب سے شوق نیموی سے ہے تلمذ اے زبیرؔ
پایہ کیسا بڑھ گیا تقریر کا تقدیر سے

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:۔

استاد شوقؔ کا جو تصور بندھا زبیرؔ
مضمون شوق دل سے اس وقت ابل پڑے

دوسری طرف یہ بھی دیکھئے کہ صوبہ بہار کو اس لحاظ سے فخر حاصل ہے کہ اس کے ایک فرد کے سامنے خاص اردوئے معلی کے مرکز لال قلعے کے ایک فرد اور بہادر شاہ ظفر کے پوتے نے زانوئے ادب تہ کیا اور اس کی نہ صرف شاگردی اختیار کی بلکہ اس کی پیروی کرنے میں فخر محسوس کیا۔ چنانچہ اس حقیقت کا اظہار پروفیسر نجیب اشرف ندوی اس طرح کرتے ہیں۔

"نہ صرف زبیرؔ بلکہ ان کے خویش مرزا زینہ بخت بھی حضرت شوق نیموی کے

شاگردوں میں تھے۔ صوبہ بہار کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کے ایک فرد نے اردوئے معلی کے مرکز لال قلعہ کے شاہی خاندان کے ارکان کے اشعار کی اصلاح کی ہے اور جب دیکھتے ہیں کہ شاہزادہ صاحب ابھی تک اپنی زبان پر نازاں اور اس کے لئے اپنا کہا مستند سمجھتے ہیں تو یہ فخر دوچند بڑھ جاتا ہے۔[1]

بہر حال حضرت زبیر دہلوی اپنے عہد کے مشہور شاعر تھے، حادثات زمانہ نے ان کے کلام میں خاص درد پیدا کر دیا تھا۔ ان کا طرز بیان صاف ہے اور کہیں کہیں ان کے اشعار میں شوخی کے ساتھ بلند پروازی بھی پائی جاتی ہے اردو شعراء کے مشہور تذکرہ نگار لالہ سری رام نے خم خانہ جاوید میں زبیر دہلوی کی مختلف غزلوں کے ۵۹ منتخب اشعار بطور نمونہ کلام تحریر کئے ہیں۔ ہم یہاں ایک غزل کے چند اشعار پیش کرتے ہیں۔

خود لپٹ جائے گا خنجر سے گلا اے قاتل جب ترے دست حنائی میں یہ عریاں ہوگا
وصل کا سن کے وہ پیغام یہی کہتے ہیں کھا گئے جان ہماری اجی ہاں ہاں ہوگا

سامنے رخ کے ترے زلفوں نے میرا دل لے لیا
کیا غضب ہے دن دہاڑے مجھ پر یہ شب خون ہوا

زباں پہ ذکر خدا دل میں حور کی خواہش
بتاؤ حضرت واعظ کی پارسائی کیا

کھٹک جو آج میرے دل میں ہو گئی ہے بیڈھب
نگاہ یار نے برچھی سی بھر لگائی کیا

زبیر دہلوی نے ساٹھ سال سے زائد عمر پاکر انتقال کیا۔[2]

[1] خم خانہ جاوید ۳/۶۱۸
[2] ندیم بہار نمبر ۱۹۳۵ء

ضیا عظیم آبادی

مرزا علی رضا نام اور ضیا تخلص ہے۔ والد کا نام مرزا علی قدر تھا۔ محلہ شاہ کی املی شہر پٹنہ کے باشندہ تھے۔ ۱۲۹۹ھ میں پیدا ہوئے۔ معمولی علم حاصل کیا تھا۔ مگر شعری ذوق خدا داد تھا بارہ تیرہ برس کے سن سے شعر کہنے لگے۔ انیس سال کی عمر میں ایک دیوان ردیف وار مرتب کیا۔ ابتدا میں عبد السبحان مائل تلمیذ علامہ شوق نیموی سے اصلاح لیتے رہے بعد میں خود علامہ شوق نیموی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہو گئے۔ اور باضابطہ ان سے اصلاح لینے لگے۔ شاہ ولی الرحمٰن ولی کاکوی نے رسالہ نقوش میں لکھا ہے

"ضیا عظیم آبادی کا دیوان عرصہ ہوا شائع ہوا تھا۔ اب ناپید ہے۔ یہ مولانا شوق نیموی کے شاگردوں میں تھے" [1]

اسی طرح جناب فصیح الدین بلخی نے ماہنامہ اشارہ میں ایک جگہ لکھا ہے

"عظیم آباد میں شوق کے تلامذہ میں مرزا علی رضا ضیا عظیم آبادی نے بڑی شہرت حاصل کی" [2]

ان کی شاعری میں عاشقانہ رنگ کے ساتھ کیف و درد اور میر کے انداز کا سوز و گداز نظر آتا ہے۔ ان کا شعری مجموعہ "دیوان ضیا" کے نام سے چھپ چکا ہے جو ۱۵۲ صفحات پر مشتمل ہے اور بقول حکیم مولانا احمد اللہ ندوی اس میں پونے دو سو غزلیں ہیں۔ جن کے اشعار کی تعداد دو ہزار تین سو کے قریب ہے اس کے علاوہ رباعیات، ترجیع بند اور قصائد کے اشعار ملتے ہیں۔

ایک غزل کے چند اشعار بطور نمونہ کلام ملاحظہ ہوں ؎

---

[1] ماہنامہ نقوش لاہور شخصیات نمبر ۱۹۵۶ء [2] ماہنامہ اشارہ پٹنہ دسمبر ۱۹۵۸ء

ہنسی ہنسی میں تو ہیں اس سے دل لگا بیٹھا | رلا رہی ہے ضیا اب یہ دل لگی مجھ کو
اک فقط درد جگر ہو تو کہا جائے | روگ سو طرح کے سو طرح کی ایذا مجھ کو
آدمی ہجر میں گھبرا کے بھی مر جاتا ہے | بے کسی پر بھی ہوا موت کا دھوکہ مجھ کو

ایک دوسری غزل کے چند اشعار بھی ملاحظہ کیجئے اور شاعر کی زبان و بیان اور پر درد لہجے سے لطف اٹھائیے ۔

فرقت میں اپنی جان پہ کیا کیا گزر گئی | دل سے مگر نہ لذت درد جگر گئی
اٹھا اٹھا کے فتنہ کہتا ہے رفتار یار کا | بتلاؤ حشر والو قیامت کدھر گئی
یوں زندگی کٹی نہ کسی کے فراق میں | سو بار میرے مرنے کی ان کو خبر گئی

قصۂ شب فراق کا جانے بھی دو ضیا
اب اس کا ذکر کیا ہے جو پہلے گزر گئی [1]

وفات

علامہ شوق نیموی اپنی عمر کے چالیس سال پوری کر چکے تھے کہ پیام اجل آگیا اور وہ ۱۷ رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ مطابق ۲۵ نومبر ۱۹۰۴ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے [2]

---

[1] تذکرہ مسلم شعرائے بہار، سوم- ۷۶-۸۴

[2] یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولانا حکیم عبدالحیؒ لکھنوی نے نزہۃ الخواطر ۸/۲۰۷ میں علامہ شوق نیموی کا سن وفات ۱۳۲۵ھ لکھا ہے- جو قطعاً غلط ہے کیونکہ علامہ نیموی کے لڑکے مولانا عبدالرشید فوقانی نے جریدہ نقیب پھلواری شریف- ۲- شعبان المعظم ۱۳۷۹ کے شمارے میں علامہ نیموی کی حیات پر ایک مختصر مضمون لکھا ہے جس میں ان کا سن وفات وہی دیا ہے جو میں نے اوپر تحریر کیا ہے اس کے علاوہ اگلے صفحات میں ان کی وفات کے جو تاریخی قطعات تحریر کئے جا رہے ہیں ان سے بھی ہمارے بیان کی تائید ہوتی ہے۔

علامہ نیموی نے صرف ۴۴ سال کی عمر پائی لیکن اس مختصر سی مدت میں علم وادب کی دنیا میں انہوں نے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ پورے ہندستان میں ان کے فضل وکمال کا شہرہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کا وصال ہوا تو ہندستان کے علماء وادباء سوگوار ہوتے۔ اور انہوں نے تحریر وتقریر سے اپنے اپنے غم کا اظہار کیا۔ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔



باب ششم

ادبی تصنیفات

علامہ شوق نیموی کو شعر وادب سے بچپن سے خصوصی شغف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ طالب علمی میں مذہبی کتابوں کے ساتھ ساتھ شعری وادبی کتابوں کا مسلسل مطالعہ کرتے رہے اور غازی پور اور لکھنؤ کی شعری وادبی محفلوں سے مستفید ہوتے رہے یہاں تک کہ قدرت نے اسی زمانے میں انہیں اس لایق بنا دیا کہ وہ اب دوسروں کو فائدہ پہنچا سکیں اور معیاری کتابیں تصنیف کر سکیں چنانچہ زمانہ طالب علمی ہی میں ۲۷ سال کی عمر میں انہوں نے ازاحۃ الاغلاط، اصلاح اور نغمۂ راز جیسی اہم اور قابل قدر کتابیں تصنیف کر ڈالیں جنہوں نے نہ صرف عوام کو فائدہ پہنچایا بلکہ ملک کے اہل علم کو بھی نہایت متاثر کیا۔

زمانہ طالب علمی کے بعد بھی علامہ نیموی کے مطالعہ کتب کا سلسلہ جاری رہا ان کے مطالعہ میں مذہبی وادبی دونوں طرح کی کتابیں رہتی تھیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ان دونوں موضوعات پر نہایت گراں قدر کتابیں تصنیف کیں۔ یہ کتابیں اپنے مرتبہ اور معیار کے لحاظ سے اتنی اہم ہیں کہ یہ آج بھی ہمارے لئے سرمایۂ افتخار ہیں۔ مندرج ذیل سطور میں ان کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

چوں کہ سب سے پہلے انہوں نے شعر وادب کے موضوع پر قلم اٹھایا اس کے بعد مذہبی موضوع پر لکھنا شروع کیا۔ اس لئے پہلے ہم ان کی شعری وادبی تصنیفات پر

گفتگو کریں گے اس کے بعد ان کی مذہبی تصنیفات پر تبصرہ کریں گے۔

ازاحتہ الاغلاط

یہ فارسی زبان میں ایک نہایت مفید رسالہ ہے۔ جو بڑے سائز میں ۳۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ زیر نظر رسالہ ۱۸۹۳ء میں قومی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اس کی علمی و ادبی افادیت کے پیش نظر مولانا حسرت موہانی نے بھی اسے اپنے اردو پریس علی گڑھ سے طبع کرایا تھا۔

اس رسالے میں عربی و فارسی کے ایسے الفاظ کی تحقیق نہایت شرح و بسط کے ساتھ کی گئی ہے جنہیں اردو داں طبقہ غلط بولتا یا ان کے غلط معنی مراد لیتا ہے۔ ہر لفظ کی تحقیق میں فارسی شعراء کے کلام اور لغت کی مستند کتابیں سند کے طور پر پیش کی گئی ہیں۔

اس کتاب کا آغاز مقدمہ سے کیا گیا ہے جس میں غلط عام اور غلط عوام کی تشریح کی گئی ہے۔ اس کے بعد مختلف فصلیں قائم کی گئی ہیں جن کی ترتیب حروف تہجی کے لحاظ سے قائم کی گئی ہے۔ چنانچہ پہلی فصل الف پر مشتمل ہے جس میں الف سے شروع ہونے والے الفاظ کی تحقیق کی گئی ہے۔ دوسری فصل بای تازی پر مشتمل ہے جس میں بای سے شروع ہونے والے الفاظ زیر بحث آئے ہیں۔ اسی طرح آخری فصل یای تحتانی کے سلسلے میں ہے جس میں انہیں الفاظ کی تحقیق کی گئی ہے جو یای سے شروع ہوتے ہیں۔

آخر میں خاتمہ در فوائد منثورہ کے عنوان کے تحت مختلف الفاظ کی تحقیق کی گئی ہے۔ جو تقریباً ۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

اس کتاب کے طرز بیان اور اسلوب تحقیق جاننے کے لئے یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ فصل الف کے ذیل میں اخوان اور کچھ دوسرے الفاظ کے سلسلے میں گفتگو کرتے

ہوئے لکھتے ہیں: "اخوان بالکسر والضم بر وزن فعلان جمع اخ از صحاح وقاموس ومصباح منیر وتاج اللغات وغیرہ وعوام کہ بالفتح خوانند وجمع بر وزن افعال دانند خطا است۔ ادعیہ بہ تخفیف تحانی است نہ بتشدید یا، آں چہ ایں جمع قلت است بر وزن افعلہ۔ ارجمند بسکون جیم مرکب است از کلم ارج کہ بمعنی قدر ومرتبہ باشد و از کلم مند کہ بمعنی صاحب آید از فرہنگ جہانگیری وغیرہ و در کشف اللغات نوشتہ کہ بضم جیم غلط است چہ در مرکبات اظہار حرکت حرف آخر کلمہ اول نشاید"[1]

فصل جیم کے تحت جدہ اور کچھ دوسرے الفاظ کی تحقیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"جدہ بضم الاول نام شہریست مشہور برکنارہ بحر مکہ معظمہ از صراح و قاموس و منتہی الارب وکشف اللغات و در بعض لغت بالکسر نوشتہ بالجملہ بایں معنی بالفتح غلط است۔ جراحت بالکسر ریش از صراح و منتخب اللغات و بہار عجم وغیرہ و بالفتح، خطا است۔ جرمانہ چیزی کہ از مجرم گیرند مرکب است از جرم و آنہ کہ از کلم نسبت ست، چوں سالانہ و ماہانہ و بجای آں جریمانہ و جریبانہ محض غلط است"[2]

اس کتاب کی اہمیت اور قدر وقیمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مؤلف آصف اللغات نے اپنی لغت کے دیباچہ میں اس کا ذکر کیا ہے اور جابجا اس سے استفادہ کیا ہے۔

[1] ازاحۃ الاغلاط:۔ ۱۴ [2] ازاحۃ الاغلاط: ۱۰

اصلاح | یہ اصلاحِ زبان کے لئے اردو زبان میں نہایت مفید رسالہ ہے جو ۳۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ رسالہ کئی بار چھپا۔ پہلی بار ۱۸۸۷ء میں چھپا

پھر ۱۹۰۸ء میں مولانا حسرت موہانی نے اپنے اردو پریس علی گڑھ سے ازاحتہ الاغلاط اور ایضاح کے ساتھ شائع کیا۔ زیر نظر رسالہ قومی پریس لکھنؤ سے ۱۸۹۳ء میں چھپا تھا۔

اس رسالے کی تالیف کا مقصد جیسا کہ علامہ شوق نیموی نے لکھا ہے، یہ ہے کہ اردو زبان کے نو آموز شعرا کو زبان و بیان کی خامیوں سے محفوظ رکھنا اور جو الفاظ متروک ہو چکے ہیں ان سے باخبر کر دینا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناسخ و آتش، جلال، نسیم دہلوی، داغ دہلوی، شمشاد لکھنوی جیسے اہم شعرا کے اشعار سند کے طور پر پیش کئے گئے ہیں۔

اس رسالہ میں تعقید لفظی، حشو، مقدرات، شتر گربہ، پہلوئے ذم، مبتذل مضامین، املا، کے بعض الفاظ، تذکیر و تانیث اور ایطا وغیرہ جیسے اہم عنوانات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔

یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن کے مطالعہ سے ان کے انداز بیان کا علم ہوتا ہے ـــــ حشو کی تعریف میں لکھتے ہیں :-

"حشو اس زاید لفظ کو کہتے ہیں جس کے حذف کرنے سے کلام میں حسن پیدا ہو جائے حتی الامکان حشو سے احتیاط چاہئے مگر بعض جگہ شاعر اس کے اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، جیسے :-

شمشیر بکف دیکھ کے حیدر کے پسر کو
جبریل لرزتے تھے سمیٹے ہوئے پر کو

دوسرے مصرع میں" کو" حشو ہے مگر ردیف ہونے سے شاعر مجبور ہو گیا۔

المختصر جہاں ادنیٰ تغیر و تبدل سے اسکا نکالنا ممکن نہ ہو وہاں اس قسم کے الفاظ معیوب سمجھے جاتے ہیں"۔[۱]

مقدرات کے سلسلے میں فرماتے ہیں۔

"مقدر اس لفظ کو کہتے ہیں جو مذکور نہ ہو۔ مگر اس کے معنی لیے جائیں۔ اگرچہ بعض جگہ تقدیر مزا دے جاتی ہے جیسے ؎

کبھی اون سے امید الفت ہے　　　کبھی یہ فکر ہے اگر نہ ہوتی

مگر اکثر جگہ یہ تقدیر فصاحت کے خلاف ہوتی ہے۔ جیسے ؎

نالہ سا آہ اگر چرخ ہلا یا بھی تو کیا

اس میں حرف ندا مقدر ہے یعنی اے نالہ سا آہ"۔[۲]

الیضاح یہ کوئی مستقل رسالہ نہیں بلکہ مذکورہ رسالہ (اصلاح) پر نہایت مفید حاشیہ ہے جو ۱۸۹۳ء میں قومی پریس لکھنؤ سے اسی رسالے کے ساتھ چھپا ہے کیونکہ اصلاح کا جب پہلا اڈیشن ختم ہو گیا اور دوسری مرتبہ اس کی طباعت کا ارادہ ہوا تو نثار حسین صاحب مہتمم پیام یار لکھنؤ کے اصرار پر علامہ شوق نیموی نے اس پر جا بجا حاشیہ لکھا اور اس کا نام الیضاح رکھا۔ علامہ نیموی خود ہی لکھتے ہیں:۔

المختصر اس رسالہ (اصلاح) نے بہت کچھ قبول پیدا کیا۔ اور بات کی بات میں ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ جناب نثار مہتمم پیام یار نے دوبارہ چھاپنے کی چند بار مجھ سے اجازت طلب کی آخر اون کے اصرار سے پہلے نظر ثانی کی

[۱] اصلاح: ۵　[۲] اصلاح: ۷

جا بجا حذف و اثبات کا اتفاق ہوا۔ گھٹانے بڑھانے کی نوبت آئی۔ ع

نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اوّل

جب یہ درست ہو گیا تو اس پر مختصر سا حاشیہ لکھا اور الیضاح نام رکھا!

سرمۂ تحقیق جب رسالہ ازاحۃ الاغلاط چھپ گیا تو ملک کے اہل علم نے اس کی نہایت قدر کی اور ہر جگہ اس کی پذیرائی ہوئی۔ لیکن اس میں جلال لکھنوی کی تنقیح اللغات سے بعض تحقیقی امور میں اختلاف ہو گیا تھا اس کی وجہ سے اس کی اشاعت سے جلال لکھنوی چراغ پا ہو گئے۔ اور اس کے جواب میں "رد تردید" نامی ایک رسالہ لکھ کر اپنے ایک شاگرد کے نام سے چھپوایا تاکہ علامہ شوق نیموی کی تحقیقات بے وزن ہو جائیں۔

جب یہ رسالہ چھپ گیا تو بعض احباب نے علامہ شوق نیموی کو مجبور کیا کہ اس کے جواب میں کوئی رسالہ مرتب کریں تاکہ صحیح بات اہل علم کے سامنے آسکے۔

۱۳۰۵ھ میں جب علامہ نیموی علوم دینیہ کی تحصیل سے فارغ ہو کر لکھنؤ سے گھر واپس ہو رہے تھے تو یہ رسالہ انہیں ملا۔ چنانچہ احباب کے اصرار پر انہوں نے رد تردید کا جواب گھر پر آکر لکھا اور سرمۂ تحقیق کے نام سے چھپوایا۔ یہ رسالہ اردو زبان میں ۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں جلال لکھنوی کی بعض تحقیقی خامیوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اور نہایت تحقیق کے ساتھ اپنے دلائل تحریر کئے گئے ہیں۔

قارئین کی دلچسپی کے لئے چند نمونے حاضر خدمت ہیں، دیکھئے عادی کے سلسلے میں جلال لکھنوی کی تحقیق نقل کرتے ہوئے علامہ نیموی فرماتے ہیں۔

" عادی بمعنی عادت کنندہ غلط ہے حتی کہ شعرائے اردو نے بھی استعمال نہیں کیا۔

کہ مہند کہیئے "۔ اس کے بعد علامہ نیموی جواباً فرماتے ہیں :-

حضرت مجھ سے سند میں سنئے خواجہ وزیر فرماتے ہیں ؎

ذکر ابرو کی زبان عادی ہوتی ۔۔۔ بات سیدھی بھی جو کی ٹیڑھی ہوئی

نواب مرزا لکھنوی صاحب مثنوی زہر عشق میں فرماتے ہیں ؎

ہم تو دشمن ہیں جلسازی کے ۔۔۔ آپ عادی ہیں رنڈی بازی کے [1]

جلال لکھنوی نے ایک جگہ ابرگ اور ابرق دونوں کو ایک معنی میں لیا ہے۔ اس سلسلے میں علامہ نیموی لکھتے ہیں

"ابرک کی عربی بہ تبعیت صاحب غیاث اللغات آپ (جلال لکھنوی) نے ابرق لکھی ہے حالاں کہ ابرق ابرک کے معنوں میں کہیں نہیں آیا۔ البتہ طلق اس کی عربی ہے اور ابرق وہ زمین ہے جس میں مٹی، ریگ، پتھر ملے ہوں۔ ابرک کا مفہوم اور ہے اور ابرق کے معنی اور ہیں، جو معنی صراح وغیرہ میں لکھے ہیں اس سے ابرک سمجھنا سراسر غلط فہمی ہے۔ غرض کہ ابرق ابرک کے معنوں میں ہرگز صحیح نہیں۔" [2]

دیوان شوق یہ علامہ شوق نیموی کا شعری مجموعہ ہے جس کو محمد نور الہدیٰ نیموی نے ان کی وفات کے بعد مرتب کیا۔ بقول ان کے علامہ نیموی کی اکثر غزلیں ضائع ہوگئی تھیں تاہم انتہائی تلاش وجستجو کے بعد جو شعری سرمایہ انھیں مل گیا انھوں نے اس دیوان میں جمع کر دیا ہے۔

یہ دیوان ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے جو ۱۳۲۶ھ میں مطبع سیدی پٹنہ سے شائع ہوا۔ اس کا تاریخی نام "نظم سحر سازہ" ہے، جس سے ۱۳۲۶ کی تاریخ نکلتی ہے۔

[1] سرمۂ تحقیق : ۴۷ [2] سرمۂ تحقیق : ۴۹

اس دیوان میں حمد، نعت، غزلیں، رباعیات، قصائد اور قطعات ہیں۔ سب سے پہلے غزلیں ملتی ہیں جو حروف تہجی کے لحاظ سے ردیف وار مرتب ہیں۔

یہ الف تا یای کی ردیف پر مشتمل ہیں اور ان کی کل تعداد ۴۹ ہے۔

قصائد کی تعداد آٹھ ہے۔ رباعیات ۲۸ ہیں اور قطعات ۲۶ ہیں جو مختلف اہل علم کی وفات اور ان کی تصنیفات کی طباعت پر کہے گئے ہیں۔

دیوان کی ابتدا حمد باری سے ہوتی ہے جس کے ابتدائی دو شعر اس طرح ہیں۔

ہے مرے دیوان پر گنبد جو بسم اللہ کا	سایہ رحمت ہے ہر اک شعر پر اللہ کا
جب قلم نے حمد میں لکھا الف اللہ کا	ہو گیا دل کو عصا دست کلیم اللہ کا

قطعات کے بعد میکش حیدر آبادی، مولانا عبدالاحد شمشاد لکھنوی اور حکیم آغا حسن نازک لکھنوی کے تاریخی قطعات درج ہیں جو انہوں نے اس دیوان شوقی کی طباعت پر کہے ہیں۔

نغمہ راز اردو زبان میں بھی ایک خوبصورت مثنوی ہے جس کا تاریخی نام نغمۂ راز ہے جس سے ۱۳۰۳ھ کی تاریخ نکلتی ہے۔ قومی پریس لکھنؤ سے طبع ہوئی ہے اور ۲۸ صفحات پر مشتمل ہے اس میں حسن و عشق کے واقعات نہایت دلچسپ اور خوبصورت انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ یہ مثنوی اس طرح شروع ہوتی ہے۔

دل سے ہوں شیفتہ حسن قدیم	طور سینائے وفا کا ہوں کلیم
واقف سر معانی ہوں میں	کاشف راز نہانی ہوں میں
دیدہ حسن حقیقت میں ہوں	چشم بینائے طریقت میں ہوں
دل ہے خلوت کدہ ناز و نیاز	سینہ صاف ہے آئینہ راز
جوش پر آج ہے صہبائے الست	بادۂ عشق سے ہوں میں سرمست

خاتمہ کے اشعار یہ ہیں ؎

قصہ کوتاہ ہوئی جب یہ تمام — تھی مجھے فکر کہ رکھوں کیا نام
بلبل فکر ہوئی زمزمہ ساز — نام رکھ شوق حزیں نغمۂ راز

دل نے پھر مصرع تاریخ کہا
ختم اللہ لہا بالحسنیٰ

اس کے بعد امیر مینائی، تسلیم لکھنوی اور شمشاد لکھنوی وغیرہ کے تاریخی قطعات ملتے ہیں جو اس مثنوی کی طباعت پر کہے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ درد جدائی، صبح وصال، شام فراق نامی مختصر مثنویاں بھی درج ہیں۔

سوز وگداز | یہ اردو زبان کے علامہ شوق نیموی کی ایک معرکۃ الآرا مثنوی ہے جس میں محمد حسن اور شام سندر کی پاک محبت کا نقشہ نہایت دل کش انداز میں کھینچا گیا ہے۔ اور ان کے عشق ومحبت کے واقعات نہایت مؤثر پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ یہ ۱۳۱۲ھ میں لکھی گئی تھی۔

زیر نظر مثنوی نظامی پریس پٹنہ سے چھپی ہے۔ جو ۴۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ مثنوی اس طرح شروع ہوتی ہے ؎

مرا یک خیال عرش پیما — سواد حمد میں ہے جلوہ فرما
یہی دل میں ہے فکر نکتہ داں کے — کہ تارے توڑ لاؤں آسماں کے
دکھاؤں رفعت شیوا بیانی — بنوں شہباز اوج نکتہ دانی
کروں میں نظم کا رتبہ دو بالا — کہ ہو ملک سخن میں بول بالا

یہ مثنوی یوں ختم ہوتی ہے ؎

کہاں تک شوق یہ پرغم کہانی — کرو اب ختم اپنی نوحہ خوانی

اگر ہے فکر تاریخ دل آویز | تو لکھو مثنوی حیرت انگیز
سنو پھر سال تاریخ خداداد | پسند خاطر ہر با صفا باد

اس کے بعد داغ دہلوی اور سید عباس حسن فصاحت کے تاریخی قطعات درج ہیں جو اس مثنوی کی طباعت پر کہے گئے ہیں۔

اس کے بعد علامہ شوق نیموی کی دوسری تصنیفات "یادگار وطن اور سیر بنگال کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ جو انکی سوانح حیات اور سفرنامے ہیں۔

یادگار وطن یہ کتاب دراصل علامہ شوق نیموی کی خود نوشت سوانح حیات ہے جو قومی پریس لکھنؤ سے چھپی ہے اور ۱۵۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

اس کتاب میں سب سے پہلے نیمی اور اہل نیمی کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد علامہ نیموی نے اپنے آباواجداد کے حالات قلم بند کئے ہیں اور پھر اپنی زندگی کے حالات و واقعات بیان کئے ہیں۔ اس ضمن میں پیدائش، ابتدائی زندگی تعلیمی اسناد، اساتذہ اور تصنیفات و تالیفات کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ جلال لکھنوی کے ساتھ کا ادبی معرکہ، اپنی ادبی متروکات اور اپنے بعض شاگردوں کے حالات بھی قلم بند کئے ہیں۔

اخیر میں شیوخ و سادات اور پھر نیمی اور چمن پورہ کے شیوخ اور اپنے خاندان کا شجرہ نسب تحریر کیا ہے۔

اس کتاب میں علامہ نیموی کے جس انداز میں نیمی کے حالات لکھے ہیں اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ انہیں اس سرزمین سے نہ صرف محبت اور لگاؤ تھا بلکہ والہانہ عشق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس کی تعریف میں کئی نظمیں کہی ہیں اور نثر کی

زبان میں اپنے وارفتگی اور محبت کا اظہار کیا ہے۔[۱]

سیر بنگال

یہ علامہ شوق نیموی کا سفر نامہ ہے جو سفر بنگال کے سلسلے میں ہے ــــ علامہ نیموی نے ۲۰ ذی قعدہ ۱۳۱۹ھ میں کلکتہ کا سفر کیا تھا تاکہ ایشیاٹک سوسائٹی جاکر وہاں کی کچھ اہم کتابیں مطالعہ کرسکیں اس ضمن میں کلکتہ کے علاوہ بعض دوسرے شہروں کا بھی سفر کیا اور وہاں کے احباب اور اپنے رشتہ داروں سے ملاقاتیں کیں۔ بعض علمی و تاریخی مقامات کی زیارت کی اور پھر سفر سے واپس آکر سیر بنگال کے نام سے مذکورہ کتاب لکھی جو ۲۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور احسن المطابع پٹنہ سے چھپی ہے۔

اس میں کلکتہ کے علاوہ، گوالندو، چاندپور، چاٹگام، ڈھاکہ، نارائن گنج وغیرہ کے حالات نہایت دلکش اور خوبصورت طریقے سے بیان کئے گئے ہیں۔ بعض کتب خانوں اور دینی اداروں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ یہ بنگال کے سلسلے میں نہایت مفید اور معلوماتی کتاب ہے۔

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے صـ ۳۷-۳۸

باب ہفتم

شاعری

علاّمہ شوق نیموی نے غزل، مثنوی، رباعیات اور قطعات جیسے اہم اصناف سخن میں طبع آزمائی کی، اور خوبصورت اشعار کہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شعر و شاعری کی دنیا میں انہیں اہم مقام حاصل ہوا، اور شعرائے دہلی و لکھنؤ نے انہیں ایک بڑا شاعر تسلیم کیا۔۔ مندرجہ ذیل سطور میں ان کی شاعری پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جارہی ہے۔ اور اس فن میں ان کا مقام کیا ہے؟ اس کی تعیین کی کوشش کی جارہی ہے۔

غزل گوئی

علاّمہ شوق نیموی کی غزل گوئی پر گفتگو کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غزل گوئی کی اجمالی تاریخ بیان کردی جائے تاکہ اس کی تاریخی روشنی میں علامہ نیموی کی غزل گوئی کا مقام سمجھنے میں ہمیں مدد مل سکے۔

غزل اردو شاعری کی نہایت اہم، خوبصورت اور نازک صنف ہے۔ یہی وہ صنف ہے جو اردو شاعری کی آبرو کہی جاتی ہے، اور اس کی وجہ سے اردو شاعری کو عالمی ادب میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اس کی تاریخ تقریباً تین سو سال پرانی ہے۔

غزل کیا ہے؟ اردو ناقدین نے مختلف طریقے سے اس کی تعریف کی ہے۔ چنانچہ نواب امداد امام اثر کے نزدیک غزل ایک ایسی صنف ہے جس میں داخلی امور اور قلبی واردات

کا اظہار کیا جائے۔ فرماتے ہیں:۔

"اصطلاح میں اس (غزل) سے وہ صنف شاعری مراد ہے جس میں ایسے مضامین جو اعلیٰ درجے کے واردات قلبیہ اور ارفع درجے کے امور ذہنیہ سے خبر دیتے ہیں۔ حوالہ قلم کئے جاتے ہیں۔"[1]

لیکن پروفیسر سید مسعود حسن رضوی کی رائے اس سے مختلف ہے۔ وہ اس کی وسعت کے قائل ہیں اور فرماتے ہیں کہ اردو غزل میں صرف عشق و محبت اور واردات قلبیہ ہی نہیں بلکہ انسان کے ہر طرح کے خیالات وجذبات پیش کئے جا سکتے ہیں اور اس صنف میں اس کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ دیکھئے غزل پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اردو غزل عشق و محبت میں محدود نہیں ہوتی بلکہ گوناگوں جذبات اور رنگارنگ خیالات کا گل دستہ ہوتی ہے۔ ہاں واقعات اور مناظر کی تفصیل، مرقع نگاری البتہ غزل کے احاطے سے خارج ہے۔"[2]

اردو غزل کا سب سے پہلا شاعر کون ہے؟ اس کے بارے میں بھی محققین کے خیالات مختلف ہیں کچھ ارباب تحقیق کا کہنا ہے کہ سب سے پہلا غزل گو شاعر قطب شاہ ہے۔ لیکن جہاں تک غزل کی ہیئت، مواد اور ادبیت کا مسئلہ ہے اس لحاظ سے ولی دکنی ہی اردو غزل کا سب سے پہلا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے کیوں کہ سب سے پہلے اسی نے غزل کو ایک فن اور باوقار صنف سخن کے طور پر اپنایا ہے۔ ولی کی غزلوں میں قلبی واردات اور عشق و محبت کے واقعات نہایت کثرت سے ملتے ہیں۔ اس نے جو عشقیہ مضامین بیان کئے ہیں وہ فطرت کے عین مطابق ہیں۔ اور طرز ادا اور زبان و بیان کے لحاظ سے بھی اس کا کلام نہایت سادہ، عام فہم اور تکلف و تصنع سے پاک ہے۔

[1] کاشف الحقائق حصہ دوم: ص ۳۱ [2] ہماری شاعری: ۱۷۱

یہی غزل جب دکن سے نکل کر دہلی پہنچی تو وہاں حاتم مظہر جان جاناں، شاہ نصیر، سودا، درد، میر تقی میر کے یہاں اس کی زبان و بیان اور جذبات و خیالات میں مزید نکھار پیدا ہوئی اس کی دل کشی اور خوبصورتی میں کافی اضافہ ہوا لیکن جہانتک اس کی ہیئت اور مزاج کا سوال ہے اس میں بنیادی طور پر کوئی فرق پیدا نہیں ہوا

میر پہلے شاعر ہیں جنہوں نے گہرائی، تاثیر اور اثر انگیزی سے صنف غزل کو مالا مال کیا۔ اس کے لب و لہجہ کو سنجیدگی اور متانت سے آشنا کیا۔ میر ہر شعر میں دل کی گہرائیوں سے کوئی نہ کوئی بات ضرور پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کا مشاہدہ گہرا اور مطالعہ وسیع ہے۔ ان کی غزلوں میں سادگی اور پرکاری کے ساتھ ساتھ درد و غم، مایوسی اور ناکامی کی پر تاثیر جھلکیاں ملتی ہیں۔

سودا کی غزل گوئی میر سے مختلف ہے۔ ان کے ہاں درد کے ساتھ ساتھ عیش و نشاط کے نغمے بھی ہیں اور ظرافت کی پھلجھڑیاں بھی۔

درد کی غزلوں میں تصوف کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ لیکن وہ تغزل اور شعریت کے دامن کو کبھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ ان کا اپنا رنگ اور لہجہ ہے جو دوسروں سے مختلف ہے۔

مرزا غالب نے غزل کو رمزیت و ایمائیت کے ہشت پہل عطا کئے۔ ذوق نے زبان کو پختگی دی۔ اور مومن نے اس کے انداز گفتگو کو سحر آفرینی سے ہم کنار کیا لیکن جب زمانہ نے کروٹ لی اور دلی اجڑ گئی تو اودھ کی سلطنت آباد ہوئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی کے شعراء نے وہاں کی زبوں حالی اور معاشی تنگی سے پریشان ہو کر اودھ کی طرف رخ کیا۔ اودھ کی سرزمین بھی ان کو خوش آمدید کہنے کے لے منتظر تھی۔ جب دہلی کے شعراء لکھنؤ پہنچے تو وہاں کے خوش حال، پرسکون اور

پرعیش ماحول سے متاثر ہو کر انہوں نے صنف غزل کو ایک نئے رنگ و آہنگ سے آشنا کیا۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد لکھنؤ کے شعراء نے اپنی انفرادیت باقی رکھنے کی غرض سے انحراف کی تحریک چلا دی جس کے علم بردار ناسخ اور آتش تھے۔ اور پھر ان کے بعد ان کے شاگردوں نے اس کو مزید تقویت بخشی۔ لیکن اس تحریک کے باوجود ہمیں کچھ لکھنوی شعراء ایسے ملتے ہیں جنہوں نے اس تحریک کا اثر قطعاً قبول نہیں کیا، اور متعصب فضا میں بھی دہلوی رنگ غزل گوئی سے اپنی وابستگی برقرار رکھی۔ اس سلسلے میں جلال لکھنوی اور تسلیم لکھنوی کا نام خاص طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ جلال کہتے ہیں:

کہنے کو جلال آپ بھی کہتے ہیں وہی طرز + لیکن سخن میر تقی میر کی کیا بات

تسلیم، نسیم دہلوی کے واسطے سے دلستان مومن کے شاعر ہیں۔ وہ جلال لکھنوی سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر شاعران لکھنؤ سے اپنی بے تعلقی ظاہر کرتے ہیں

میں ہوں اے تسلیم شاگرد نسیم دہلوی مجھ کو طرز شاعران لکھنؤ سے کیا غرض

تسلیم کی شاعری کا بغور مطالعہ کیا جائے تو صاف پتا چلتا ہے کہ ان کی غزل گوئی دو دبستان کا حسین سنگم ہے۔ ان کے ہاں دہلوی رنگ بھی ملتا ہے اور لکھنوی رنگ بھی، اور یہی ان کی غزل گوئی کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دہلوی رنگ تغزل کیا ہے اور لکھنوی رنگ تغزل کیا؟

تاریخ ادب کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ دلی جوں کہ اجڑ چکی تھی

اس لئے وہاں کے شعراء زخم خوردہ اور حرماں و یاس کے مارے ہوئے تھے اس کے برخلاف حالات نے لکھنؤ کو بیت السرور بنا دیا تھا اور وہاں کے لوگ نہایت خوش حال زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس لئے وہاں کے شعراء پر اس کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پر تکلف اور پر تعیش زندگی گذارنے لگے۔ اور وفور عاشقی میں سرشار ہو گئے۔

اس روشنی میں جب ہم دلی اور لکھنؤ کی غزل گوئی کو دیکھتے ہیں تو دہلی میں غزل حرماں نصیبی، اشک افشانی اور دل شکستگی کی ترجمان بن کر سامنے آتی ہے۔ اس کے برخلاف لکھنؤ کی غزل میں وصال یار کی لذت، اور آہ کی جگہ واہ نظر آتی ہے۔

دہلوی غزل میں عشق حقیقی کا اظہار، تصوّف کی چاشنی، آمد اور سوز و گداز ملتا ہے۔ جبکہ لکھنوی غزل میں حسن کی رنگینی اور دل کش ادائیں، شوخیاں چھیڑ چھاڑ اور دھول دھپہ نظر آتا ہے۔ شعرائے دہلی کے ہاں عام طور پر رعایت لفظی، صنائع و بدائع کی فرضی و مصنوعی لوازم اور مشکل قوافی نہیں پائے جاتے جبکہ شعرائے لکھنو کے یہاں یہ تمام چیزیں نظر آتی ہیں۔ لکھنوی شعراء کے یہاں ایک اور چیز ملتی ہے اور وہ دو غزلے اور سہ غزلے کی روایت ہے۔ جو شعرائے دہلی کے یہاں نہیں ملتی۔

حضرت تسلیم کا کمال یہی ہے کہ انہوں نے لکھنوی ہوتے ہوئے بھی دہلی اور لکھنؤ دونوں کے رنگ تغزل سے اپنی غزل کو ہم آہنگ کیا۔ ان کی غزلوں میں تغزل، صداقت رنگینی، سوز اور تاثیر ملتی ہے۔ جو دہلوی رنگ تغزل کی شان ہے۔ لیکن زبان و بیان کے لحاظ سے ان کے یہاں کہیں کہیں لکھنوی

اثرات ملتے ہیں۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"جلال کی طرح تسلیم کا بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ وہ بھی اگرچہ لکھنؤ ہی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن انہوں نے اپنی غزلوں میں دہلوی رنگ پیدا کیا ہے۔ ان کے یہاں بھی جلال کی طرح داخلیت ہے۔ گداز ہے، بانکپن ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ لکھنوی رنگ ان کے یہاں سرے سے موجود ہی نہیں۔ لکھنوی رنگ کے اثرات کہیں کہیں ان کی غزلوں میں بھی ملتے ہیں لیکن وہ ابتذال ان کے یہاں نہیں پیدا ہوتا جو لکھنوی غزل میں سب سے زیادہ نمایاں ہے" [1]

اردو غزل گوئی کا تاریخی طور پر جائزہ لینے کے بعد اب آیئے دیکھیں کہ علامہ نیموی کا رنگ تغزل کیا ہے انہوں نے مذکورہ شعراء میں کس شاعر کی تقلید کی ہے اور غزل گوئی میں ان کا مقام کیا ہے۔

علامہ شوق نیموی کی غزل گوئی

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا۔ علامہ شوق نیموی نے لکھنؤ میں کافی عرصہ تک وقت گذارا تھا۔ دینی علوم کی تحصیل کے ساتھ ساتھ ادبی کتابیں مطالعہ کرتے اور وہاں کی شعری و ادبی محفلوں میں برابر شریک ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ وہاں کی غزل گوئی، زبان و بیان، لب و لہجہ، رنگ و آہنگ اور جذبات و خیالات ہر چیز سے بخوبی واقف ہو گئے۔ اس کے علاوہ شمشاد لکھنوی کی شاگردی اختیار کر چکے

[1] غزل اور مطالعہ غزل: ص ۲۷۱

تھے جو خود لکھنوی رنگ کے مستند استاد تھے اس لیے ان کی شاعری پر لکھنوی رنگِ تغزل کا اثر پڑنا ایک فطری امر تھا۔ حضرت شمشاد لکھنوی کی غزل گوئی اور ان کے اسلوب بیان سے وہ کس قدر متاثر تھے اس کی وضاحت ان کے اس شعر سے ہو جاتی ہے ؎

شمشاد نے دی ہے ارجمندی مجھ کو
گلزار سخن میں سربلندی مجھ کو

ظاہر ہے کہ اس شعر میں نہ صرف شمشاد لکھنوی کی شاگردی اور ان کی پیروی کا اظہار ہے بلکہ در پردہ لکھنوی رنگِ تغزل کی اثر پذیری کا بھی بیان ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ علامہ شوق نیموی صرف لکھنوی شعرا کے پیروکار نہیں تھے بلکہ دہلوی شعرا کے اسلوب بیان، حقیقت نگاری، سوز و گداز اور ان کے پاکیزہ خیالات سے بھی نہایت متاثر تھے۔ اس کی ایک وجہ تو ان کا وسیع مطالعہ اور دہلوی شعرا کی صحبت تھی۔ دوسری بڑی وجہ حضرت تسلیم لکھنوی کی شاگردی تھی۔ حضرت تسلیم گرچہ لکھنوی تھے لیکن نسیم دہلوی کے شاگرد تھے۔ جو دہلوی رنگ تغزل کے بڑے شاعر اور مومن اسکول کے پیروکار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تسلیم لکھنوی کے یہاں دہلی اور لکھنو دونوں اسکول کا رنگ تغزل پایا جاتا ہے۔ بلکہ دہلوی رنگ تغزل زیادہ نمایاں اور غالب ہے۔

علامہ نیموی حضرت تسلیم کی غزل گوئی سے کس درجہ متاثر تھے اس کا اظہار ان کے مندرجہ ذیل شعر سے ہو جاتا ہے ؎

تسلیم کے فیض سے جھکا ہے سر عجز
بھاتی نہیں کچھ بھی خود پسندی مجھ کو

اس شعر میں تسلیم کی شاگردی کے ساتھ ساتھ در پردہ دہلوی رنگ تغزل کی اثر پذیری کا بھی اظہار ہے۔ اس کے علاوہ علامہ شوق نیموی نے اپنے رسالہ اصلاح میں مبتذل مضامین کے تحت ایک جگہ غزل کی ایسی تعریف کی ہے جس میں دہلوی رنگ تغزل کی ستائش کا پہلو نظر آتا ہے۔ دیکھئے فرماتے ہیں:۔

"غزل میں عشقیہ مضامین، درد آمیز معانی، پاکیزہ خیالات، سلجھی ہوئی ترکیبیں، نکھری ہوئی بندشیں، دل کش الفاظ چلبلے جملے، مربوط مصرعے پھڑکتے ہوئے شعر ہونا چاہئے۔ چوں کہ سابق زمانے سے اکثر دلی والوں نے بیشتر ان امور کا خیال رکھا ہے۔ اس وجہ سے اس کو دلی کا رنگ کہتے ہیں۔ میر و درد کا کلیات، نسیم دہلوی کا دیوان، داغ کا کلام دیکھو کہ کس قدر مقناطیسی اثر رکھتا ہے۔ لکھنؤ کے اگلے شعرا میں سے صہبا کی شیریں زبانی اور سحر کی سحر بیانی دلی والوں سے ملتی جلتی ہوتی ہے اور اب تو اکثر لکھنؤ والوں نے اپنی طرز چھوڑ کر دہی رنگ اختیار کیا ہے۔

فی زماننا ایسے دو چار نامی شاعر موجود ہیں جن سے لکھنؤ کو فخر ہے"[1]

بہر حال کہنا یہ ہے کہ علامہ نیموی کے یہاں دہلوی اور لکھنوی دونوں رنگ تغزل پایا جاتا ہے۔ اور یہی ان کا کمال فن ہے۔ انہوں نے جس چابک دستی اور مہارت کے ساتھ ان دونوں رنگ سے اپنے کلام کو ہم آہنگ کیا ہے اس سے ان کی غزل گوئی کی قدر و قیمت کافی حد تک بڑھ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ایک طرف ان کے یہاں صداقت، حقیقت بیانی، رنگینی، تاثیر، آمد اور سوز و گداز ملتا ہے۔ جو دہلوی شعرا کا رنگ ہے، تو دوسری طرف حسن کی رنگینی، دل کش ادائیں اور شوخیاں

[1] اصلاح: ۶

بھی ملتی ہیں جو شعرائے لکھنوی کا خاص رنگ ہے۔ شعرائے دہلی کی طرح ان کے ہاں دو غزلہ اور سہ غزلہ کی روایت بھی نہیں ملتی، جو عام طور پر شعرائے لکھنؤ کے یہاں پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں وہ ابتذال نہیں پایا جاتا جو شعرائے لکھنؤ کے یہاں عام طور پر ملتا ہے۔

غزل گوئی کے میدان میں علامہ شوق نیموی گرچہ مومنؔ، میر، غالبؔ، داغؔ اور ذوقؔ کے ہم پلہ نہیں تھے اور نہ کسی طرح ان لوگوں کی صف میں انہیں کھڑا کیا جاسکتا ہے۔ تاہم ان کے کلام میں غزل گوئی کی جو خوبیاں نظر آتی ہیں اس کی بنا پر انہیں اردو ادب کے ممتاز غزل گو شعراء میں ضرور شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے نامور اور صاحب دیوان شاگردوں کی جو فہرست پیش کی گئی ہے اس کی بنا پر وہ اردو کے مستند اساتذہ شعراء میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔

جیسا کہ ادبی تصنیفات کے ذیل میں اوپر بیان کیا گیا، علامہ نیموی کا ایک شعری مجموعہ دیوان شوق کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اس میں کل ۹۴ غزلیں ہیں جو حروف تہجی کے اعتبار سے ردیف وار مرتب ہیں۔ اب ہم ان کے دیوان سے چند نمونہ کلام پیش کرتے ہیں تاکہ قارئین اس سے لطف اندوز ہو سکیں اور ان کے شعری مقام کو بخوبی سمجھ سکیں۔

وجود باری اور عشق الٰہی کا مضمون تقریباً ہر شاعر نے باندھا ہے کیونکہ ذات باری ہی تمام خوبیوں، اچھائیوں اور حسن و خوبصورتی کا سرچشمہ ہے۔ خدا کی ذات کہاں ہے، کس کس رنگ میں ہے؟ اس کا پرتو کس کس چیز پر ہے؟ اس کی ذات کتنی خوبصورت اور دل فریب ہے؟ یہ ایسے مضامین عالیہ ہیں جن پر نہ صرف فلسفیوں نے موشگافیاں کی ہیں بلکہ شعراء نے بھی اپنے اپنے اشعار میں یہ

مضامین مختلف پیرایہ میں پیش کیے ہیں اور اپنا اپنا شعری وفنی کمال دکھایا ہے۔ علامہ بیموی نے بھی ان موضوعات پر نہایت اچھے اور خوبصورت اشعار کہے ہیں چنانچہ وجود باری کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

جس گھر میں جا کے دیکھا پایا ظہور تیرا
دل میں ہے یاد تیری آنکھوں میں نور تیرا

پھولوں میں بو ہے تیری تاروں میں نور تیرا
جلوہ ترا عیاں ہے پست و بلند سب میں

کون و مکاں میں پائے جلوہ ضرور تیرا
جو کوئی چشم دل سے پردہ اٹھا کے دیکھے

خدا کی ذات ایک ہے اور کائنات کی ہر چیز اس کی مخلوق ہے جس میں اس کے وجود اور حسن و خوبصورتی کا بھرپور نور نظر آتا ہے۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی ذات اور کائنات دو الگ الگ چیزیں ہیں یا ایک ہی ہیں، یہیں سے فلسفیانہ اور صوفیانہ موشگافیاں شروع ہو جاتی ہیں اور فلاسفر، صوفیا اور شعرا مختلف گروپ میں بٹ جاتے ہیں، چنانچہ محی الدین بن عربی نے وحدۃ الوجود کا نظریہ پیش کیا اور کہا کہ کائنات خدا کی ذات سے کوئی الگ چیز نہیں بلکہ اسی کل کا یہ جز ہے۔

اس کے برخلاف حضرت مجدد الف ثانی نے وحدۃ الشہود کا فلسفہ پیش کیا اور فرمایا کہ دنیا کی تمام چیزیں اس کا پرتو ہیں، اور ہر چیز میں اسی کی جھلک موجود ہے یہی دو نظریات زیادہ مقبول ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شعرا عام طور پر انہیں دو نظریات کے پیرو کار نظر آتے ہیں، چنانچہ غالب اور اقبال کے ہاں انہیں دونوں نظریات کی نمایاں جھلکیاں ملتی ہیں۔ غالب وحدۃ الوجود کی تائید میں فرماتے ہیں ؎

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

اب آئیے علامہ نیموی کا نظریہ دیکھئے ان کے یہاں وجود و شہود حقیقت میں دونوں ایک ہیں اگرچہ اصطلاح کے اعتبار سے الگ الگ ہیں کیوں کہ سمندر کا ایک قطرہ ہو یا ایک معمولی گھاس ان میں سے کسی کی کوئی الگ حیثیت نہیں ہوتی بلکہ دونوں اسی میں ضم ہو جاتے ہیں اسی طرح کائنات کا خدا سے کوئی الگ وجود نہیں۔ چاہے آپ اس کا نام وحدۃ الوجود رکھیں یا وحدۃ الشہود۔ علامہ نیموی فرماتے ہیں:-

ہوگیا گم جو کوئی دریائے وحدت میں پڑا بحرِ بے پایاں میں ملتا ہے پتہ کب کاہ کا
ایک ہی ہیں باب وحدت میں وجود و شہود ہے یہی مسلک جناب شیخ حق آگاہ کا

انسان سے جہاں اچھے افعال سرزد ہوتے ہیں وہیں برے افعال بھی سرزد ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک طرف اچھے کام پر خوش ہوتا ہے تو دوسری طرف برے کام پر نادم اور شرمندہ ہوتا ہے اور خدا سے مغفرت چاہتا ہے اپنی غلطی پر ندامت اور شرمندی کی طلب کا رجحان شعرائے اردو کے یہاں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ نیموی بھی اپنی غلطیوں پر نادم نظر آتے ہیں اور خدا سے مغفرت چاہتے ہیں۔ لیکن مغفرت طلبی کا کتنا بھلا اور پیارا انداز ہے؟ اشعار سنئے اور سر دھنئے ؎

کان میں جب تک نہ آئے گی صدائے مغفرت
سر نہ اٹھے گا لحد سے بندۂ درگاہ کا

یہ سر ترے قدم پر یونہی پڑا رہے گا
جب تک نہ تو کہے گا بخشا قصور تیرا

معشوق کے وصال و فراق کا بیان اکثر شاعروں کے یہاں ملتا ہے۔ کسی شاعر کو وصال زیادہ عزیز ہوتا ہے اس لئے وہ ہر حال میں معشوقہ کا وصال چاہتا ہے اور اس پر کیف واقعہ کو نہایت والہانہ اور دلچسپ انداز میں بیان کرتا ہے۔ کسی شاعر کے یہاں معشوقہ کا فراق ہی زندگی کا اصل سرمایہ ہوتا ہے اس لئے وہ فراق کا مضمون نہایت خوبصورت انداز میں پیش کرتا ہے ولیؔ، سوداؔ، میرؔ، مومنؔ، ذوقؔ، نسیمؔ، انیسؔ، داغؔ، غالبؔ، تسلیمؔ کون شاعر ہے جس کے یہاں یہ مضامین پیش نہ کئے گئے ہوں، علامہ شوقؔ نیموی نے بھی معشوقہ کے وصال و فراق کا مضمون باندھا ہے، اور خوب باندھا ہے دیکھئے معشوقہ کے فراق کا بیان کس درد و کیف مگر کس خوبصورتی کے ساتھ کرتے ہیں ؎

بے ترے او رشکِ گل دیکھا عجب رنگ چمن
شاخیں تلواریں تھیں ہر پتہ کف جلاد تھا

دھیان آیا تھا جو زلف پر شکن کا وقت شام
صبح تک برہم مزاج خاطر ناشاد تھا

ہجر کی تھی کچھ ایسی رات
میں نے مر مر کے کاٹی ساری رات

پوچھتے ہیں وہ کس تجاہل سے
آج کیوں کر کٹی تمہاری رات

ہیں یہ نیرنگیاں زمانے کی
اک رات ان کی اک ہماری رات

رخ و زلفِ سیہ کے عاشق کو
دن بھی پیارا ہے اور پیاری رات

شب بھر الجھن سی رہا کرتی ہے دن بھر وحشت زلف و رخ یار جو ہم شام و سحر کرتے ہیں
سر جھکائے ہوئے بیٹھے ہیں جو محفل میں آج دیکھئے وہ نظر لطف کدھر کرتے ہیں
آئینہ دیکھ کے وہ ناز سے بولے ہنس کر دل عشاق میں کبھی ہم یونہی گھر کرتے ہیں
ہے وہی دل کی لگی اور وہی سوزش داغ لاکھ رو رو کے مدد دیدۂ تر کرتے ہیں

معشوقہ کے فراق میں درد و کرب کے باوجود شاعر کو یہی درد و کرب زیادہ عزیز ہے کیوں کہ اس درد و کرب میں جو لذت حاصل ہے وہ وصال میں نہیں، دیکھئے شاعر کہتا ہے ؎

کر دیا ویران تم نے خانۂ دل چھوڑ کر
جن دنوں رہتے تھے تم کیسا یہ گھر آباد تھا

شاعر معشوقہ سے دور ہے اور معشوقہ کے فراق میں نہایت پریشانی اور بے چینی کی زندگی بسر کر رہا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس کے لئے روادار نہیں کہ اس کی محبت کا راز فاش ہو۔ جب پیمانۂ صبر لبریز ہو کر چھلک گیا اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل گئے تو شاعر اپنی آنکھوں سے شکایت کرتا ہے کہ انھوں نے آنسو بہا کر افشائے راز کیوں کیا۔ وہ تو ہر حال میں ضبط غم سے کام لینا چاہتا تھا تاکہ معشوقہ رسوا و بدنام نہ ہو۔

دیکھئے اس کیفیت کو شاعر کس طرح بیان کرتا ہے ؎

ڈبوئی آبروئے راز الفت میرے اشکوں نے
او بلنے کے لئے کس نے کہا ان پردہ داروں کو
یہی ڈر ہے نہ کوئی بات غیروں میں نکل جائے
الٰہی دے لب تصویر میرے رازداروں کو

شاعر نہایت ہی صابر و شاکر ہے، معشوقہ کی طرف سے جس قسم کی بھی بدسلوکی، بے وفائی اور بے التفاتی ہوتی ہے وہ ہر حال میں صبر و شکر سے کام لینا چاہتا ہے اور معشوقہ کے دل میں یہ اثر قائم کرنا چاہتا ہے کہ وہ اس کی ہر ہر ادا اور ہر ہر نقل و حرکت پر راضی اور خوش ہے، اور اپنی جان تک قربان کرنے کے لئے تیار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کوئی آسان کام نہیں بلکہ نہایت کٹھن منزل ہے لیکن شاعر اس امتحان میں بھی پورا اترنا چاہتا ہے۔ دیکھئے شاعر کہتا ہے ؎

جفا ہو یا وفا ہم تیرے پابند رضا ٹھہرے
جو تڑپایا تو تڑپے ہاتھ دل پر رکھ دیا ٹھہرے

جگر بھی حاضر ہے دل بھی حاضر ادھر بھی حسرت ادھر بھی ارماں
بتا دے جلد اے نگاہ قاتل کہاں رہے گی کہاں رہے گی
خدا نے چاہا تو دیکھ لینا ہمیشہ ضبط فغاں کریں گے
جو اپنے قابو میں دل رہے گا جو دل میں تاب و تواں رہے گی

نیم جان رکھتی ہے کیوں اپنی ادا سے پوچھو
ہم تو تیار ہیں مرنے کو قضا سے پوچھو

معشوقہ کی انگڑائی ایک عاشق کے لئے نہایت جان لیوا ہوتی ہے۔ اکثر شعرا نے اس مضمون کو اپنے یہاں پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں علامہ نیموی کے بھی چند خوبصورت اشعار ملاحظہ کیجئے ؎ ناز سے ہاتھ جو اٹھے ادھر انگڑائی میں
پڑ گیا طوق ادھر گردن سودائی میں

فتنہ حشر بھی لیتا ہے بلائیں اٹھ کر
کس قیامت کی ادا ہے تری انگڑائی میں

شاعر اپنی معشوقہ کے ساتھ کبھی کسی چمن میں زندگی گذار چکا ہے اور پر لطف صحبت اٹھا چکا ہے لیکن پھر حالات بگڑ گئے۔ نہ وہ صحبت رہی اور نہ وہ چمن کی شادابی ایک عرصہ کے بعد دوبارہ شاعر اس خزاں رسیدہ چمن سے گذرتا ہے لیکن پچھلی صحبتیں اور چمن کی شادابی یاد آتی ہے تو شاعر بے قابو ہو جاتا ہے اور کہتا ہے ؎

خزاں نے باغ کو لوٹا نہ وہ گل ہیں نہ وہ غنچے
قفس میں رو رہی ہیں بلبلیں اگلی بہاروں کو

چمن کو دیکھ کر ہم روئے خوب اگلی بہاروں کو
جگر کے داغ یاد آئے جو دیکھا لالہ زاروں کو

زمانے نے دگرگوں کر دیا یاروں کی مجلس کو
پریشاں آج اپنے حال میں ہے دیکھئے جس کو

عشق دراصل وہی ہے جو سچا ہو۔ اگر عشق صحیح اور سچا ہے تو وصال اور فراق ہر حال میں ایک خاص لطف اور لذت محسوس ہوتی ہے۔ معشوقہ کی طرف سے بدعہدی، ظلم، اور بے التفاتی ہو تو اس میں بھی مزا آتا ہے۔ دیکھئے شاعر اسی چیز کو کس طرح بیان کرتا ہے ؎

عشق صادق ہو تو فریاد بھی دیتی ہے مزا   درد دل میں ہو تو نالے بھی اثر کرتے ہیں

غرض کہ علامہ نیموی کی غزلوں میں جدت بیان، نازک خیالی، رنگینی، صفائی زبان کی سادگی اور شگفتگی کی جس قدر خوبیاں پائی جاتی ہیں اس کی وجہ سے اردو ادب کی تاریخ میں انہیں ایک اہم جگہ حاصل ہے۔

علامہ نیموی نے بھی اپنی ان خوبیوں اور شعری مقام کی طرف جا بجا اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

کلام شوق وہ سن کر پھڑک کے بول اٹھے
زباں ہے بہت اچھی بیاں بہت اچھا

وہی اشعار جن میں لطف کچھ رہتا ہے رکھتے ہیں
غزل میں شوق ہم بھرتے نہیں ہر رطب و یابس کو

شوق ہر دل میں ہے جگہ جس کی   ہے تخلص ظہیر احسن کا

چمکی ہوئی ہے شوق یہ بزم مشاعرہ   ہر شعر چاند مطلع روشن ہے آفتاب

کسی شاعر کا اپنے دیوان سے خود منتخب کردہ اشعار نہایت قیمتی اور اہمیت کے حامل ہوتے ہیں کیوں کہ اپنے کلام کا صحیح معنی و مفہوم اور قدر و قیمت جس قدر خود وہ شاعر سمجھتا ہے کوئی دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔

خوشی کی بات ہے کہ علامہ شوق نیموی نے اپنی غزلوں کے کچھ اشعار خود ہی منتخب کر کے یادگار وطن میں تحریر کر دیتے ہیں۔ وہ قارئین کی دل چسپی کے لئے یہاں نقل کئے جاتے ہیں تاکہ ان کا شعری و ادبی مقام بخوبی واضح ہو سکے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے جیسا کہ علامہ نیموی نے لکھا ہے کہ انہوں نے

اپنا دیوان چار بار مرتب کیا اور ہر مرتبہ بیسیوں غزلیں اور سیکڑوں اشعار خارج کر دیئے اس کے بعد مختصر سا دیوان رہ گیا تھا تاہم وہ بھی انہیں کوئی زیادہ پسند نہیں تھا، اس لیے انہوں نے   اخیر دیوان سے کچھ خوبصورت اشعار منتخب کر کے تحریر کر دیئے ہیں ——— اور اس لحاظ سے ان اشعار کی قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ وہ اشعار یہ ہیں: ؎

کسی طرح خم گیسو سے دل نکل نہ سکا
ہزار پیچ کیے کوئی پیچ چل نہ سکا

جو چلمن اوس نے اوٹھائی تو میں سنبھل نہ سکا
گرا تو اوٹھ نہ سکا اور اٹھا تو چل نہ سکا

کسی کو دیکھتے ہی بے نقاب محشر میں
ہزار دل کو سنبھالا مگر سنبھل نہ سکا

اودھر رخ سے گھونگھٹ اٹھانا کسی کا
ادھر کھا کے غش تلملانا کسی کا

سر بزم تم اور یہ نیچی نگاہیں
ابھی کھل گیا دل چرانا کسی کا

چمن میں جو گلچیں نے کچھ پھول توڑے
تو یاد آگیا دل دکھانا کسی کا

رقیبوں سے رہا کرتے ہیں جس بت کے لیے جھگڑے
خدا جانے قیامت میں ادھر وہ ہوگا یا اودھر

بن کے پیمانۂ مے تا لب دلبر آیا
بوسہ لینے کو میں کیا بھیس بدل کر آیا

ہائے اے حسرت دیدار میں سمجھا کچھ اور
ملک الموت دم نزع جو سر پر آیا

ہم ڈھنگ بتاتے ہیں تمہیں ناز و ادا کا
بدلے میں وفا کے رہے کچھ لطف جفا کا

سمجھے کہ نہیں سن کے جسے تم ہوئے بے چین
تھا ساز کسی ٹوٹے ہوئے دل کی صدا کا

چھوٹا کہیں دل اور کہیں گر پڑے آنسو
غربت میں چھٹا ہم سے تعلق رفقا کا

خانۂ دل کی خبر بھی کچھ تمہیں ہے یا نہیں — جس میں تم رہتے تھے اب وہ یاس کا گھر ہو گیا
دعوئے الفت تو رکھتے تھے مگر ہے کچھ خبر — ہجر میں کیا حال شوق اے بندہ پرور ہو گیا

آپ کے زہد کو جب مانتے اے حضرت شیخ
آپ کا دل بھی کسی شوخ پہ آیا ہوتا۔

خدا کی شان ہے مجکو وہی اب ذبح کرتے ہیں
ہلا دیتا تھا دل جن کا تڑپنا مرغ بسمل کا

دل شوق حسینوں سے لگانا نہیں اچھا — ہو جاؤ گے بدنام زمانہ نہیں اچھا
رہتے ہو جو دل میں تو جگر کو نہ جلاؤ — ہمسائے کے گھر آگ لگانا نہیں اچھا
دل کوئی چرائے تو نہیں اس کی شکایت — آنکھیں مگر اے جان چرانا نہیں اچھا
دامن کبھی جھٹکتے ہیں کبھی ملتے ہیں وہ ہاتھ — اے شوق ابھی ہوش میں آنا نہیں اچھا

دل بھی مجھے ملا تو بڑا بے وفا ملا — کمبخت یہ بھی اوس بت ظالم سے جا ملا
بے چین ہم ادھر ہیں ادھر بیقرار وہ — عاشق مزاج شوق ہمیں دل ربا ملا

میری آنکھوں میں ہیں وہ گھر کی طرح — سب سے پوشیدہ ہیں نظر کی طرح
دل دے آیا ہے کیا یہ خط کے عوض — اب ہے کچھ اور نامہ بر کی طرح
دیکھ کر خلد جی بھر آیا شوق — یاد آئی کسی کے گھر کی طرح

کیا خوشی مرگ عدو کی جب کسی کا ہے یہ حال — چوڑیاں توڑیں بڑھایا سوگ میں دشمن کے طوق
عید میں بھی شوق وہ مجھ سے گلے ملتا نہیں — جی میں ہے اب حوصلہ دل کا نکالوں بن کے طوق

بتوں کا دم بھرا کرتا ہے دن رات ‏ نہ دے کافر کو بھی ایسا خدا دل
یہ ڈالا تفرقہ الفت نے، اے شوق ‏ جدا میں دل سے ہوں مجھ سے جدا دل

حد سے جب عشق تصور بڑھ گئی ‏ ہر دم اپنے پاس انہیں پاتے ہیں ہم
ہائے یہ کہنا کسی کا صبح وصل ‏ شوق اب دل تھام لو جاتے ہیں ہم

آہ کرتا دل حزیں نہ کہیں ‏ قہر ڈھا دے گی یہ کہیں نہ کہیں
کوئی پہلو میں آہ کرتا ہے ‏ ہو ہمارا دل حزیں نہ کہیں
شوخیاں تم جو کرتے ہو دم قتل ‏ خون میں تر ہو آستیں نہ کہیں
کوئی لوٹا گیا حسینوں میں ‏ شوق کا دل ہو حزیں نہ کہیں

بار اٹھانے کا تحمل مجھے اے حور نہیں ‏ ناز بے جا نہ کرو میں کوئی مزدور نہیں
محتسب سنگ ستم سے اسے دھوکے میں نہ توڑ ‏ دل پر خون ہے یہ جام مئے انگور نہیں
چشم بد دور مری آنکھوں کے تارے تم ہو ‏ سات پردوں میں رہو چھپ کے تو کچھ دور نہیں

اثر سے تیرے باز آئے ہم اے آہ ‏ وہ پہروں سے دباتے ہیں جگر کو
کہاں کی آگ کیسے ہفت دوزخ ‏ خدا رکھے سلامت چشم تر کو

شب فرقت جو ہم آہ بھول کر کرتے ‏ کلیجا تھام کے اف اف وہ رات بھر کرتے
یہ درد عشق ہے کیا فکر چارہ گر کرتے ‏ ترقی اور بھی ہوتی علاج اگر کرتے

حضور سے ہمیں کہنا ہے کچھ اشاروں میں
خدا کے واسطے آپ اک نظر ادھر کرتے

ہوئے جو نام کے ہم شوق بھی تو کیا حاصل
مزا تو جب تھا حسینوں کے دل میں گھر کرتے

یہ کاہش کہ ہم اپنے کو آپ پا نہ سکے
یہ زور ضعف کہ ناز بتاں اٹھا نہ سکے

دہان زخم سیا، اس سبب سے قاتل نے
کہ روز حشر مرا نام یہ بتا نہ سکے

ہوں دل سے نثار یار جانی
اتنی ہے فقط مری کہانی

جوں جوں بڑھتی گئی محبت
بڑھتی گئی اور بدگمانی

دامن یار سے جا لپٹے ہمارے آنسو
گر کے اس طرح سنبھلتے ہیں سنبھلنے والے

اس ادا نے دم مرگ اور ہمیں قتل کیا
کون تھے تم کف افسوس کے ملنے والے

آنسو اوس کے آنکھوں میں پھر خشک ہو گئے
اس مد و جزر نے مری کشتی تباہ کی

افتادگان خاک کو ٹھکراتے ہو عبث
شوخی بھی اک ادا ہے مگر راہ راہ کی

فکر ابھی سے ہے جو گھر جانے کی
کیا ضرورت تھی ابھی آنے کی

دل شکستہ ہے یوں پہلو میں
جیسے مسجد کسی ویرانے کی

آنکھوں میں آ بسے کوئی یا دل میں گھر کرے
لازم ہے پاس صاحب خانہ مگر کرے

ہم سے تو لاکھ درجے ہے اچھی ہماری آہ
ترسیں ہم اک نگاہ کو یہ دل میں گھر کرے

کیوں بار بار چھیڑتے ہو ذکر حور کا
بندہ یہ وہ نہیں جو کسی پر نظر کرے

تار نظر میں آج ہم الجھائیں گے ضرور
ہم کھل کے کہتے ہیں کوئی فکر کمر کرے

اوس سے حضور رکھتے ہیں ہم بدگمانیاں
جو کوئی دل کو چھوڑ کے آنکھوں میں گھر کرے

نہ ٹھہرے میرے دلیں غیر کی منزل میں جا ٹھہرے
تمہیں انصاف سے سوچو نہ کیونکر بیوفا ٹھہرے

نگاہ شوق سمجھانے سے محفل میں رکے کیونکر
جسے عادت ہو چلنے پھرنے کی وہ گھر میں کیا ٹھہرے

یہی دو گھر تو کل نکلے دیار حسن والفت میں
میں اون کے دل میں جا ٹھہرا وہ میرے دلمیں آ ٹھہرے

شکایتیں کیجئے کس کی بتائیں نام ہم کس کا
کریں فریاد کس کی جب وہی پر فیصلہ ٹھہرے

چلا ہے مجکو تنہا چھوڑ کر دل کوئے جاناں کو
مزا جب ہے وہاں بھی جل کے ظالم بے وفا ٹھہرے

مرا دل گلشن جنت میں گھبراتا ہے اے رضواں
یہ کچھ کوچہ نہیں اون کا یہاں میری بلا ٹھہرے

نظر کی کیا حقیقت شوق دل تک مل گیا اون سے
مگر یہ خوبی قسمت کہ پھر ہم وہ جدا ٹھہرے[1]

اب میں مزید تین غزلیں پیش کرتا ہوں جنہیں علامہ شوق نیموی اپنے رسالہ اصلاح میں اپنا مخصوص رنگ تغزل دکھانے کی غرض سے خاص طور پر تحریر کی ہیں ہے۔ ملاحظہ ہوں۔

(۱)

نالے بیتاب ہیں سینے سے نکلنے کیلئے
اوس ستم گر سے کوئی کہدے سنبھلنے کے لئے

چشم عاشق کہ ہوں آنسو کہ کسی کا جوبن
بڑھ چلیں لاکھ مگر دونوں ہیں ڈھلنے کے لئے

خانہ دل میں رہو تم جو یہاں جی گھبرائے
چلے آنا مری آنکھوں میں ٹہلنے کے لئے

[1] یادگار وطن: ۱۱۶

شوخیاں اون کی سر بزم حیا سے بولیں
تجھ کو محفل سے ہوا حکم نکلنے کے لئے

درد تعظیم کو پہلو سے نہ کیوں کر اوٹھے
دل میں آتا ہے کلیجہ کوئی ملنے کے لئے

کبھی میرا کبھی اون کا جو ہے شکوہ دل کو
ڈھونڈتا ہے کوئی پہلو یہ مچلنے کے لئے

اے مرے جذبۂ دل وقت مدد آپہنچا
گھر سے وہ آج نکلتے ہیں ٹہلنے کے لئے

اون کی تصویر جو چومی تو وہ جل کر بولے
اب یہ معشوق نکالا ہے بہلنے کے لئے

لاکھ رسوا ہو مگر چاہ بری ہوتی ہے
دل کو پھر ضد ہے اوسی کوچے میں چلنے کیلئے

محفل غیر میں کیوں شمع جلائی تم نے
کیا وہاں کوئی نہ تھا رشک سے جلنے کے لئے

نامناسب ہے یہاں غیر کا رہنا شب وصل
تم اشارہ کرو اب شرم کو ٹلنے کے لئے

مر گئے ہم تو کفن دیکھ کے بولا وہ شوخ
جان دی اس نے بھیس بدلنے کے لئے

حسرتیں بھر گئیں اے شوق یہاں تک دل میں
آرزو ڈھونڈتی ہے راہ نکلنے کے لئے

(۲)

ادھر رخ سے گھونگھٹ اوٹھانا کسی کا
ادھر کھا کے غش تلملانا کسی کا

شب وصل وہ روٹھ جانا کسی کا
مزا دے گیا پھر منانا کسی کا

گراتا ہے دل پر قیامت کی بجلی
وہ منہ پھیر کر مسکرانا کسی کا

نہ کر آہ کا قصد گھبرا کے اے دل
کچھ اچھا نہیں دل دکھانا کسی کا

وہ بھولی سی صورت لڑکپن کی باتیں
ہمیں یاد ہے وہ زمانا کسی کا

کہاں تک یہ زلف آپ سلجھایئے گا
ذرا دیکھئے پیچ کھانا کسی کا

مرے آگے کیا گل کھلائیں گے غنچے
مجھے یاد ہے مسکرانا کسی کا

چمن میں جو گلچیں نے کچھ پھول توڑے
تو یاد آگیا دل دکھانا کسی کا

سر بزم تم اور نیچی نگاہیں
اجی کھل گیا دل چرانا کسی کا

مرے خانۂ دل میں خلوت گزیں ہے — کسی کو ملے کیا ٹھکانا کسی کا
تمہیں عشق سے شوق سب روکتے تھے — مگر تم نے کہنا نہ مانا کسی کا

(۳)

دل شوق حسینوں سے لگانا نہیں اچھا — ہو جاؤ گے بدنام زمانہ نہیں اچھا
ہم صاف کہے دیتے ہیں مانو کہ نہ مانو — دل عاشق بیکس کا دکھانا نہیں اچھا
رہتے ہو جو دل میں تو جگر کو نہ جلاؤ — ہمسائے کے گھر آگ لگانا نہیں اچھا
منہ سے نہ کہیں آہ جہاں سوز نکل جائے — جلتا ہو جو آپ اوس کو جلانا نہیں اچھا
دل کوئی چرا لے تو نہیں اس کی شکایت — آنکھیں مگر اے جان چرانا نہیں اچھا
کھل جائیں گے راز آپ کے اس شرم و حیا سے — منہ مجھ سے سر بزم چھپانا نہیں اچھا
دیکھو نہ کہیں دل کی لگی اور بھڑک جائے — بالین لحد شمع جلانا نہیں اچھا
ہم خوب سمجھتے ہیں جہاں جاتے ہو جاؤ — ہر روز مگر راہ بتانا نہیں اچھا
پڑ جاؤ گے جھگڑے میں کہے دیتے ہیں اُلجھا نہ — ہر ایک کی آنکھوں میں سمانا نہیں اچھا
نازک ہیں، عجب کیا کہ وہ دل تھام کے رہ جائیں — حال شب غم اون کو سنانا نہیں اچھا
دامن کبھی جھٹکتے ہیں کبھی ملتے ہیں وہ ہاتھ
اے شوق ابھی ہوش میں آنا نہیں اچھا



مثنوی نگاری

مثنوی دیگر اصناف سخن میں سب سے زیادہ مفید، کار آمد اور وسیع صنف سخن ہے۔ کیوں کہ اس میں جذبات انسانی، مناظر قدرت، واقعہ نگاری اور تخئیل یہ تمام چیزیں بہ خوبی ادا کی جاسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ مضامین کی بھی کوئی حد بندی نہیں ہے۔ اس لئے رزمیہ، عشقیہ، صوفیانہ اور فلسفیانہ ہر طرح کے مضامین اچھی طرح پیش کئے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ علامہ شبلی نعمانی مثنوی کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"یہ صنف تمام انواع شاعری کی بہ نسبت زیادہ مفید، زیادہ وسیع زیادہ ہمہ گیر ہے۔ شاعری کے جس قدر انواع ہیں سب اسی میں نہایت خوبی کے ساتھ ادا ہوسکتے ہیں۔ جذبات انسانی، مناظر قدرت، واقعہ نگاری، تخئیل ان تمام چیزوں کے لئے مثنوی سے زیادہ کوئی میدان ہاتھ نہیں آسکتا۔" [1]

تاریخ ادب اردو بتاتی ہے کہ مثنوی کی ابتدا دکن میں نویں صدی ہجری میں ہوئی جس کو وہاں کے بزرگوں نے رشد و ہدایت اور دعوت و تبلیغ کے لئے ایک ذریعہ کے طور پر استعمال کیا۔ کیوں کہ نثر سے زیادہ نظم میں دل کشی ہوتی ہے۔ اس لئے بزرگوں نے اس صنف کو اپنے دعوتی کام کے لئے منتخب کیا۔ اس دور کے مثنوی نگاروں میں شاہ میراں جی، فیروز بیدری، حاتم اور شمس العشاق کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان مثنویوں میں کوئی ادبی چاشنی نہیں اس لئے اس لحاظ سے ان کا کوئی مقام نہیں۔ قلی قطب شاہ کے زمانہ میں مثنوی ادبی لحاظ سے ایک

[1] شعر العجم ج۔۴ ص: ۱۹۵

ممتاز صنف بن گئی۔ چنانچہ اس دور میں ملا وجہی نے قطب مشتری نامی مثنوی لکھی جو عشقیہ مثنوی ہے۔ اور اس کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔

نظامی بیدری نے پدم راؤ کے نام سے ایک طویل مثنوی لکھی جو عشقیہ موضوع پر اردو کی پہلی طویل مثنوی تسلیم کی جاتی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر محی الدین زور فرماتے ہیں:۔

"موجودہ معلومات کے لحاظ سے (نظامی بیدری) اردو کا پہلا شاعر ہے جس نے حسن و عاشقی موضوع پر ایک طویل مثنوی "پدم راو" لکھی ورنہ اس کے قبل کی جو اردو نظم و نثر ملتی ہے وہ بالعموم مذہبی اور صوفیانہ موضوع سے متعلق ہے" [1]

قدیم مثنویوں کی ترقی گولکنڈہ اور بیجاپور کی ریاستوں میں کافی ہوئی کیونکہ یہ دونوں معاصر سلطنتیں تھیں اور اپنے اپنے شعراء کی داد و دہش میں مقابلے کا جذبہ رکھتی تھیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شعراء بھی اپنے اپنے ممدوح کو خوش کرنے کے لئے اس صنف میں اپنی مہارت اور قدرت کلام کا مظاہرہ کرنے لگے تھے۔ ابراہیم شاہی اور عادل شاہی عہد حکومت میں رزمیہ مثنویاں بھی لکھی گئیں۔ لیکن طویل مثنویوں میں عام طور پر عشقیہ مضامین ہی بیان کئے گئے ہیں۔

دکن کے بعد جب دہلی اور لکھنؤ کو ادبی و شعری لحاظ سے مرکزیت حاصل ہوئی تو یہاں بھی مثنویاں لکھی گئیں۔ اور شعرا نے اس صنف کو آگے بڑھانے میں اچھی سے اچھی مثنویاں تحریر کیں۔ یہاں کی مثنویوں میں ہیئت کے اعتبار سے تو وہی چیز نظر آتی ہے جو دکن میں مروج تھی۔ لیکن نفس قصہ اور زبان و بیان کے لحاظ سے

[1] دکنی ادب کی تاریخ :- ۱۴

یہ مثنویاں بالکل الگ اور منفرد نظر آتی ہیں۔ یہ مثنویاں صرف تراجم نہیں بلکہ طبع زاد قصے بھی ہیں جن میں تغزل کا رنگ غالب ہے۔ اور ما فوق الفطرت قصوں سے عاری ہیں۔ شمالی ہند کی پہلی مثنوی افضل کی بکٹ کہانی ہے جس کا قصہ عشقیہ اور انداز سادہ، دل کش اور موثر ہے۔

چوں کہ دہلی اور لکھنو کے حالات سیاسی اور سماجی لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف تھے اس لئے دونوں جگہ الگ الگ حالات کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ البتہ نفس قصہ کے اعتبار سے دونوں اسکولوں میں مماثلت نظر آتی ہے۔ دہلوی مثنوی نگار حسن وعشق کی داستان گوئی میں حقیقت پسندی سے کام لیتے ہیں اور غیر فطری قصوں سے احتراز کرتے ہیں۔ چنانچہ میر تقی میر کی مثنویوں کو دیکھ جائیے ان میں ان کی زندگی کی بھرپور جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ غزلوں کی طرح ان کی مثنویوں میں بھی حزن وملال اور درد وغم کے اثرات نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں۔ میر کی تمام مثنویوں میں دریائے عشق اعلیٰ درجہ کی مثنوی ہے۔ جس میں درد اور اثر انگیزی نمایاں ہیں۔

میر کے عہد میں سودا، میر سوز، بسمل فیض آبادی، قائم چاندپوری وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ خاص طور پر قائم چاندپوری اس عہد کے اہم مثنوی نگار ہیں جنکی تقریباً ستائیس مثنویاں ہیں، اور زیادہ تر مختصر ہیں۔ صرف ایک مثنوی "جذب الفت" طویل ہے۔ جو ۱۲۵۹ اشعار پر مشتمل ہے۔

اس عہد کی سب سے مشہور طویل مثنوی میر اثر کی "خواب وخیال" ہے جس کے اشعار کی تعداد تقریباً تین ہزار ہے۔ اس میں کوئی قصہ نہیں بلکہ ہجر ووصال بے چینی، تمنائے وصل اور چھیڑ کا بیان ہے، اس کے علاوہ مرزا شوق، دیا شنکر نسیم اور داغ کی مثنویاں بھی قابل ذکر ہیں۔ مصحفی، جرأت، رنگین، میر حسن کی مثنویاں

فن مثنوی نگاری میں ایک نئے باب کا اضافہ ہیں۔ خاص طور پر میر حسن کی مثنوی "سحرالبیان" کو جو شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی وہ ابتک کی تمام مثنویوں میں کسی کو نصیب نہ ہو سکی۔ یہ مثنوی مکمل ہے۔ اس میں حمد و نعت، مناجات اور داستان کو نہایت عمدہ اور سلیقہ سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کا لہجہ نہایت نرم، انداز بیان نہایت سادہ اور شگفتہ ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے آج بھی قابل نمونہ ہے۔

پروفیسر کلیم الدین احمد اس مثنوی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"مثنوی سحرالبیان میں طرز ادا سب سے زیادہ اہم چیز ہے۔ عبارت صاف، پاکیزہ اور با محاورہ ہے، بیان شوخ اور دل پذیر ہے۔ شیرینی اور ترنم کی بھی کمی نہیں، الفاظ نرم اور ملائم استعمال ہوئے ہیں"۔ [1]

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ غدر نے جہاں ملک کے سیاسی وسماجی نظام کو متاثر کیا، وہیں ادبی وشعری دنیا کو بھی متاثر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ شعر وادب میں حیرت انگیز تبدیلیاں ہوئیں۔ مثنوی چوں کہ اپنے زمانہ کی ترجمان ہوتی ہے اسلئے اس پر اس کا اثر نہایت گہرا پڑا۔ اس دور کے مثنوی نگاروں میں امیرؔ، منیرؔ، اسیرؔ، محسنؔ، اور تسلیمؔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

منیرؔ، محسنؔ، اسیرؔ اور جلالؔ کی مثنویاں اصلاح معاشرت اور وعظ ونصیحت کے لئے ہیں لیکن تسلیمؔ آخر وقت تک قدیم رنگ مثنوی کے دلدادہ تھے۔ انہوں نے

---

[1] اردو شاعری پر ایک نظر:۔ ۳۲۰

کل نو مثنویاں لکھیں جن میں بعض تاریخی ہیں اور بعض عشقیہ مضامین پر مبنی ہیں۔ ان کے یہاں مثنوی نگاری کے فنی نقطۂ نظر سے کچھ کمزوریاں بھی پائی جاتی ہیں۔ تاہم مجموعی طور پر جذبات نگاری، منظر کشی، قصہ پن اور اسلوب بیان کے لحاظ سے قابل تعریف ہیں اور قابل تقلید بھی

علامہ نیموی کی مثنوی نگاری

اب آیئے علامہ شوق نیموی کی مثنوی نگاری پر ایک نظر ڈالیے۔

علامہ شوق نیموی نے مندرجہ ذیل مثنویاں کہی ہیں:۔

(۱) نغمۂ راز (۲) سوز و گداز (۳) درد جدائی (۴) صبح وصال

(۵) شام فراق

ان میں طویل مثنویاں سوز وگداز اور نغمۂ راز ہیں کیونکہ سوز وگداز میں سات سو سینتیس (۷۳۷) اشعار اور نغمۂ راز میں پانچ سو چھتیس (۵۳۶) اشعار ہیں۔ بقیہ مثنویاں مختصر ہیں کیونکہ درد جدائی میں انٹھانوے اشعار، صبح وصال میں اکیاون (۵۱) اشعار اور شام فراق میں چھتیس (۳۶) اشعار ہیں۔

نغمۂ راز میں سوز و گداز کے مقابلے میں گرچہ اشعار کم ہیں لیکن اولیت کے اعتبار سے سب سے پہلی مثنوی وہی ہے کیونکہ یہ ۱۳۰۳ھ میں لکھی گئی جب علامہ نیموی لکھنؤ میں زیر تعلیم تھے۔ اس کے برخلاف سوز وگداز ۱۳۱۲ھ میں تحریر کی گئی۔ اس لحاظ سے دونوں مثنویوں کے سال تحریر میں نو سال کا فرق ہے۔ اس وقت میرے سامنے مذکورہ مثنویوں کے جو مطبوعہ نسخے موجود ہیں وہ دو ہیں۔ ایک نسخہ وہ ہے جو قومی پریس لکھنؤ سے جناب محمد نثار حسین مہتمم پیام یار کی فرمائش پر طبع ہوا ہے۔ اس میں نغمۂ راز کے بعد درد جدائی، صبح وصال اور شام فراق کی

مثنویاں ملتی ہیں۔ اس نسخہ پر کوئی سال طباعت درج نہیں لیکن قدیم ہے۔ دوسرا نسخہ وہ ہے جو مولانا عبدالرشید فوقانی کے زیر اہتمام ۱۳۴۶ھ میں نظامی پریس پٹنہ سے شائع ہوا ہے۔ اس میں بھی سوز و گداز اور نغمۂ راز کے بعد در دجدائی صبح وصال اور شام فراق کی مثنویاں درج ہیں۔

سوز و گداز میں جو واقعہ نظم کیا گیا ہے وہ فرضی نہیں بلکہ اصلی اور تاریخی ہے۔ جس کو وقوع پذیر ہوئے تقریباً دو سو سال ہو گئے۔ اس میں محمد حسن اور شام سندر کی پاک عشق و محبت کی داستان بیان کی گئی ہے۔ سوز و گداز مطبوعہ نظامی پریس پٹنہ، کے مقدمہ میں مزید لکھا ہے کہ وہ عاشق (محمد حسن) اپنے حالات بذات خود لکھ گیا ہے۔ جس کو تائید عظیم آبادی (متوفی ۱۲۰۶ھ) نے اپنے خط میں بعینہٖ نقل کر کے شاہ زادہ مرزا جواں بخت جہاں دار شاہ بہادر کی خدمت میں روانہ کیا تھا، پھر ان کے بیٹے تمنا مرحوم نے اس خط کو زبدۃ المنشآت میں درج کیا ہے۔ تائید عظیم آبادی نے مزید لکھا ہے کہ "مکان عالیشان آں مہاجن کہ قریب چوک بود لبعد حادثۂ آتش زدگی بنام آں نوعروس اشتہار یافتہ"

اس واقعہ کی تاریخی حقیقت کی بنا پر ہی میر دہلوی نے کچھ روایات کے اختلاف کے ساتھ اس کو اپنی مثنوی "شعلۂ عشق" میں نظم کیا ہے اور سر داستان یہ سرخی لکھی ہے۔ آغاز قصّہ جانکاہ کہ در عہد محمد شاہ در عظیم آباد لود بر ووضع دشریف بظہور پیوستہ"

اس کے علاوہ منشی باقر علی خاں باقر لکھنوی نے بھی "شعلۂ جاں سوز" میں لکھا ہے کہ حسن ایک حسین نوجوان شریف زادہ عظیم آباد کی چھوٹی پٹن دیبی کا رہنے والا تھا۔ فارسی اور بھاکا زبان بہت اچھی جانتا تھا۔ دل کا بہت بڑا دلیر تھا اس نے

اپنا ایک جعلی نام پر ہیرام رکھا تھا۔ میر دہلوی نے اپنی مثنوی شعلہ عشق" میں اس نام کو منظوم کیا ہے اور اس جعلی نام کے تحت جلال لکھنوی نے اپنی لغت "گلشن فیض" میں لکھا ہے کہ "نام شخصے بود از عشاق" [۱]

بہر حال محمد حسن ایک خوبصورت نوجوان لڑکا تھا جو پٹنہ سیٹی کے محلہ چھوٹی پٹن دیبی کا رہنے والا تھا اور شام سندر ایک نہایت خوبرو اور پری پیکر لڑکی تھی جو پٹنہ سیٹی میں چوک کے قریب محلہ سندر باڑا کی باشندہ تھی۔ یہ محلہ مہاجنوں سے آباد تھا، اور شام سندر اسی محلہ کے ایک مہاجن کی لڑکی تھی۔ دونوں کا واقعہ معاشقہ نہایت حیرت انگیز ہے اور نہایت دل چسپ بھی۔ اسی بنا پر علامہ نیموی نے اس واقعہ کو سوز و گداز میں نظم کیا ہے جو مختصراً اس طرح ہے۔

ایک روز محمد حسن دریائے گنگا کے کنارے تفریح کی غرض سے گیا۔ وہاں اچانک ایک اجنبی خوبصورت لڑکی شام سندر پر نظر پڑی۔ اس کی خوبصورتی سے نہایت متاثر ہوا۔ اور بار بار اس کی طرف دیکھنے لگا۔ یہاں تک کہ لڑکی نے بھی نظروں کا تیر چلایا۔ اور وہ بری طرح گھائل ہو گیا۔ اور اس پر عاشق ہو گیا۔ محمد حسن بھی خوب رو نوجوان تھا اس لئے جب شام سندر نے آنکھیں چار کیں تو وہ بھی بے قابو ہو گئی اور اس پر پوری طرح فریفتہ ہو گئی۔ جب دونوں اپنے اپنے گھر پہنچے تو دونوں ایک دوسرے کے لئے بیقرار رہنے لگے۔ محمد حسن کبھی فقیر اور کبھی پنڈت کا بھیس بدلتا اور اس کی دیدار کی صورت پیدا کرتا۔ شام سندر بھی جب دیکھتی تو بے چین ہو جاتی۔ اس دوران میں شام سندر کے باپ نے اس کی

[۱] مقدمہ سوز و گداز : ۲

شادی کی نسبت ایک لڑکے سے طے کی۔ یہانتک کہ شادی کا دن مقرر ہوگیا۔ اور بارات گھر پہنچی سو ر اتفاق کہ اسی وقت گھر میں بری طرح آگ لگ گئی۔ جس کی وجہ سے ایک عجیب افراتفری کا عالم پیدا ہوگیا۔ محمد حسن کو جب شادی کی خبر کسی طرح مل گئی تو وہ بھی وہاں پہنچ چکا تھا جب اس نے گھر کو آگ کی وجہ سے بری طرح متاثر ہوتے دیکھا اور شام سندر کی زندگی خطرے میں پایا تو جھٹ سے اس کو وہاں سے نکالا اور اپنے گھر پہنچا دیا تاکہ وہ کسی طرح بچ جائے۔ جب حالات معمول پر آئے تو اس کو اس کے گھر پہنچانے کے لئے کہا لیکن شام سندر نے انکار کر دیا اور اس کے ساتھ ہی زندگی بسر کرنے کی درخواست کی۔ محمد حسن اس کی وفاداری سے نہایت متاثر ہوا اور پھر اس سے عقد کر لیا۔ یہانتک کہ دونوں نہایت عیش وعشرت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ ایک روز ایسا ہوا کہ حسن اپنے کچھ احباب کے ساتھ جھتر کا میلہ سیر و تفریح کی غرض سے گیا، تفریح کے بعد ایک کشتی سے واپس ہو رہا تھا کہ اچانک کشتی دریا میں ڈوب گئی اور تقریباً تمام لوگ غرق آب ہوگئے۔ حسن کی حیات باقی تھی وہ کسی طرح کوسوں دور دریا کے کنارے جا پہنچا۔ اسی دوران میں یہ خبر پورے شہر میں پھیل گئی کہ کشتی ڈوب گئی اور تمام لوگ غرق ہوگئے۔ جب یہ خبر شام سندر تک پہنچی تو وہ بے ہوش ہوگئی یہاں تک کہ اس کا دم نکل گیا۔ کچھ دنوں کے بعد جب حسن اپنے گھر واپس آیا تو شام سندر کی موت کی خبر سن کر نہایت رنجیدہ خاطر ہوا ایک روز اسے خبر ملی کہ دریا کے کنارے روزانہ ایک نور مجسم گشت کرتا ہوا نظر آتا ہے اور حسن حسن کی آواز لگاتا ہے جس کی آواز میں ایک طرح کا درد و کرب اور جدائی کی بے چینی محسوس ہوتی ہے۔ یہ سنکر حسن بے تاب ہوگیا اور ایک روز رات میں اپنے کچھ احباب کے ساتھ دریا کے کنارے پہنچا اور اس نور مجسم کے

انتظار میں بیٹھ گیا۔ جب کافی رات ہوگئی تو اوپر سے وہ نور مجسم گشت کرتا ہوا اور حسن کہاں ہو حسن کہاں ہو کی آواز لگاتا ہوا نظر آیا حسن یہ آواز سن کر سمجھ گیا کہ یہ شام سندر کی آواز ہے اور پھر بے قابو ہوگیا۔ وہ بے تاب ہوکر شام سندر کہاں ہو شام سندر کہاں کا نعرہ لگانے لگا یہاں تک کہ اس کی محبت میں سرشار ہوکر دم توڑدیا اور شام سندر سے جا ملا۔

یہ عشق و محبت کی ایک حیرت انگیز اور دل چسپ داستان ہے۔ جس کو علامہ نیموی نے سوز و گداز میں نظم کیا ہے۔

یہ مثنوی مکمل ہے کیوں کہ اس میں حمد و نعت، آغاز داستان، جذبۂ عشق، فقیرانہ اور پنڈت کا بھیس، سامان عروسی، واقعۂ آتشزدگی، وصال، حسن معاشرت، واقعہ جانکاہ، شعلۂ جاں گداز اور خاتمہ کتاب تمام باتیں نہایت مناسب اور دل چسپ انداز میں بیان کی گئی ہیں۔ جہاں جہاں جذبات نگاری کی ضرورت پیش آئی ہے وہاں وہاں جذباتی رنگ اختیار کیا گیا ہے۔ منظر کشی اور قصہ بیانی کے لحاظ سے بھی یہ مثنوی نہایت اہم ہے۔ کیوں کہ جس جس جگہ جس جس طرح کی تصویر کشی اور قصہ نگاری کی ضرورت تھی اس صورت سے واقعات اور مناظر کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

اس مثنوی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ایک فطری اور تاریخی واقعہ کو نظم کیا گیا ہے اور انداز بیان بھی فطری اختیار کیا گیا ہے۔ پوری مثنوی پڑھ جایئے کہیں کوئی انداز غیر فطری اور نامناسب نظر نہیں آئے گا۔ ایک ایک واقعہ کی جزئیات کے لئے مناسب اور برمحل الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور جہاں جہاں جزئیات کی تفصیل کی ضرورت تھی اس کے لحاظ سے جزئی مسائل پیش کئے گئے ہیں۔ یہ تمام باتیں پڑھ کر قاری کا جی خوش ہو جاتا ہے۔

آئیے اس کے کچھ اشعار پڑھ کر جائزہ لیں اور اس کی ادبی قدرو قیمت کا اندازہ لگائیں۔

حسن جب دریا کے کنارے پہنچتا ہے اور شام سندر کو دیکھتا ہے تو اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے کیوں کہ وہ نہایت خوب صورت لڑکی تھی۔ اس کی خوب صورتی کی تصویر اس طرح کھینچی گئی ہے ؎

نظر آیا ایکا یک شور محشر — پڑی آنکھ اک بت کافر ادا پر
پری وش، ماہ سیما، مہر طلعت — بلا قامت، قیامت قہر آفت
دو زلفیں مو بمو شکل سلاسل — خم گیسو کمند آہوئے دل
قیامت مانگ کی باریک تحریر — رہ آب بقا یا چشمۂ شیر
جبیں یا کوئی ٹکڑا چاند کا تھا — سحاب زلف میں کچھ کچھ چھپا تھا
نگارستان چین چینی جبیں، تھی — خط موج شراب آتشیں، تھی
بھنویں محراب ایوان فرخ تھیں — سپہر حسن کی قوس قزح تھیں
جگر دوز حسیناں تیر مژگاں — اترتے تھے دلوں میں شکل پیکاں
شرارت مست آنکھوں میں بھری تھی — سبو میں مئے کہ شیشے میں پڑی تھی
نگاہ چشم پرفن فتنہ پرداز — قدح نوش شراب شوخی و ناز
سو جھائی تھی یہی باریک بینی — کہ شمع حسن کی ایک لو تھی بینی
لب شیریں تھے رشک شہد و شکر — جواب لذت قند مکرر
حلاوت یہ دم شکر فشانی — بھر آتا زاہدوں کے منہ میں پانی
نظر آتے جو اس گل کے کہیں گال — ٹپک پڑتی جناب شیخ کی رال
دہن تھا غنچۂ سربستہ راز — گل عارض بہار گلشن ناز

چمک اٹھے جو دنداں مثل اختر
تو ہو جاتے تھے پانی پانی گوہر
نقاط خال عارض پیارے پیارے
پری کی تپلیاں آنکھوں کے تارے
نظر پڑتی اگر سیب ذقن پر
غضب کی اوس پڑ جاتی چمن پر
گلا تھا گردن مینا کی صورت
برنگ مے ٹپکتی تھی لطافت
بہار سرو قد تھی اوٹھتی کوپل
نہال نوجوانی کے تھے دو پھل
جو پڑ جاتی نظر لوح شکم پر
پھسل کر صاف گر پڑتی قدم پر
سنبھل سکتی نہ جوش صفا سے
الگ ہو جاتی ران و ساق پائے
پتا ملتا نہ کچھ موئے کمر کا
کہ ہم رشتہ وہ تھا تار نظر کا
بلائے جاں قیامت خیز رفتار
صدائے حور تھی چھاگل کی جھنکار
غرض اس شان سے وہ ماہ کامل
ہوئی زینت وہ آغوش ساحل[1]

جب دونوں کی آنکھیں چار ہو گئیں تو دونوں ایک دوسرے پر فریفتہ ہو گئے۔ ان دونوں کی فریفتگی کی تصویر اس طرح کھینچی گئی ہے ؎

یہ عالم دیکھ کر اس سیم تن کا
ہوا قابو سے دل باہر حسن کا
جگر پر ہاتھ رکھ کر کھینچی اک آہ
بت کافر کے دل میں جس نے کی راہ
تڑپ اٹھی رگ بسمل کی صورت
جگر پر چوٹ کھائی دل کی صورت
سنبھالا کچھ دل ناوک نشاں کو
نگاہ یاس سے دیکھا جواں کو
ہوا ثابت یہ اوس رشک قمر پر
کہ مجھ پر رو رہا ہے یہ مقدر
مری زلفوں کا ہے یہ پابزنجیر
بنا ہے ناوک مژگاں کا نخچیر

[1] سوز و گداز: ۷۸

کبھی دل میں خیالِ آبرو تھا　　غمِ رسوائے ہر چار سو تھا
کبھی افسوس حالِ نوجواں پر　　تاسف عاشقِ آشفتہ جاں پر ۱؎

جب دونوں دریا سے واپس ہوئے تو ان کا حال یہ تھا ؎

نظر آیا حسن کو جب یہ نیرنگ　　رہا پھر کچھ نہ پاس عزت و ننگ
زمیں سے وہ بھی مثلِ گرد اُٹھا　　بہت بے تاب شکلِ درد اُٹھا
بگولے کی طرح کچھ خاک اُڑائی　　عجب وحشت زدہ صورت بنائی
کمندِ جذبِ الفت کی کشش سے　　چلا بل کھا کے آخر پیچھے پیچھے
ہوئی گو آشنائے ضبط وہ حور　　مگر تھی اضطرابِ دل سے مجبور
نگاہِ یاس سے پھر پھر کے دیکھا　　بہانے سے ادھر ہر پھر کے دیکھا
ادھر وحشت ادھر وارفتگی تھی　　ادھر حسرت ادھر دل تفتگی تھی
ادھر ہر لحظہ جوشِ اشک باری　　ادھر ہر اک قدم پر بے قراری
ادھر وہ نوجواں کہتا تھا دل میں　　پھنسا میں کس بلائے جاں گسل میں
مرا دل آج قابو میں نہیں ہے　　جگر کی طرح پہلو میں نہیں ہے
بنا کر تیرِ الفت کا نشانہ　　مجھے اب کیا دکھاتا ہے زمانہ
ادھر کہتی تھی وہ زہرہ شمائل　　کہ میرا اس طرح کیوں ہو گیا دل
مجھے کیا کوئی شیدائی بنا ہے　　بلا سے میری سودائی بنا ہے
کھلائے گا گل اک دن عشق کافر　　اُڑے گی یہ خبر بو ہو کے آخر
الجھتی تھی کبھی کاکل کی صورت　　پریشاں تھی کبھی سنبل کی صورت
کبھی مثلِ کمر بل کھاتی غم سے　　کبھی دم ساز آہِ نیم دم سے ۲؎

۱؎ سوز و گداز : ۱۰　۲؎ سوز و گداز : ۱۱

شام سندر کی موت کے بعد جب حسن دریا کے کنارے اپنے احباب کے ساتھ پہنچتا ہے اور اس کی روح نور مجسم ہو کر آسمان سے آتی ہے اور حسن کو آواز دیتی ہے تو اس کی تصویر اس طرح کھنچی گئی ہے

حسن نے اپنے یاروں کو اٹھایا | طلسم شعلۂ گردوں دکھایا
یکایک یہ صدائے حسرت انگیز | ہوئی کہر خرمن دل پر شرر ریز
کہاں تم اے حسن رونق فزا ہو | نہیں ملتے ہو کیوں کیا کچھ خفا ہو
نہیں تم کو خیال شام سندر | ہوا کیا غم میں حال شام سندر
لگی رہتی ہے دل میں آگ دن رات | بجھاتے کیوں نہیں تم آ کے ہیہات
ہوئی جب گوش زد وہ نوحہ خوانی | حسن کا ہو گیا دل پانی پانی
نکالی جیب سے تحریر اپنی | کتاب قصۂ تقدیر اپنی
کسی ہمدم کو دے کر برق آسا | سوئے شعلہ ہوا وہ گام فرسا
پکارا شام سندر شام سندر | حسن میں ہوں پریشاں حال و ششدر
غرض لپکا ادھر سے کچھ وہ مجبور | ادھر سے کچھ بڑھا وہ موج نور
ہوئی مد بھیڑ ان دونوں میں جس دم | ہوئے سرگرم رقص و وجد باہم
حسن تھا جذب الفت سے جو مجبور | ہوا رونق فروز موج نور
در آیا شعلہ میں پروانۂ عشق | بھڑک اٹھا چراغ خانۂ عشق
ہوا مثل پری وہ شعلہ رقصاں | اڑا پھر صورت تخت سلیماں
فلک پر چڑھ گیا دم بھر میں سن سے | اٹھایا ہاتھ یاروں نے حسن سے[1]

[1] سوز و گداز : ۱۰۴

اس مثنوی کی انہیں سب خوبیوں کی بنا پر پورے ملک میں پذیرائی ہوئی اور داغ دہلوی جیسے ممتاز شاعر نے اس کی بے حد تعریف و توصیف کی جس کا بیان آگے آرہا ہے۔

نغمہ راز علامہ نیموی کی دوسری طویل مثنوی ہے اور اسے مثنوی کی دنیا میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اس مثنوی میں فرضی واقعہ نظم کیا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک چودہ سالہ نوجوان لڑکا اپنے باپ کے سایہ سے محروم ہوگیا ہے اور وہ پریشانی کی وجہ سے دربدر پھرنے لگا۔ اتفاق سے ایک رئیس کی اس سے ملاقات ہوگئی۔ رئیس نے اس کی بدحالی دیکھ کر اپنے گھر لے جانے کے لئے کہا۔ وہ تیار ہوگیا۔ اور اس کے گھر جاکر رہنے لگا۔ رئیس کی ایک لڑکی تھی ایک جگہ رہتے رہتے دونوں میں پہلے دوستی ہوئی۔ پھر عشق و محبت تک معاملہ پہنچا۔ دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکنے لگے اور لڑکا بری طرح اس کا عاشق ہوگیا۔ اس واقعہ کو دیکھ کر رئیس نے دونوں کا عقد کر دیا۔ لیکن وصال تک نوبت نہ آسکی۔ لڑکا اس کی جدائی میں کمزور ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ انتقال کر گیا۔ جب یہ خبر لڑکی تک پہنچی تو وہ نہایت متاثر ہوئی اور پھر اپنے عاشق کے غم میں وہ بھی دنیا سے رخصت ہوگئی۔

یہ مثنوی گرچہ فرضی ہے لیکن اس کا انداز بیان بالکل فطری ہے۔ جذبات نگاری کے لحاظ سے بھی یہ نہایت اہم مثنوی ہے۔ اس کے علاوہ واقعہ کے ہر ہر جزو کی اچھی طرح منظر کشی کی گئی ہے۔ زبان و بیان نہایت سادہ، دل چسپ اور حقیقت پسندانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ مثنوی چھپ کر اہل علم کے سامنے آئی تو ملک کے نامور شعراء و ادبا نے اس کی نہایت قدر کی اور امیر مینائی۔ تسلیم لکھنوی

شمشاد لکھنوی اور یاس لکھنوی جیسے اساتذہ شعرا نے اس کی تعریف کی (تفصیل آگے آرہی ہے) اب یہاں ہم اس مثنوی کے چند اشعار پیش کرتے ہیں تاکہ اس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے۔

اس قصہ کے مندرجہ ذیل ابتدائی اشعار ملاحظہ کیجیے جس میں پرزور اور پرشکوہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں ؎

جی میں آتا ہے وہ قصہ لکھوں — قیس و فرہاد ہوں جس پر مفتوں
درد دل سے جو بھرے ہوں اشعار — سن کے عشاق کو آئے نہ قرار
چوٹ کھائے ہوئے دل ہوں بیتاب — چشم گریاں سے بہائیں خون ناب
چست بندش ہو مضامیں دلخواہ — بول اوٹھے غیر بھی سبحان اللہ
دیکھ کیا سحر دکھاتا ہوں میں — قصۂ عشق سناتا ہوں میں
کہ کسی شہر میں تھا کوئی بزرگ — مرد دیندار و کہن سال و سترگ
صاحب منصب و جاہ و عزت — صاف دل پاک دروں خوش خصلت
اس کو خالق نے دیا ایک پسر — مردم دیدۂ دل نور نظر
غیرت انجم و رشک خورشید — کوکب برج سپہر امید
اوسکو ماں باپ ہر صبح و مسا — صورت آرزوِ دل پالا
اپنے پہلو سے نہ کرتے تھے جدا — اک برس کا وہ ہوا نام خدا
کہ فلک نے یہ دیا داغ الم — اوس کی ماں نے لی رہِ ملک عدم
اپنے آغوش محبت میں پدر — پرورش کرنے لگا شام و سحر
کچھ دنوں بعد وہ پروردۂ ناز — ہو گیا ہوش و خرد سے دمساز
پھر تعلیم و ادب خوش ہو کر — رکھا اوستاد پدر نے نوکر

حسن آداب میں وہ طاق ہوا — علم میں شہرۂ آفاق ہوا

معشوقہ کی جدائی میں جب لڑکا حد سے زیادہ پریشان ہوا تو لڑکی پر بھی اس کا اثر پڑا اور وہ بے تاب ہو کر لڑکے کے نام ایک خط لکھتی ہے جس میں اپنے عاشق کی پریشانی کی وجہ پوچھتی ہے۔ خط ملاحظہ کیجیے ؎

آپ کا حال سنا میں نے یہ آج — کہ کئی دن سے ہے ناساز مزاج
کروٹیں لیتے ہیں بیتابی سے — آشنا چشم ہے بے خوابی سے
دل میں ہے درد، لبوں پر دم سرد — آنکھیں پر آب ہیں رخسار ہیں زرد
کچھ تو فرمائیے کیوں ہے یہ حال — کس لیے ہیں یہ غم و رنج و ملال
دشمنوں کی ہے طبیعت کیسی — بے مرض ہے یہ نخافت کیسی
شکوۂ بخت و مقدر کیوں ہے — "ہائے دل" ہر گھڑی لب پر کیوں ہے
بے حجابانہ جو باعث غم — کہیے گا ٹھیک مرے سر کی قسم
آج کل غیر ہے حالت میری — سخت بیکل ہے طبیعت میری
نہ کسی طرح بہلتا ہے دل — نہ سنبھالے سے سنبھلتا ہے دل[1]

لڑکے نے اس خط کا جواب دیا ہے وہ بھی قابل مطالعہ ہے۔ فرماتے ہیں ؎

اے مری جاں مری محرم راز — کچھ مرے دل کا سنو سوز و گداز
آتش شوق بھڑک اٹھتی ہے — آہ کی برق کڑک اٹھتی ہے
اب اولٹتا ہے کلیجہ میرا — غم سے پھٹتا ہے کلیجہ میرا
ہجر کی اب نہیں طاقت مجھ کو — مار ڈالے گی یہ فرقت مجھ کو
ہجر میں اب یہ مرا عالم ہے — صدمۂ درد سے لب پر دم ہے

[1] نغمۂ راز: ۱۷

ضعف سے تن ہے سراپا لاغر — بن گیا ہے رگ تار بستر
نکلے ہوئے ہیں جو رخصت دل سے — لب تک آتے ہیں بڑی مشکل سے

میں ہوں یا بستر رنجوری ہے — ایک ہمدم غم مہجوری ہے
شمع دل سوزی مری بالیں پر — روتی رہتی ہے الم میں شب بھر[1]

اس کے علاوہ علامہ نیموی نے جو مختصر مثنویاں کہی ہیں ان میں بھی جدت بیان صداقت، قصہ پن، تخیل، منظر کشی اور زور بیان پورے طور پر نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ علامہ نیموی کو مثنوی نگاری کے میدان میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

قصیدہ نگاری

علامہ شوق نیموی کا اصل میدان گرچہ غزل گوئی اور مثنوی نگاری ہے تاہم انہوں نے قصائد، رباعیات اور قطعات بھی کہے ہیں جن سے ان کی جولانی طبع اور قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔

علامہ شوق نیموی کے زمانے میں داغ دہلوی، امیر مینائی، تسلیم لکھنوی اور جلال لکھنوی جیسے نامور اور عظیم شعراء موجود تھے۔ چوں کہ سلطنت دہلی کی بساط الٹ چکی تھی، لکھنو کی مرکزیت بھی عارضی تھی، اس لیے ان شعراء نے رامپور اور دوسرے مرکزی مقامات کا رخ کیا۔ ان مرکزی مقامات کے نوابین اور روٴسا دہلی اور لکھنو کی طرح خوشامد پسند اور اپنی تعریف کے دلدادہ تھے۔ اس لئے ان شعراء نے اپنی معاشی بدحالی دور کرنے کے لئے ایسے قصائد کہے جن میں ان کی حد سے زیادہ

[1] نغمہ راز: ۶۳

ثنا خوانی اور مبالغہ آمیز رنگ تعریفی پہلو نظر آتے ہیں۔ اوران کے تقریباً تمام قصائد ایسے ہیں جو کسی نہ کسی نواب یا رئیس کی شان میں کہے گئے ہیں۔ امیر مینائی یا تسلیم کے قصائد دیکھ جایئے۔ ان کے تمام قصائد ارباب دولت کی مدح وثنا میں لکھے گئے ہیں۔

علامہ شوق نیموی جب لکھنو میں زیر تعلیم تھے اس وقت ان کی شاعری کا چرچا دور دور تک پھیل چکا تھا۔ ان کی ادبی وشعری شہرت کی بنا پر ہی نواب رام پور کلب علی خاں نے اپنے دربار میں انہیں بلایا تھا۔ دستور کے مطابق علامہ شوق نیموی ایک قصیدہ کے ساتھ ان کے دربار میں حاضر ہوئے جب انہوں نے یہ قصیدہ پڑھا تو حضرت داغ دہلوی جیسا عظیم شاعر اس محفل میں موجود تھا یہ قصیدہ سنکر نہ صرف نواب رام پور خوش ہوئے بلکہ داغ دہلوی بھی نہایت متاثر ہوئے اوران کی قادرالکلامی کی تعریف کی۔ یہی وجہ ہے کہ جب علامہ نیموی وہاں سے رخصت ہونے لگے تو نواب رام پور نے انعام واکرام سے نوازنے کے ساتھ ساتھ دربار میں دوبارہ آنے اور اس سے منسلک رہنے کی خواہش ظاہر کی۔ تاہم علامہ نیموی کی غیور طبیعت نے اس کو قطعاً پسند نہ کیا اور پھر کبھی بھی ادھر کا رخ نہیں کیا جبکہ کئی سال لکھنو میں مقیم رہے اور لکھنو کے دوسرے شعراء وہاں جاجاکر مالی منفعت حاصل کرتے رہے۔

یہی وجہ ہے کہ لکھنو کے چھ سالہ دوران قیام میں علامہ نیموی کا صرف ایک قصیدہ ہمیں ملتا ہے جو نواب رام پور کی شان میں کہا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں دو

اور قصیدے ملتے ہیں جو نواب منگرول شیخ حسین اور نواب ڈھاکہ سلیم اللہ کی شان میں کہے گئے ہیں۔ نواب ڈھاکہ کی مدح میں جو قصیدہ لکھا گیا ہے وہ دراصل ضمنی ہے۔ کیوں کہ علامہ نیموی اصلاً ایشیاٹک سوسائٹی میں کسی کتاب کی تلاش میں گئے ہوئے تھے، اس ضمن میں ڈھاکہ، چاٹگام اور دوسرے شہروں کی سیر کی، دوست احباب اور اپنے رشتہ داروں سے ملاقات کی۔ ڈھاکہ گئے تو اپنے احباب کے علاوہ نواب ڈھاکہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اور ایک قصیدہ پیش کیا۔

اس کے علاوہ ہمیں تین قصیدے مزید ملتے ہیں۔ ان میں دو قصیدے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی مدح میں کہے گئے ہیں جن میں ایک نعمت عظمیٰ کے نام سے فارسی زبان میں ہے۔ دوسرا اردو زبان میں اور تیسرا شیخ طریقت مولینا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی شان میں ہے۔

اس طرح ہمیں ان کے کل مندرجہ ذیل قصائد ملتے ہیں

(۱) قصیدہ در مدح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (فارسی)

(۲) قصیدہ در مدح آنحضرت صلعم (اردو)

(۳) قصیدہ در مدح کلب علی خاں نواب رام پور (اردو)

(۴) قصیدہ در مدح شیخ حسین نواب منگرول (اردو)

(۵) قصیدہ در مدح سلیم اللہ نواب ڈھاکہ (اردو)

(۶) قصیدہ در مدح مولینا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی (اردو)

علامہ نیموی کے یہ قصائد اگرچہ فنی اور شعری لحاظ سے وہ مرتبہ حاصل نہیں کرسکے

جو ان کی غزلوں اور مثنویوں نے کی ہیں تاہم ان کے یہاں جس قدر زورِ کلام، پرشکوہ الفاظ، جدتِ بیان اور بلند پایہ مضامین پائے جاتے ہیں ان کی وجہ سے ان کے قصائد کا مرتبہ نہایت بلند ہو جاتا ہے۔ انہوں نے فارسی تراکیب کا استعمال بھی نہایت استادانہ طور پر کیا ہے۔ تشبیب، گریز، مدح اور دعائیہ کے موقع پر جو خوبصورت اور دلکش اسلوب اختیار کیا ہے اس سے بھی ان کے قصائد کی اہمیت کافی بڑھ جاتی ہے۔

اب آیئے ان کے کچھ اشعار پڑھ کر ان کی قصیدہ نگاری کا اندازہ لگائیں۔ اور ان کی شعری و ادبی خوبی دیکھیں۔

قصیدہ "نعمتِ عظمٰی" علامہ نیموی کا معرکۃ الآرا قصیدہ ہے۔ جو آنحضرت صلعم کی مدح میں ہے، اور فارسی زبان میں ہے۔ اس کے چند اشعار مدحیہ ملاحظہ کیجیے۔ اور دیکھیے کہ کس قدر زورِ کلام، روانی اور زبان پر قدرت نظر آتی ہے، فرماتے ہیں

در اقلیم سخنداں توئی امروز سلطانی — بخوش گوئی چو قاآنی ہمی داری ید طولیٰ
بسا شعر و سخن گفتی گہرہای بیاں سفتی — دماغ خویش آشفتی شدی در رد شتہا در بطا
مگر در مدحت احمد کہ یادش کہ رحمت ایزد — رسول احمر و اسود بہار گلشن لولا
بایں رنگیں بیانیہا بہ بزم شعر خوانیہا — نکردی در فشانیہا دریغا حسرتا دردا
نی واقف ازیں گلشن نداری آگہی از من — شنو اکنوں کنم روشن کہ ایں خلد ست ویں حورا
ہمانا سورہ رحمٰن کہ باشد زینت قرآں — بود کافی مدح ماں توئی خود عاقل و دانا
بے ملاح آنحضرت بہار آیہ رحمت — بایں حسن و بدیں شوکت مرا فرمود حق پیدا
سر گردم کہ چوں دیدم ترا از جاں پسندیدم — کشیدہ خوش امیدم مرا آورد تا اینجا
دلے چوں دید مت اکنوں شدم مایوس و بس محزوں — کہ خود یک مصرع موزوں بمدحش نیست شوقا[1]

[1] دیوان شوق : ۸۰

مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی مدح میں کس طرح پاکیزہ اشعار کہے گئے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

جناب فضل رحمٰن پر ہوا جب فضل رحمانی ۔۔۔ دل اقدس بنا آئینہ اسرار ربانی
خدا نے آپ کو آئینہ قدرت بنایا ہے ۔۔۔ نظر آتی ہے جس میں شان حسن صنع یزدانی
توجہ آپ کی جس پر ہوئی وہ ہوگیا کامل ۔۔۔ اگر تھا ذرہ آسا بن گیا خورشید عرفانی
مسخر کرلیا دم میں پریزداں معنی کو ۔۔۔ سویدائے دل پر نور ہے مہر سلیمانی
اگر دیکھے عرقہائے جبیں پاک کے قطرے ۔۔۔ ندامت سے ہو پانی پانی آب در عمانی
جو بیٹھے آپ کے حلقے میں اطمنان دل پائے ۔۔۔ حضور فضل رحمٰن کیا چلے افسون شیطانی
اگر چاہیں سلاطیں جہاں پر ہو شرف حاصل ۔۔۔ کہو خاقان و قیصر سے کریں حضرت کی دربانی
سریر آرائے اقلیم ولایت وہ ہوئے جب سے ۔۔۔ ملا ہے بوریا کو پایہ اورنگ سلطانی [1]

دعائیہ کے چند اشعار بھی ملاحظہ فرمایئے ؎

اوٹھاؤ ہاتھ اب بہر دعا حسن عقیدت سے ۔۔۔ کہ ہو گلگونہ رخسار مدح و ثنا خوانی
الٰہی بارگاہ لم یزل میں تیری آیا ہوں ۔۔۔ کہ ہے درگاہ تیری مرجع ہر قاصی و دانی
یہی التجا میری تری درگاہ عالی میں ۔۔۔ طلسم آسا رہے جبتک بقائے عالم فانی
رہیں جبتک فلک پر قطب دونوں ساکن و ثابت ۔۔۔ رہے جبتک فساں کی طرح دور چرخ گردانی
مہ و انجم فلک پر شمع ساں جبتک رہیں روشنی ۔۔۔ رہے خورشید عالم تاب میں جبتک درخشانی
گلوں کا گلشن ایجاد میں جبتک رہے جوبن ۔۔۔ رہیں جبتک ترنم ریز مرغان گلستانی
گل افشانی رہے جبتک مرے اشعار رنگیں کی ۔۔۔ رہے آویزہ گوش جہاں جبتک ثناخوانی
جناب پیر و مرشد کا مرے سر پر رہے سایہ ۔۔۔ رہے جاری ہمیشہ بحر فیض فضل رحمانی [2]

[1] دیوان شوق، ۸۴ [2] دیوان شوق: ۸۶

نواب رام پور کی شان میں جو مدحیہ اشعار کہے ہیں ان میں بھی زور کلام اور قدرت بیان پائی جاتی ہے۔ اس کا اندازہ ان اشعار سے کیجئے ؎

ایسے کا ثنا خواں ہوں کہ اوصاف ہیں جس کے
وسعت گہ تخئیل سخنور سے زیادہ

جمشید حشم ظل خدا کلب علی خاں
دارائے جہاں بخش سکندر سے زیادہ

دے آبرو ادنیٰ کو جو وہ بحر سخاوت
شبنم کا ہر اک قطرہ ہو اخگر سے زیادہ

پھیرے سر منقار اگر حکم ہے اس کے
دشمن کو گریباں ہو خنجر سے زیادہ

ہو معرکہ آرا تو صف فوج عدو کو
تنہا تہہ خنجر کرے لشکر سے زیادہ

پیغام اجل ہے پے دشمن غضب اسکا
ہے چین جبیں تیغ دو پیکر سے زیادہ

بڑھ کر دم شمشیر زنی ترک فلک سے
آفاق مستاں خسرو خاور سے زیادہ

مشہور جہاں جو دمیں بخشش میں کرم میں
قوت میں شجاعت میں غضنفر سے زیادہ

دیکھے نگہ کرم سے اگر جانب الماس
بے قدر زمانے میں ہو پتھر سے زیادہ

شیریں سخن ایسا کہ دم سحر بیانی
باتوں میں مزہ قند مکرر سے زیادہ

ہر شمسۂ ایوان فلک اوج ہے روشن
دن رات مہ و مہر منور سے زیادہ

گھر کرتی ہے آنکھوں میں مکانوں کی سپیدی
دیوار ہے محبوب سمن بر سے زیادہ

کیا اسپ سبک گام کی لکھوں میں ستائش
بے چین دل عاشق مضطر سے زیادہ

جانے میں خیال حکما آنے میں ادراک
ہر حال میں ہے اشہب صرصر سے زیادہ

پڑ جائے اگر عکس ہلال سم توسن
تابندہ ہر اک ذرہ ہو اختر سے زیادہ

اعزاز و حشم اس کی سخاوت کی بدولت
حاصل ہے فقیروں کو تونگر سے زیادہ

دریا دلی اس کی جو یہی ہے تو عجب کیا
ہو جائے بلند آب گہر سے زیادہ

اس دور میں رکھتا ہے ہر اک شخص بغل میں
اسباب طرب شیشہ و ساغر سے زیادہ

مینائے مئے عیش ہے شادی سے دل خلق
ہر لب متبسم ہے گل تر سے زیادہ
کس درجہ ہے شوق رقم مدح شہنشاہ
لکھ جاتا ہے خامہ حد مسطر سے زیادہ
لکھوں میں اگر ایک صفت لاکھ کے بدلے
ہو جزو قصیدہ مراد فتر سے زیادہ [1]

اس کے دعائیہ اشعار ملاحظہ کیجئے

اے شوق شب و روز ہے حضرت ممدوح
کر عرض یہی خالق اکبر سے زیادہ
یارب مرے سلطان کو صحت رہے حاصل
ہو عمر عطا خضر پیمبر سے زیادہ
ہو دیدۂ بدبیں کے لئے جنبش مژگاں
ہنگام نظر کاوش نشتر سے زیادہ
اقبال و حشم دیکھ کے حاسد تہ افلاک
جلتے رہیں دن رات سمندر سے زیادہ [2]



رُباعیات

ابتدائی زمانے میں گرچہ اردو شعراء کی پوری توجہ غزل، مثنوی اور قصیدہ کی طرف مرکوز تھی تاہم رباعی کہنے کا سلسلہ بھی چل رہا تھا۔ اس کا باقاعدہ آغاز میر تقی میر کے عہد سے ہوتا ہے۔ امیر، منیر اور جلال کے یہاں باضابطہ طور پہ رباعیاں ملتی ہیں جو زیادہ تر عشقیہ مضامین پر مبنی ہیں تسلیم نے جو رباعیاں کہی ہیں وہ اخلاقی اور صوفیانہ مضامین پر مشتمل ہیں۔

علامہ شوق نیموی نے بھی رباعیاں کہی ہیں جن سے ان کی قادر الکلامی کا پتا چلتا ہے انہوں نے اچھی خاصی رباعیاں کہی ہوں گی لیکن دیوان شوق میں جو رباعیاں ملتی ہیں ان کی تعداد سینتیس ہے۔ ان کی رباعیات عشقیہ، مذہبی اور اخلاقی مضامین پر مبنی ہیں۔

[1] دیوان شوق: ۸۸ [2] دیوان شوق: ۸۸

ان رباعیوں میں زور بیان، سادگی، مضمون آفرینی اور دل کشی پوری طرح پائی جاتی ہے۔ عشقیہ مضامین کی چند رباعیاں ملاحظہ کیجیے اور ان کے شعری وفنی کمال کا اندازہ کیجیے۔ فرماتے ہیں

اے شوق یہ چہرے کا اترنا کیسا — رہ رہ کے کسی کو یاد کرنا کیسا
مانا کہ کوئی اور سبب اس کا ہے — لیکن یہ سرد آہ بھرنا کیسا

گھائل جو ہوں تیغ ابروِ دلبر کا — ہر لفظ میں رنگ ہے دمِ خنجر کا
ٹوٹے ہوئے دل سے جو صدا نکلے گی — اے شوق کرے گی کام وہ نشتر کا

پہلے نگہ ہوش ربانے لوٹا — اس بت کے پھر انداز و ادانے لوٹا
اے شوق رہا سہا مرا صبر و قرار — کچھ ناز و ادا نے کچھ حیا نے لوٹا

کس سوچ میں ہیں آپ یہ کیا حال ہے آج — کیا کشورِ دل کیا کسی نے تاراج
آثار ملال ہیں جبیں سے ظاہر — اے حضرت شوق کہیے کیسا ہے مزاج

مسلم قوم اور اسلام کی بدلتی ہوئی حالت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں سہ

اس گردش چرخ نے کیا کام تمام — غفلت میں پڑی رہتی ہے قوم اپنی مدام
اے خواب گراں کے سونیوالو اٹھو — اب نام کو رہ گیا ہے باقی اسلام

افسوس وہ اسلام کی حالت نہ رہی — وہ شکل، وہ رنگ اور وہ صورت نہ رہی
غفلت کے مرض سے دل ہو گئے کمزور — اسلام کے کچھ کام کی ہمت نہ رہی

یہ بحر یہ موج یہ بھنور یہ منجدھار   کشتی ٹوٹی ہوئی ہے سینہ ہے فگار
اے دین کے ناخدا دوہائی تیری   اسلام کا بیڑا کہیں لگ جائے پار

علامہ نیموی کے وقت میں ندوۃ العلماء لکھنؤ سے کچھ علماء پٹنہ آئے تھے علامہ نیموی ان کی آمد سے نہایت خوش ہوئے اور فرمایا ؎

پٹنہ میں جو شوق اہل ندوہ آئے   کیا کیا برکات ساتھ اپنے لائے
دیکھو چھایا ہوا ہے ابر رحمت   لاکھوں گھر مراد ہم نے پائے

ندوہ کی طرف سے آئے ہیں جو علماء   نائب ہیں رسول حق کے ہیں راہ نما
اسلام یہ پھیلائیں گے اک عالم میں   چمکیں گے جس کے نور سے ارض و سما

آیا ہے جو وفد ندوۂ ذی شوکت   چھائی ہوئی ہے کیسی خدا کی رحمت
گھر بیٹھے مراد ہم نے پائی اے شوق   اللہ اللہ یہ ہماری قسمت

پٹنہ کی علمی مرکزیت کی تعریف میں فرماتے ہیں ؎

اب ملک سخن کی آبرو ہے پٹنہ   مشہور زمانہ چار سو ہے پٹنہ
شوق اہل کمال کا یہاں مجمع ہے   رشک دہلی و لکھنؤ ہے پٹنہ

ہے اہل کمال سے یہ پٹنہ آباد   شاگرد کے شاگرد یہاں ہیں استاد
کامل ہیں یہاں سینکڑوں اہل سخن   یہ ہیں وہ ہیں وہ شاد ہیں وہ آزاد

علامہ نیموی نے کچھ رباعیاں ایسی بھی کہی ہیں جن میں اپنے شعری فضل و کمال کا دعویٰ کیا ہے وہ رباعیاں بھی دیکھئے ؎

اشعار مرے نہیں یہ ہیں نالہ و آہ   پتھر کے دل میں بھی یہ کرتے ہیں راہ
اے شوق یہ اعجاز ہے گویائی کا   بول اٹھتے ہیں تب بھی سبحان اللہ

آسان نہیں کچھ یہ زباندانی ہے   یاروں نے حقیقت ہی نہیں جانی ہے
ہاتھ آئے ہیں حد سخن کچھ اے شوق   برسوں جب خاک لکھنو چھانی ہے

قطعات

علامہ نیموی کے دور میں قطعات لکھنے والے شعراء کی اچھی خاصی تعداد نظر آتی ہے۔ جن میں تسلیم، جلال، منیر اور امیر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ کیوں کہ ان شعراء کو اس فن میں خصوصی مہارت حاصل تھی۔

علامہ نیموی نے بھی اس فن میں طبع آزمائی کی ہے اور اچھے قطعات کہے ہیں۔ ان کے قطعات زیادہ تر تاریخی ہیں جو وقت اور حالات کی مناسبت سے کسی کی وفات، پیدائش، طباعت دیوان یا اور کسی اور موقع پر کہے گئے ہیں۔ ان کے بعض قطعات میں نہ صرف کتاب کی تاریخ طباعت بیان کی گئی ہے بلکہ اس ضمن میں کلام پر تبصرہ اور اس کے حسن وخوبی کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ دیوان شوق میں جو تاریخی قطعات درج ہیں وہ مندرجہ ذیل شعراء کرام اور اہل علم کی کتابوں کی طباعت کے موقع پر کہے گئے ہیں۔ ان میں سات قطعات تو اردو زبان میں ہیں بقیہ فارسی زبان میں ہیں

۱۔ دیوان شمس العلما مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی۔ مطبوعہ ۱۲۹۹ھ
۲۔ مثنوی صبح خنداں۔ حضرت امیر اللہ تسلیم لکھنوی۔ مطبوعہ ۱۳۰۱ھ
۳۔ دیوان داغ دہلوی مطبوعہ ۱۳۰۲ھ
۴۔ دیوان عبدالاحد شمشاد لکھنوی مطبوعہ ۱۳۰۲ھ (اردو)

۵۔ دیوان شیخ احمد حسین مذاق رئیس ہریانواں مطبوعہ ۱۳۰۳ھ

۶۔ دیوان صغیر لکھنوی مطبوعہ ۱۳۰۵ھ

۷۔ دیوان نعتیہ ممتاز احمد ممتاز مطبوعہ ۱۳۰۷ھ (اردو)

۸۔ مثنوی منشی نعیم الحق مشیر مطبوعہ ۱۳۰۶ھ (اردو)

۹۔ کلیات طالب ملتانی مطبوعہ ۱۳۰۱ھ

۱۰۔ دیوان حکیم حسن صاحب ازل لکھنوی مطبوعہ ۱۳۱۲ھ (اردو)

۱۱۔ دیوان منشی سورج بھان میکش حیدر آبادی مطبوعہ ۱۳۱۲ھ (اردو)

۱۲۔ مثنوی اخگر عشق نواب بہادر اخگر رئیس اجیگڈھ مطبوعہ ۱۳۱۳ھ

۱۳۔ دیوان مولوی سید نذر الرحمٰن صاحب حفیظ عظیم آبادی مطبوعہ ۱۳۱۷ھ (اردو)

۱۴۔ دیوان شاہ محمد اکبر ابوالعلائی داناپوری مطبوعہ ـــــــ ۱۳۱۴ھ ،

۱۵۔ واسوخت منشی محمد مختار صاحب مختار شاہجہانپوری مطبوعہ ۱۳۱۷ھ (اردو)

۱۶۔ رسالہ منشی محمد مختار صاحب مطبوعہ ۱۸۹۶ء

۱۷۔ رسالہ ارمغاں مولفہ منشی محمد قادر علی قادر صفی پوری مطبوعہ ۱۳۰۸ھ

۱۸۔ کتاب بحر العلوم شرح عین العلم مطبوعہ ۱۳۰۲ھ

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل اہل علم ایسے ہیں جن کی وفات پر تاریخی قطعات لکھے گئے ہیں۔

۱۔ وفات مولینا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی ۱۳۰۳ھ

۲۔ وفات سید شاہ شمس الدین عظیم آبادی ۱۳۱۹ھ

۳۔ وفات منشی فضل حق بہاری ۱۳۲۰ھ

اس کے بعد یادگار وطن اٹھا کر دیکھئے تو اس میں مندرجہ ذیل اشخاص کی

وفات یا پیدائش پر تاریخی قطعات ملتے ہیں - جو فارسی زبان میں ہیں -

۱- سید شاہ اکبر علی ممنپوری	(متوفی	۱۲۲۰ ھ)	ص : ۱۱
۲- محمد اشفاق نیموی	(متوفی	۱۲۶۸ ھ)	ص : ۱۳
۳- شیخ اکبر علی نیموی	(متوفی	۱۲۳۲ ھ)	ص : ۱۶
۴- شیخ الطاف حسین نیموی	(متوفی	۱۳۰۹ ھ)	ص : ۱۷
۵- شیخ امین اللہ نیموی	(متوفی	۱۲۲۸ ھ)	ص : ۱۸
۶- شیخ بلاقی ممنپوری	(متوفی	۱۳۰۷ ھ)	ص : ۲۲
۷- شیخ تبارک حسین نیموی	(متوفی	۱۲۸۳ ھ)	ص : ۲۳
۸- شیخ ثناء اللہ ممنپوری	(متوفی	۱۲۴۱ ھ)	ص : ۲۳
۹- شیخ جوگی ممنپوری	(متوفی	۱۳۰۸ ھ)	ص : ۲۳
۱۰- شیخ چمن سالارپوری	(متوفی	۱۲۹۲ ھ)	ص : ۲۴
۱۱- شیخ حبیب الحسنین نیموی	(متوفی	۱۳۰۲ ھ)	ص : ۲۵
۱۲- شیخ دھومن نیموی	(متوفی	۱۲۴۶ ھ)	ص : ۲۸
۱۳- شیخ ذوالفقار علی ممنپوری	(متوفی	۱۲۸۱ ھ)	ص : ۲۹
۱۴- شیخ زکی الدین نیموی	(متوفی	۱۲۰۲ ھ)	ص : ۲۹
۱۵- شیخ سبحان علی نیموی	(متوفی	۱۲۸۷ ھ)	ص : ۳۳
۱۶- شیخ سخاوت علی نیموی	(متوفی	۱۲۷۵ ھ)	ص : ۳۵
۱۷- شیخ شجاعت علی نیموی	(متوفی	۱۲۷۴ ھ)	ص : ۴۲
۱۸- شیخ شمن نیموی	(متوفی	۱۲۵۶ ھ)	ص : ۴۳
۱۹- شیخ ضیاء اللہ ممنپوری	(متوفی	۱۱۷۵ ھ)	ص : ۴۵

۲۰- شیخ طاہر علی ممنپوری	(متوفی	۱۲۳۵ھ) ص: ۴۸
۲۱- شیخ محمد ظہور الحسن نیموی	(متوفی	۱۳۰۴ھ) ص: ۴۹
۲۲- شیخ ظہیر الدین ممنپوری	(متوفی	۱۳۰۶ھ) ص: ۱۲۲
۲۳- شیخ عبد الحکیم نیموی	(متوفی	۱۱۷۱ھ) ص: ۱۲۳
۲۴- محمد عبد الرشید فوقان نیموی	(پیدائش	۱۳۱۴ھ) ص: ۱۲۳
۲۵- محمد عبد الشکور نیموی	(پیدائش	۱۲۸۷ھ) ص: ۱۲۴
۲۶- شیخ محمد عبد العزیز نیموی	(متوفی	۱۳۰۳ھ) ص: ۱۲۴
۲۷- شیخ محمد عبد الغفور ممنپوری	(متوفی	۱۳۰۳ھ) ص: ۱۲۷
۲۸- شیخ محمد عبد القیوم	(پیدائش	۱۳۰۷ھ) ص: ۱۲۸
۲۹- شیخ عشرت علی ممنپوری	(متوفی	۱۲۷۴ھ) ص: ۱۲۹
۳۰- شیخ غلام حیدر ممنپوری	(متوفی	۱۲۴۹ھ) ص: ۱۳۱
۳۱- شیخ محمد قطب عالم نیموی	(متوفی	۱۳۱۲ھ) ص ۱۳۸
۳۲- شیخ امان اللہ نیموی	(متوفی	۱۲۶۵ھ) ص: ۱۳۹
۳۳- شیخ مدار بخش ممنپوری	(متوفی	۱۲۸۵ھ) ص: ۱۴۲
۳۴- شیخ ولایت کریم نیموی	(متوفی	۱۳۰۶ھ) ص: ۱۴۸
۳۵- محمد ہاشم ممنپوری	(متوفی	۱۲۴۹ھ) ص: ۱۵۰

اس کے علاوہ اس کتاب میں شیخ محمد عبد الغفار نیموی کے نوید عقد اور ڈاکٹر محمد حسین نیموی کی شادی کی منظوم تاریخیں ملتی ہیں۔ جو فارسی زبان میں ہیں۔ (دیکھئے ص: ۱۲۵، ۱۴۵) شیخ محمد عبد الغفار کے نوید عقد والی نظم ۴۵ اشعار پر مشتمل ہے اس کے علاوہ اردو زبان میں ایک تاریخی نظم ملتی ہے۔ جو ڈاکٹر محمد صادق نیموی کے

بنائے باغ کے موقع پر کہی گئی ہے۔ اور وہ سترہ اشعار پر مشتمل ہے۔ (ص ۲۵۱)

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علامہ نیموی کے چند قطعات یہاں درج کئے جائیں تاکہ ان کی قطعات نگاری کی قدر وقیمت اور قادر الکلامی کا اندازہ ہو سکے۔ دیکھئے شمشاد لکھنوی کا ترانۂ خیال (دیوان اول) چھپا تو علامہ نیموی نے اس کے لئے دو قطعات لکھے جن میں ایک اردو زبان میں ہے دوسرا فارسی زبان میں۔ قطعات ملاحظہ ہوں ؎

جب یہ دیوان جناب شمشاد — ہو چکا جمع بطرز احسن
خامۂ شوق نے لکھی تاریخ — ہے کلام شہ اقلیم سخن
۱۳۰۲

نازم کہ زیب و زینت ترتیب یافتہ — دیوان نور حضرت شمشاد نغز گو
صوری و معنوی سنہ اش شوق زد رقم — از ہجرت رسول ہزار و سہ صد بدو
۱۳۰۲

حضرت داغ دہلوی کا دیوان شائع ہوا تو اس موقع پر یہ قطعہ تاریخ کہا ؎

چو دیوان دوم را داد ترتیب — جناب داغ خورشید فصاحت
نہادہ آفتاب داغ نامش — کہ تاباں است از اوج بلاغت
پے تاریخ طبع روشنم شوق — بگفتا آفتاب حسن فکرت ۱۳

ممتاز شاہجہانپوری کا واسوخت شائع ہوا تو علامہ نیموی نے قطعہ تاریخ یوں لکھا ؎

مختار کا ہر کلام مختار — لکھا کیا فصیح واسوخت
جس نے دیکھا وہ بول اٹھا — بیشک لکھا فصیح واسوخت
لکھوائے شوق مصرع سال — ہے کیا اچھا فصیح واسوخت ۱۳

مندرجہ ذیل قطعات خاص طور پر لائق توجہ ہیں جن میں علامہ تیموی نے صرف تاریخ کہی ہے بلکہ صاحب کلام کے کلام پر تبصرہ کیا ہے اور اسکی اچھائی و خوبی بیان کی ہے۔ یہ قطعات طویل ہیں

دیکھئے سید نذر الرحمٰن حفیظ عظیم آبادی کے دیوان کا قطعہ تاریخ اس طرح لکھتے ہیں۔

میرے مشفق شفیق ہمدم — نذر الرحمٰن حفیظ ذی شان
ممتاز زمانہ ماہر فن — یکتائے جہاں فصیح دوراں
سر خیل سخنوران نامی — سر دفتر اہل علم و عرفاں
ان کا دیوان چھپ گیا آج — جس کے مشتاق تھے سخنداں
سبحان اللہ جس کا ہر شعر — رنگین ہے برنگ لعل جاناں
ہر حرف سواد شام گیسو — ہر لفظ بہار صبح خنداں
کیسے بلند بلند مضمون — کیا کیا معنی ہیں صورت جاں
مصرع مصرع ہے سلک گوہر — نقطہ نقطہ ہے در غلطاں
اس کی تاریخ شوق لکھو — چیدہ در نظم ہے یہ دیواں
۱۷ ۱۳

حکیم آغا حسن ازل لکھنوی کے دیوان پر قطعہ یوں لکھا ہے۹

مبارک باد اے ارباب معنی — یہ دیواں حکیم آغا حسن ہے
تخلص ہے ازل مشہور عالم — زمانہ جن کا مشتاق سخن ہے
زباں اچھی کلام اچھا نہ ہو کیوں — کہ شہر لکھنؤ ان کا وطن ہے
عجب دل کش ہے یہ گلزار رنگیں — کہ رشک لالہ و سرو سمن ہے

۹ دیوان نغمۂ ازل ۱۰۹

بیانِ حال درد لذت آگیں — نوائے طوطیِ شکر شکن ہے
جواہر بیز ہے ہر شعر نایاب — ہر اک نقطہ مگر درِ عدن ہے
سوادِ خط ہے شامِ لیلۃ القدر — بیاضِ ہر ورق صبحِ چمن ہے
معطر ہے مشامِ نکتہ سنجاں — مداد عنبریں مشکِ ختن ہے
فروغِ پرتوِ مہرِ سخن سے — خطِ جدول کہ سورج کی کرن ہے
بھرے ایسا زیورِ حسنِ معانی — مرصع نظم ہے یہ یا دولہن ہے
یہ لکھو مصرعِ تاریخ اے شوق — پسندِ خاطرِ ہر اہلِ فن ہے [1]

سید شاہ شمس الدین عظیم آبادی کی وفات پر قطعہ تاریخ اس طرح لکھا گیا ہے ؎

شاہ شمس الدین فخرِ قادری — افتخارِ اہلِ عرفان و یقین
کاسبِ اسرارِ قرآن و حدیث — عابدِ حق زاہدِ خلوت نشیں
رہنمائے سالکانِ باصفا — خضرِ راہِ دینِ ختم المرسلین
چوں شبِ سہ ز ذیقعدہ رسید — گشت بہرِ ذکرِ حق خلوت گزیں
اشتیاقِ حورِ عین روحش کشید — کرد رحلت جانبِ خلدِ بریں
عالمے شد در فراقش سوگوار — در غمش شد تیرہ گوئی روئے زمیں
خامہ من شوق تاریخش نوشت — برگزیدہ بدرِ عرفاں شمس دیں [2]
۱۹ ۱۳

خلاصہ یہ کہ علامہ نیموی کو قطعہ نگاری میں پوری دسترس حاصل تھی اور اس ضمن میں وہ ایک مستند استاد اور ممتاز شاعر کی حیثیت سے پیش کیے جا سکتے ہیں۔

[1] دیوانِ شوق: ۱۰۷ [2] دیوانِ شوق: ۱۱۱

باب ہشتم

زباندانی اور تحقیق

جیسا کہ پچھلے صفحات میں بیان کیا گیا۔ علامہ نیموی نے علمی گھرانا پایا تھا جس میں علم وادب کا ہمیشہ چرچا رہتا تھا۔ اس کے علاوہ ان کا مزاج بھی خالص علمی و ادبی تھا جس کی وجہ سے اوائل عمر ہی سے علم وادب کی معیاری اور اچھی کتابیں ان کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔ پھر جب پٹنہ غازی پور اور لکھنؤ گئے تو وہاں کے شعراء وادباء کی صحبتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں خاص طور پر اردو زبان کے رموز و نکات، محل استعمال، طریق استعمال، الفاظ کے صحیح معنی ومفہوم، محاورات اور روزمرہ کی پوری جانکاری حاصل کی۔ متقدین ومتاخرین اساتذہ شعراء کے ایسے ہزاروں اشعار یاد کر لئے جو کسی لفظ کی تحقیق میں سند کے طور پر پیش کئے جا سکتے تھے۔ اس کے علاوہ چوں کہ عربی وفارسی کے مستند اساتذہ سے فارسی اور علوم دینیہ کی تعلیم حاصل کر رہے تھے اس لئے عربی وفارسی کے وہ الفاظ اور محاورے جو اردو زبان میں مستعمل ہیں ان سب پر پوری دسترس حاصل کر لی تب انہوں نے اردو زبان وتحقیق سے متعلق مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف کیں۔

(۱) ازاحتہ الاغلاط (۲) اصلاح (۳) ایضاح (۴) سرمۂ تحقیق

علامہ نیموی نے اردو زبان وتحقیق کے میدان میں کس طرح کی خدمت

انجام دی ہے اور اس فن میں ان کا کیا مقام ہے اس کے جاننے کے لئے ضروری ہے کہ ان کی مذکورہ تصنیفات کا جائزہ لیا جائے۔ اس لئے درج ذیل سطور میں ان پر قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جاتی ہے۔

ازاحۃ الاغلاط علامہ نیموی کی سب سے پہلی معرکۃ الآراء تصنیف ہے جو فارسی زبان میں ہے۔ یہ رسالہ دراصل عربی و فارسی کے ایسے الفاظ کی تحقیق پر مشتمل ہے جو اردو زبان میں مستعمل ہیں اور جنہیں اردو داں طبقہ غلط طور پر بولتا اور لکھتا ہے۔ علامہ نیموی نے یہ رسالہ انتہائی دیدہ ریزی، جاں فشانی اور محنت شاقہ کے بعد تصنیف کیا تھا کیوں کہ اس کی تصنیف کے وقت رات رات بھر کتابیں مطالعہ کرتے، ایک ایک لفظ کی تحقیق میں سیکڑوں اساتذۂ شعرا کے کلام دیکھتے اور لغت کی اہم کتابوں کی طرف رجوع کرتے، معاصر شعراء و ادباء سے اسکی صحت و عدم صحت، طرق استعمال اور محل استعمال پر گفتگو کرتے یہاں تک کہ کوئی ایرانی عالم ہندستان آجاتا تو اس سے بھی ایک ایک لفظ کی تحقیق کرتے اور اس کا صحیح استعمال معلوم کرتے تھے چنانچہ علامہ نیموی اس رسالہ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک جگہ خود ہی فرماتے ہیں۔

"ہرچند این رسالہ جزو لیست چندا ما ہمہ ماں دانند کہ ہنگام تالیفش شبہا دود چراغ سرمۂ دیدہ ہا ساختہ ام و بسا افتاد کہ در تحقیق لفظی روزہا بہ سیر کلام اساتذہ چہ نظم و چہ نثر پرداختہ ام و نوبت بجای رسید کہ جہت تحقیق کامل در خدمت فصحای پارس کہ تازہ وارد ہند بودند شتافتم و صحبت ایشان دریافتم و خاطرم چنانکہ میخواست موی اسرارش شگافتم و مغز سخن کافتم اگر بچشم الضاف بینی این موجز لیست عجوبہ روزگار

وکوزہ ایست ردکش صد بحر زخار طالبان فن را سرمایہ ہدایت است ونظارگیان را سرمۂ بصیرت"

(ترجمہ: یہ گرچہ ایک مختصر رسالہ ہے لیکن احباب جانتے ہیں کہ اس کی تالیف کے وقت میں نے کافی شب بیداری کی ہے اور اکثر کسی لفظ کی تحقیق میں کئی کئی روز تک اساتذہ کا دیوان کھنگالا ہے کبھی ایسا بھی ہوا جب کوئی ایرانی عالم ہندستان وارد ہوا تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور کسی مشکل لفظ کی مکمل تحقیق کی اور اس کے لسانی ومعنوی رموز سے واقفیت حاصل کی اگر آپ انصاف سے دیکھیں تو معلوم ہو کہ یہ ایک عجوبہ روزگار مختصر رسالہ ہے اور جس میں دریا کو کوزہ میں بند کر دیا گیا ہے، اس سے طالبان فن کو رہنمائی اور مطالعہ کرنے والوں کو بصیرت حاصل ہوگی)

اس رسالے کی اہمیت کے سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ علامہ ٹیموی نے لغت کی اہم اور مستند کتابوں سے استفادہ کر کے جابجا ان کے حوالے دیئے ہے اور لغوی تحقیق کے ذیل میں ثبوت کے طور پر انہیں پیش کیا ہے، چند کتابوں کے نام اس طرح ہیں:

صحاح، صراح، شمس العلوم، قاموس، مصباح منیر، منتخب اللغات، تاج اللغات، منتہی الارب، کشف اللغات، فرہنگ جہانگیری، فرہنگ رشیدی برہان قاطع، سراج اللغات، چراغ اللغات، بہار عجم، نفائس اللغات، ہفت قلزم مؤید الفضلا۔

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل شعرا کے اشعار اپنی تائید یا تحقیق کے ذیل میں پیش کیے ہیں جو فارسی شاعری کی دنیا میں نہایت اہمیت کے حامل ہیں، نظامی، فیضی، حافظ، خاقانی، ملا فوقی یزدی، جامی، قاآنی، محسن تاثیر، ظہوری

میلم، سعدی، ناصر خسرو، مرزا جلال اسیر، شیخ علی حزیں، شمس الدین فقیر، ملا ہاتفی عرفی، کلیم، صائب، فردوسی، رومی، بدر چاچ، منیر، شریف طہرانی، واصف مشہدی، شفائی اصفہانی، قاسم دیوانہ، ملک قمی، عسجدی، امیر خسرو، معز فطرت صامت اصفہانی، کلیم، ملا محمد باقر فائض مازندرانی، ملا نوعی۔ اصفہانی، نظیری نیشاپوری، وحشی وغیرہ

علامہ تیموی کا انداز بیان نہایت معیاری اور تحقیقی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے انہوں نے کسی لفظ کا اعراب بیان کیا ہے، اگر اس میں محققین کا اختلاف ہے تو اس کی بھی وضاحت کر دی ہے اور دونوں طرح کے خیالات کے ثبوت میں اہل لغت اور شعرای فارسی کے اقوال یا اشعار پیش کئے ہیں، کہیں کہیں ایک ایک لفظ کی تحقیق میں آٹھ آٹھ دس دس لغت کی کتابوں کا حوالہ دیا ہے یا شعراء کے اشعار تحریر کئے ہیں، اس سے علامہ تیموی کی تحقیق کی خوبی وسعت معلومات اور اردو، فارسی، عربی میں تبحر واضح ہوتا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

لفظ حجلہ کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

"حجلہ: بفتح حا پردہ کہ برای عروس سازند از صحاح و قاموس و تاج و منتہی الارب و بہار عجم و بالضم درست نیست" [۱]

(ترجمہ: حجلہ 'حا' کے فتحہ کے ساتھ، اس پردہ کو کہتے ہیں جو دلہن کے لئے بنایا جائے دیکھئے صحاح، قاموس، تاج، منتہی الارب، بہار عجم، ضمہ کیساتھ درست نہیں ہے)

"جہد بالفتح کوشش، از صراح و منتخب اللغات و منتہی الارب و بہار عجم بالکسر درست نیست، نظامی در مخزن الاسرار گوید ؎

[۱] ازاحۃ الاغلاط ۱۲۰

دست وفا در مکر عہد مکن　　تا نشوی عہد شکن جہد کن

امیر خسرو در "لیلی مجنوں" گوید ؎

صد طرفہ سخن چو شکر و شہد　　ننمود مگر بہ مثنوی جہد

مولوی جامی در "یوسف زلیخا" گوید ؎

بشیرینی مکن ہم چوں مکن جہد　　کہ آخر نید بر پایت نہد شہد

ناظم ہروی در یوسف زلیخا گوید ؎

کہ من کردم دریں اندیشہ چوں جہد　　شدم آں شاہ معنی را ولی عہد [ع۱]

(ترجمہ: جہد فتح کے ساتھ، کوشش کے معنی میں دیکھیے صراح، منتخب اللغات منتہی الارب، بہار عجم، کسرہ کے ساتھ درست نہیں" نظامی مخزن الاسرار میں فرماتے ہیں الخ)

دیکھیے لفظ پوشاک کی تحقیق کس تحقیقی انداز اور عالمانہ طریقے سے کرتے ہیں:

"پوشاک بمعنی لباس بعض اجلہ عصر در فارسیت آں تامل دارند گویم کہ صاحب بہار عجم نوشتہ پوشاک چیزہای پوشیدن، ملا طغرئی در منشات خود استعمال کردہ اگر گوئی کہ ملا طغرا عمداً بالفاظ ہندیہ باستعمال می آورد گویم کہ جماعتی از ایرانیان بہ تحقیق ای پیوست کہ در پارسی پوشاک بایں معنی مستعمل است" [ع۲]

(ترجمہ۔ پوشاک لباس کے معنی میں ہے، بعض اجلہ عصر اس کی فارسیت میں تامل کرتے ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ صاحب بہار عجم نے پوشاک کو چھپانے والی چیز کے معنی میں لیا ہے۔ ملا طغرا نے خود منشات میں اس کا استعمال کیا ہے۔ اگر آپ کہیں کہ ملا طغرا عمداً ہندی الفاظ استعمال کرتے ہیں تو میں جواب دوں گا کہ ایرانیوں کی ایک جماعت اس بات کی تحقیق کر چکی ہے کہ فارسی زبان میں پوشاک اسی معنی میں مستعمل ہے۔)

ع۱ ازاحتہ الاغلاط: ۱۱ ع۲ ایضاً ص ۹

علامہ نیموی نے تقریباً ۳۰ جگہ اہل لغت سے اختلاف کیا ہے اور اپنی نئی تحقیق پیش کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ نیموی کا اصل تحقیقی جوہر وہیں کھلتا ہے جہاں انہوں نے کسی محقق کی تحقیق سے اختلاف کر کے اپنی ذاتی رای پیش کی ہے۔ اور پھر اپنی تحقیق کو لغت کی مستند کتابوں اور شعرا کے اشعار سے مزین کیا ہے۔ ٹیک چند بہار، صاحب غیاث اللغات اور مرزا غالب وغیرہ فارسی زبان و ادب اور خاص طور پر لغت کے مستند فاضل سمجھے جاتے ہیں تاہم علامہ نیموی نے ان کی تحقیقی کمزوریوں کو بھی بیان کیا ہے اور انہیں رد کر کے اپنی نئی تحقیق پیش کی ہے۔

اب ہم چند ایسے الفاظ کی تحقیق تحریر کرتے ہیں جہاں علامہ نیموی نے دوسرے محققین سے اختلاف کیا ہے اور اپنا تحقیقی نقطۂ نظر پیش کیا ہے:

دیکھئے لفظ زیادتی کے سلسلے میں صاحب غیاث اللغات نے لکھا ہے کہ اسکو عوام بولتے ہیں خواص کے یہاں مروج نہیں۔ علامہ نیموی فرماتے ہیں کہ یہ غلط ہے، خواص کے ہاں بھی اسکا استعمال ہے ـــ علامہ نیموی کی اصل عبارت ملاحظہ کیجئے:

" زیادتی در غیاث اللغات نوشتہ کہ بیای تحتانی زائدہ محاورۂ عوام است گویم کہ در کلام فصحا جا ہا در آخر مصادر عربیہ زیادت تحتانی است و ایں ہم از آں قبیل است۔ مرزا صائب گوید ؎	زیادتی۔ غیاث اللغات میں لکھا ہے کہ یای تحتانی کے ساتھ عوامی محاورہ ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ فصحا کے کلام میں اکثر جگہ عربی مصادر کے اخیر میں یای تحتانی کی زیادتی ملتی ہے اور یہ اسی قبیل سے ہے۔ مرزا صائب کہتے ہیں ؎
بر جسم آں قدر کہ فزودیم ہم چو شمع شد مایۂ زیادتی اشک و آہ ما	بر جسم آں قدر کہ فزودیم ہم چو شمع شد مایۂ زیادتی اشک و آہِ ما

بزیر خاک غنی را برم در دلش ـ اگر زیاتی هست حسرتی چند است[۱]

"آتش" کے بارے میں مرزا غالب نے لکھا ہے کہ تا کے کسرہ کے ساتھ اس کا استعمال صحیح نہیں لیکن علامہ نیموی فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے اور اس سلسلے میں اپنی تحقیقات اس طرح پیش کرتے ہیں۔

"آتش آنچہ جمعی از فرہنگ نگاران تغلیط فتحہ تا کردہ اند و نوشتہ اند بکسر تا مت و با دانش وغیرہ قافیہ شدہ است در یں شکی نیست کہ تخطیہ ایشان محض بے جاست اگر در کلام پارسیان تفحص کنی صد ہزار جا باغش و دلکش یابی آمدم بر اینکہ اکثری را در صحت کسرہ آں کلام است دیگراں یکسو مرزا غالب کہ در فارسی ید طولیٰ داشت می نگارد کہ قافیہ آتش با دانش ادعائیست نا دلپذیر و بعض اجلۂ عصر و نیز دیگران درایں باب تبعیت میرزا کردہ اند گویم کہ منشای آں عدم تفحص باشد نظامی گوید ؎

ہمہ کارشاں شرب و آتش گری
نگشتہ شبی گرد چالش گری

و ملا اہیری خراسانی در قطعہ این

ترجمہ:۔ آتش ۔ جن لغت نویسوں نے تا کے فتحہ کو غلط اور کسرہ کو صحیح قرار دیا ہے اور دانش وغیرہ کا قافیہ باندھا ہے۔ یہ بلاشبہ غیر مناسب ہے۔ اگر آپ فارسی شعراء کا کلام پڑھیں تو ہزاروں جگہ باغش اور دلکش کا استعمال دیکھیں گے۔ کیوں کہ اکثر فصحا کو اس کے کسرہ کی صحت میں کلام ہے۔

کچھ دوسرے حضرات خاص طور پر مرزا غالب (جو فارسی زبان و ادب میں ید طولیٰ رکھتے ہیں) نے لکھا ہے کہ آتش کا قافیہ دانش کے ساتھ ناپسندیدہ عمل ہے۔ پھر اس کی پیروی بعض اجلۂ عصر اور کچھ دوسرے اہل علم نے کی ہے میں کہوں گا کہ تحقیق کے بغیر یہ بات کہہ دی گئی ہے نظامی کہتا ہے ؎ ہمہ کارشاں شرب و آتشگری
نگشتہ شبی گرد چالش گری

ملا اہیری خراسانی نے بھی یوں کہا ہے

[۱] ازاحۃ الاغلاط ۱۶۰

بیت نوشتہ ؎

پیوند شکستگی است با عشق
چوں کسرئ حرف تای آتش

پیداست کہ ایں شعر ناطق است بر کسرئ تای فوقانی اکنوں کسی را مجال انکار کسرہ نماید۔ اما حق تحقیق آنست کہ کسرہ تا از عالم شاذ است۔[1]

لکھا ہے ؎

پیوند شکستگی است با عشق
چوں کسرئ حرف تای آتش

ظاہر ہے کہ یہ شعر آتش کے کسرہ پر دلالت کر رہا ہے۔ ایسی صورت میں کس کو مجال ہے کہ کسرہ کا انکار کرے لیکن محقق بات یہ ہے کہ تا بکسرہ شاذو نادر ہے۔[1]

لفظ "عفو" کی تحقیق میں ٹیک چند بہار اور مرزا غالب دونوں کی تحقیقات کا ذکر کرتے ہوئے اپنی تحقیق اس طرح پیش کرتے ہیں:

مؤلف البطال ضرورت (ٹیک چند بہار) نوشتہ کہ عفو بضم دوم نیز استعمال کردہ اند شیخ شیراز ؎

عفو کردم از وی عملہای زشت
بفضل خودش آدرم در بہشت

مرزا غالب در ملحقات قاطع برہان نوشتہ کہ یارب شیخ راچہ افتادہ بود کہ وچہ گونہ غفلت روی دادہ بود کہ بے ضرورت حرکت لفظ را بر گرداندہ نظر ثانی نیز نکند تا شعر ہم چناں ماند ؎

ترجمہ: مولف البطال ضرورت (ٹیک چند بہار) نے لکھا ہے کہ "عفو" فا کے ضمہ کے ساتھ بھی مستعمل ہے۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

عفو کردم از وی عملہای زشت
بفضل خودش آدرم در بہشت

مرزا غالب نے قاطع برہان کے ملحقات میں لکھا ہے کہ شیخ سعدی کو کیا ضرورت پڑی تھی اور کس طرح غفلت دبے بے پروائی کی گئی کہ بلا ضرورت لفظ کی حرکت چھوڑ دی گئی۔ اور نظر ثانی تک نہ کی گئی یہاں تک کہ شعر اس طرح ہو گیا ؎

[1] ، زاحتہ الاغلاط: ۴

از و عفو کردم عملہای زشت
بفضل خودش آوردم در بہشت

مگر در تقطیع نمی گنجد من از جانب شیخ سوگند می خورم کہ شیخ نہ آن خیال نگاشتہ است کہ کاتب پنداشتہ است و بہار روا داشتہ است گویم کہ چون میرزا با محققین ہند تعصبی داشت ہرچہ دلش خواست نگاشت۔ نسخ مطبوعہ بوستان سعدی یکسو در متعدد نسخہ ہای قلمی ہم چنان است کہ بہار آوردہ و در سند تصرف نقل کردہ بچشم دیدنی ست کہ اعتراض بر کاتب و بہار نیست بلکہ بر ہمان شیخ اقلیم سخن دانی ست کہ چرا آن نگاشت و این روا نداشت گوئی اگر ہم چنیں اصلاح روا دارند چگونہ کلام اساتذہ در سند آرند وانچہ بعض نوشتہ کہ عفو بحرکت فا بجز کلام سعدی دیگر جا نآمدہ اعتبار نشاید حکیم ناصر خسرو در خاتمہ روشنائی نامہ گوید ع

اگر سہوی بود وروی عفو کن
دریں بیہودہ کارم رفو کن ۱؎

از و عفو کردم عملہای زشت
بفضل خودش آوردم در بہشت

شاید اس کی تقطیع صحیح نہ ہو پائے۔ میں شیخ سعدی کی طرف سے قسم کھاتا ہوں کہ شیخ نے ایسا نہیں لکھا ہے جیسا کہ کاتب نے سمجھا ہے میں کہتا ہوں کہ چوں کہ میرزا غالب ہندوستانی محققین کے ساتھ تعصب رکھتے ہیں اس لئے جو کچھ دل میں آتا ہے لکھ دیتے ہیں۔ بوستاں کے مطبوعہ نسخے اور خاص طور پر قلمی نسخوں میں ایسا ہی ہے جیسا کہ بہار نے پیش کیا ہے اور سند میں تصرف کو نقل کیا ہے۔

انصاف کی نگاہ سے دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ یہ اعتراض کاتب اور بہار پر نہیں ہے۔ بلکہ اقلیم سخنداں کے شیخ سعدی پر ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں لکھا ہے اور اصلاح کیوں نہیں کی ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اگر اس طرح کی اصلاح کو روا رکھتے ہیں تو اساتذہ کا کلام سند کے طور پر کس طرح پیش کیا جا سکتا ہے جن لوگوں نے لکھا کہ عفو فا کے حرکت کیساتھ بجز کلام سعدی کسی اور جگہ نہیں آیا ہے تو یہ قابل اعتبار نہیں ہے حکیم ناصر خسرو روشنائی نامہ میں فرماتے ہیں

ع اگر سہوی ا؛

۱؎ ازاحۃ الاغلاط : ۳۵

خلاصہ یہ کہ اردو زبان میں عربی و فارسی مستعمل الفاظ کی تحقیق اور تدقیق کے لحاظ سے یہ نہایت اہم رسالہ ہے اور اردو داں طبقہ کے لئے نہایت نادر تحفہ ہے۔ اس کے مطالعے سے علامہ نیموی کی اردو و فارسی و عربی تینوں زبانوں میں گہری معلومات اور تبحر علمی کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ اور ایک محقق کی شان نظر آتی ہے۔ یہ بات بلاشبہ کہی جا سکتی ہے کہ بہار عجم کے بعد یہ واحد کتاب ہے جس میں ایک ایک لفظ کی تحقیق میں کئی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ رسالہ شائع ہوا تو پورے ملک میں اسے مقبولیت حاصل ہوئی اور اہل علم کے طبقہ میں نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ یہی رسالہ ہے جسکو دیکھ کر نواب رامپور کلب علی خاں نہایت متاثر ہوئے۔ اور قدر دانی کے خیال سے علامہ نیموی کو لکھنؤ سے رام پور بلایا۔ اور جب علامہ نیموی واپس ہونے لگے تو خلعت و انعام سے نوازا اور مزید انہیں دربار سے منسلک رہنے کے لئے ہدایت کی۔ یہی رسالہ ہے جس کو پڑھ کر مولانا ابوالکلام نہایت متاثر ہوئے اور پھر ان کے حلقہ تلمذ میں داخل ہو گئے۔ یہی رسالہ ہے جس کو پڑھ کر ملک کے نامور جرائد نے اس پر تبصرے شائع کئے۔ اور اپنی گہری عقیدت و محبت کا اظہار کیا۔ چنانچہ دیکھئے صفیر بلگرامی نے آرہ گزٹ ۸ر دسمبر ۱۸۸۸ء میں اس رسالہ کی اشاعت پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

"یہ رسالہ جناب مولوی محمد ظہیر احسن صاحب شوق نیموی عظیم آبادی حال وارد لکھنؤ کا تالیف کیا ہوا ہم تک بھی پہنچا۔ یہ رسالہ صحت اغلاط و تحقیق الفاظ عربی و فارسی میں ایک بے مثل رسالہ ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ بعد بہار عجم کے متعدد مثالوں کا ذخیرہ اس رسالے کے سوا کوئی کتاب مصطلحات میں کم پایا جائے گا۔ میں جناب مؤلف کی اس محنت کا شکریہ ادا کرتا ہوں"

اسی طرح جب یہ نسخہ تحفہ مدراس کے مدیر تک پہنچا تو جون ۱۸۹۸ء کے شمارے میں انہوں نے علامہ نیموی کی لغوی تحقیقات پر تبصرہ کرتے ہوئے اس طرح لکھا:

"اس فارسی رسالہ کے مطالعہ سے ہمیں ثابت ہوتا ہے کہ مؤلف اس کا ایک اعلیٰ درجہ کی فارسی لیاقت رکھنے والا ہے اور حد درجہ جانکاہی کی ہے۔ ملک کو اس کے مؤلف مکرمی و مخدومی مولوی محمد ظہیر احسن شوق نیموی عظیم آبادی کا احسان ماننا پڑے گا۔ جس نے غلطی کی تاریکی میں تحقیق کی روشنی دکھلائی اور ہمیں ٹھوکریں کھانے سے بچایا۔ غرض یہ رسالہ اپنے طرز میں پہلا ہے"

آخر میں ایک ایرانی عالم و شاعر عبداللہ خاکی کا ایک قصیدہ ملاحظہ کیجئے۔ جس میں انہوں نے علامہ نیموی کی زباندانی اور تحقیق کی داد دی ہے۔

ایرانی عالم عبداللہ خاکی کا قصیدہ:

صدف فخرش بود از گوہرش در لجۂ دریا　　خورد از آب نیساں قطرۂ گوہر شود پیدا
دُرے را در نظر دارم کہ باشد گوہر مکنوں　　جواہر خیز و گوہر ریز و گوہر بیز و گوہر زا
اگر ز اسرار حکمت ماہری و عقلہا داری　　ز گوش دل بشنو گویم ترا یک نکتہ زیبا
کہ بود او جوہرے در ذات استقلال خود قائم　　ہیولائیش شد و کردند بہش صورت یکتا
چو صورت صورت انسانی و ہم شکل روحانی　　ازیں صورت مرکب از ہیولا گشت و شد پیدا
تعالی اللہ از علم لدنی بود او ماہر　　نمود ادراک علم کائنات و سر ما فیہا
ز معراج اش بچرخ امکان خرق و التیام　　مقام عز و جاہش قاب قوسین ست او ادنیٰ
اگر ایں آسماں را دست قدرتش در تکاں آرد　　فتد ایں جملہ کوکب سرنگوں در قلزم افتاد
اگر خواہد بر آرد چرخ را از مرکزش بیروں　　دگر خواہد زند سہل بروی عرش در اعلیٰ
ہمیش گم دیدہ تاباں نور دیں از ال و انصارش　　کہ بودند از دل و جاں تابع حکم شہ او حی

عدالت در مقام خیر و شر از دست شاں میزان   لوای شرع پیغمبر بپا کردند در ہر جا
ز بعد شاں یکے از پیروان حکم ایشاں شد   مطیع و تابع و منقاد و حکم جاعل الاشیا
بود بر لوح صدرش نورے از انوار ربانی   برای عین حکمت سینۂ صافش بود صدرا
زقد طاعت ز دل رحمت ز ید خیر از زباں حکمت   بسینہ گنج علم کنت کنزا نور بر سیما
محیط مرکز اسلام و خط استوای دین   سپہر علم را ماہی کسمای عقل را بیضا
سخن گوئی و سخن داں و سخن سنج و سخن پرور   ظہیر احسن کہ گویندش در اقلیم سخن شعرا
بود بر ذات او فخرم وجودش را ہمی نازم   کہ در تصحیح و تحقیق لغت دارد ید طولیٰ
کتابے در لغت بنوشت و تصحیح غلط کردہ   عبارتش گہر ریز و بیانش لولوئے لالا
چو اقسام جمل وافی بیا بنگر کہ تاریخش   ز فرق نام او و ز تاج تحقیقش بود پیدا
کنوں خاکی دعائش می کند حضرت باری   کہ تا بر آسماں باشد مہ و خورشید نور افزا
فروغ آفتاب فیض او بر عالمی تابد   درخشاں نیر اقبال و علم و حکمتش بادا (۱)

اب آیئے علامہ نیموی کی دوسری اہم تصنیف اصلاح کا جائزہ لیں۔ یہ رسالہ بھی اردو داں طبقہ کے لئے نہایت نادر تحفہ ہے اور علامہ نیموی کی شاہکار تصنیف ہے اس رسالہ میں انہوں نے تعقید لفظی، حشو، مقدرات، شتر گربہ، پہلوئے ذم، متروکات املائے بعض الفاظ، تذکیر و تانیث، ایطا کی تعریف کی ہے اور اس کی تائید میں اردو زبان کے متقدمین و متاخرین شعراء کے اشعار پیش کئے ہیں۔ جا بجا جلال لکھنوی اور کچھ دوسرے زباندانوں کی تعریف سے اختلاف بھی کیا ہے اور اپنی تعریف کے ذیل میں مختلف مثالیں اور شعراء کے اشعار پیش کئے ہیں۔

اس کے علاوہ فوائد متفرقہ کے تحت اردو زبان میں جو غلط ترکیبیں مستعمل ہو گئی

(۱) یادگار وطن: ۳۹

ہیں ان کی بھی وضاحت کی ہے اور صحیح ترکیبیں بیان کی ہیں، اس کے لئے اردو قواعد لغوی تحقیقات اور شعراو کے اشعار پیش کیے ہیں۔ خاص طور سے متروکات، املائے بعض الفاظ کے عنوان کے تحت جس میں نہ صرف یہ کہ بعض الفاظ کے املا کے طریقے بتلائے ہیں بلکہ اپنی ذاتی تحقیق بھی پیش کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"اژدہام، ژ سے اور چھوٹی ہ سے لکھنا غلط ہے۔ ازدحام زای تازی وحائے حطی سے لکھنا چاہئے۔ اکسیر کو اکثیر ث سے لکھنا محض غلط ہے۔

اوس، ادھر میں متقدمین برابر واو سے لکھا کرتے تھے مگر متاخرین بھی واو کو حذف کرکے الف پر پیش دیدیا کرتے ہیں مگر میرے نزدیک واو کے ساتھ لکھنا اولیٰ ہے۔ برات کو بارات صحیح نہیں۔ پاؤں اس کا املا مختلف فیہ ہے۔ دلی والے پانو لکھتے ہیں اور ردیف واو میں لاتے ہیں اور لکھنو والے پاؤں لکھتے ہیں اور ردیف نون میں داخل کرتے ہیں۔ اور بعضے پانوں بھی لکھتے ہیں یعنی الف کے بعد بھی نون لکھتے ہیں۔"[۱]

ڈانکا۔ عوام نون سے لکھتے ہیں، اور سحر مرحوم نے بھی خندان کا افشاں کی زمین میں یہ شعر لکھا ہے ؎

جلا کر ٹھوکروں سے نقد دل مردوں کے لیتے ہیں
سحر شہر خموشاں میں بھی اب پڑنے لگا ڈانکا

مگر ڈاکو میں نون نہ ہونا ڈاکے کے بے نون ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے علاوہ نون جمہور شعرا کے خلاف ہے۔ واجد علی شاہ کے زمانے میں اس لفظ کی بحث آپڑی تھی۔ قلق، قبول، برق، طور نامی شعرا موجود تھے سب نے اتفاق

[۱] اصلاح، ۱۹

کیا کہ اس کو بے نون لکھنا چاہیے۔[1]

اس کے بعد ایطا کی تعریف ملاحظہ کیجیے جس میں ایطا کی نہ صرف تعریف کی ہے بلکہ اس تعریف پر جو شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں انھیں بیان کیا ہے اور پھر آخر میں اپنی جامع تعریف کر کے اس کی تائید میں چند مثالیں پیش کی ہیں۔

"عروضیوں نے لکھا ہے کہ ایطا تکرار قافیہ لفظاً و معنیً کو کہتے ہیں۔ اگر کھلی کھلی تکرار نہ ہو تو خفی ہے ورنہ جلی ہے۔ پہلے کی مثال آب و گلاب و دانا و بینا اور دوسرے کی مثال آنکھیں نظریں، جلا سنا وغیرہ دی ہے۔ اول کو جائز رکھتے ہیں اور دوسرے کو ناجائز لکھتے ہیں۔ اب میں کہتا ہوں کہ اس تعریف و مثال میں کئی خدشات ہیں اول یہ کہ تعریف مجہول ہے خفا اور عدم خفا کی تحدید نہ ہوئی۔ ایک ہی لفظ میں بعضوں کے نزدیک ایطای خفی ہو سکتا ہے اور بعضوں کے نزدیک جلی چنانچہ خنداں گریاں میں کسی نے ایطائے خفی لکھا ہے اور کسی نے ایطائے جلی ٹھہرایا ہے۔ دوسرے یہ کہ دانا بینا میں ایطائے خفی کہتے ہیں۔ جلا سنا نے کیا قصور کیا ہے کہ جلی قرار دیدیتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ آب و گل کو ایطا میں شامل کرنا ہی عبث ہے۔ اس لیے کہ اختلاف علمیت کے معنی مختلف ہو گئے۔ چوتھے یہ کہ اگر یہ مثالیں صحیح رکھی جائیں تو بہت سے مستند شعرا کے کلام نادرست ہو جائیں گے۔

مومنؔ ؎ پھر دل میں مرے لگی ہے آتش تالے سے برس رہی ہے آتش

---

[1] ؎ اور جو یہ راز نہانی نہ کھلا جیتے جی جی میں یہ ارمان رہا
آتش ؎ ہستی کو مثل نقش کف پا مٹا چکے عاشق نقاب شاہد مقصود اٹھا چکے

[1] اصلاح: ۲۰

ناسخ ؎ جب وادیٔ وحشت میں گزر میرا ہوا ہے
ہر ایک بگولا پئے تعظیم اوٹھا ہے

نسیم لکھنوی ؎
آتش کدہ پریوں نے بناکر پھینکا ادسے پھول سا اوٹھاکر

سحر ؎ جگناتھ نے آکے کلمہ پڑھا مسلمان جیکب فرنگی ہوا

بحر ؎ دوپٹہ وہ گلنار دکھلا گئے نئے سر سے پھر آگ بھڑکا گئے

قلق ؎ چوڑیوں کو نہ تم بڑھا رکھنا مہندی ہرگز نہ تم اوٹھا رکھنا

امیر ؎ تہنیت رعد نے چلا کے سنائی کیسی ہاں میں ہاں کوندکے بجلی نے ملائی کیسی

تسلیم ؎ دونوں کو ہٹ ہے نئی دیکھئے کیسی ٹھہرے
کون ناکام رہے کسی کی تمنا نکلے

جلال ؎ پہلو میں کسی کو بزم میں اوس نے بٹھا لیا
کیوں اے اجل ہمیں نہ جہاں سے اوٹھا لیا

داغ دہلوی ؎ سبق ایسا پڑھا دیا تو نے
دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے

شمشاد لکھنوی ؎ وہ مرا دل دکھا نہیں سکتے + عرش اعظم ہلا نہیں سکتے

یہ چند اشعار مثال کے لئے انتخاب کئے گئے ورنہ اس قسم کے سیکڑوں شعر اساتذہ کے دیوان میں موجود ہیں ان سب پر ایطائے جلی کا عیب لگانا اور قافیہ نادرست بتانا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ قاعدہ جمہور فصحا کے کلام کے تابع ہوتا ہے۔ نہ یہ کہ کلام جمہور قاعدے کا پابند ہوتا ہے۔ اب میں ایطا اور اوس کی دونوں قسموں کے جامع و مانع تعریف کرتا ہوں کہ قافیہ کا بعینہٖ لفظاً و معنیً مکرر لانا

ایطا ہے۔ اگر ایسے زوائد قافیے ٹھہرائے جائیں جو اپنی اصلی حالت پر نہ رہے ہوں جیسے رنجور، مزدور ـــــ الف فاعل یا تای مصدری یا شین مصدری ہوں جیسے دانا، بینا، شجاعت، سخاوت و کاوش و سازش یا ان کے حذف کے بعد اکثر مزید علیہ بے معنی ہو جاتے ہوں جیسے ادھر، ودھر، جدھر، کدھر، جہاں کہاں، وہاں یہاں، اس جس کس، ان جن کن یا حروف علت علامت افعال ہندی متصل بہ حرف اصلی ہوں جیسے سنا رہا، سنور رہا، سنے رہے وغیرہ تو ان سب صورتوں میں ایطائے خفی ہے ورنہ جلی ہے جیسے ہنرور، سخنور، ستم گر، فسوں گر، عقل مند، درد مند، باغہا، غنچہ ہا، محبوبان، معشوقان، آنکھیں نظریں جلتے بجھتے وغیرہ" ع[1]

اس کے علاوہ اس کتاب میں متروکات کے ذیل میں جو باتیں بتائی گئی ہیں وہ بھی نہایت مفید اور معلوماتی ہیں۔ پچاسوں ایسے الفاظ ہیں جنہیں متروک ہوتے دکھایا گیا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ متقدمین کے یہاں ان کا استعمال کس طرح ہوتا تھا اور پھر متاخرین نے اسکی ہیئت کس طرح بدل دی، ہر ایک کی مثال اردو شعرا کے اشعار سے پیش کی گئی ہے۔

علامہ نیموی نے متروکات کی بڑی اچھی بحث یادگار وطن میں بھی کی ہے۔ انہوں نے تین قسم کے متروکات تحریر کئے ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جس کو علامہ نیموی اور دیگر شعرا دونوں نے ترک کر دیا ہے۔ دوسری وہ ہے جسے دیگر شعرا نے تو ترک کر دیا ہے لیکن علامہ نیموی نے ترک نہیں کیا ہے۔ تیسرے وہ متروکات ہیں جنہیں کسی اور شاعر نے تو ترک نہیں کیا ہے لیکن علامہ نیموی نے بذات خود ترک

ع[1] اصلاح: ۲۶

کر دیا ہے ۔۔۔۔ دراصل وہ اردو زبان کی تحقیق اور شعری ذوق کے لحاظ سے اس منزل پر پہنچ گئے تھے جہاں اپنے اجتہاد سے کام لے کر کوئی مجتہدانہ فیصلہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ وہ خود ایک جگہ فرماتے ہیں:

" اسی طرح متروکات کے باب میں ہمیشہ ایک کد رہی جو لفظ برا معلوم ہوا ترک کیا اور جو لفظ میرے مذاق میں برا نہ ٹھہرے رہنے دیا۔ کہیں تقلید شعراء سے کام لیا اور کہیں اجتہاد کو دخل دیا۔ اکثر الفاظ تو ایسے ترک کئے جن کو آج کل کے اکثر یا بعض شعرائے لکھنؤ نے ترک کیا ہے۔ اور بعض لفظ ایسے بھی میں نے ترک کئے کہ جمہور شعراء استعمال کرتے ہیں اور مجھے علم نہیں کہ آیا کسی نے اس کو ترک بھی کیا ہے مگر مجھے خود برے معلوم ہوئے اور بعض الفاظ ایسے بھی ہیں کہ بعض شعرائے حال نے ترک کئے ہیں مگر اس خیال سے کہ ان کے ترک سے زبان کا حرا، نظم کی روانگی بیان کی وسعت جاتی رہتی ہے۔ میں ان کو استعمال کرتا ہوں " [1]

اب میں علامہ نیموی کے وہ متروکات تحریر کرتا ہوں جو گرچہ ان کے معاصر شعرا کے یہاں مستعمل تھے لیکن علامہ نیموی نے اپنے صواب دید، اجتہاد، اور خوش فعلی کی بنا پر انہیں ترک کر دیا تھا۔ ان کے مطالعہ سے علامہ نیموی کی زباندانی اور تحقیق کا اندازہ ہوتا ہے۔

متروکات	کیفیت
آجک ۔۔۔	یہ لفظ دوسرے شعراء کے یہاں آجا کی جگہ پر مستعمل ہے چنانچہ جلال لکھنوی نے مندرجہ ذیل شعر میں اس کا استعمال اس طرح کیا ہے،

[1] یادگار وطن: ۱۰۱

۹ کہیں آنکھوں میں آ چک نزع کی آسان ہو مشکل
نکل جائے وہ دم جو سدرہ ہے راہ میں تیری

لیکن علامہ نیموی کے یہاں یہ رکیک لفظ ہے اس لئے وہ اس کا استعمال نہیں کرتے۔

متروکات	کیفیت
آئیو، جائیو، کہیو وغیرہ	علامہ نیموی کے معاصر شعراء کے یہاں یہ الفاظ مستعمل تھے لیکن انہوں نے انہیں ترک کر دیا تھا۔ اور ان کے بجائے آنا جانا اور کہنا استعمال کرتے تھے۔
از خود رفتہ	علامہ نیموی کے نزدیک ان کے ساتھ اس کلمے کا استعمال بہتر نہیں۔ اس لئے اس کے بجائے وہ وارفتہ استعمال کرتے ہیں۔ کیوں کہ خود رفتہ کے استعمال میں بعض شعراء کو تامل ہے۔
اے بلبلو، اے زاہدو وغیرہ	علامہ نیموی ان کے بدلے میں صرف بلبلو، زاہدو وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن جب اس قسم کے منادے سے قبل صفت یا مضاف الیہ ہوتا ہے تو حرف ندا کا استعمال بہتر سمجھتے ہیں۔ جیسے اے میرے پیارے دوستو! وغیرہ
بچھا۔	علامہ نیموی کے نزدیک اس کا استعمال تشدید کے ساتھ نہایت مکروہ ہے۔
بر (بمعنی آغوش)	بعض شعراء کے ہاں اس کا استعمال پایا جاتا ہے۔ جیسے ؏ آج کل یار میرے بر میں ہے۔ لیکن علامہ نیموی کے ہاں یہ لفظ متروک ہے۔
پرُہ	بعض شعرا اس کا استعمال کرتے ہیں۔

متروکات — کیفیت

پُرُ — جیسے ع لہو سے جام دل میرا ہے اب پُرُ

علامہ نیموی کے نزدیک یہ لفظ کریہہ ہونے کے علاوہ رکیک بھی ہے اس لئے وہ اس کا استعمال نہیں کرتے لیکن دیدۂ پرنم و نہر پر آب کی صورت میں نہ رکاکت رہتی ہے اور نہ بوئے ذم اس لئے ایسی صورت میں اس کا استعمال کرتے ہیں۔

سبھوں۔ علامہ نیموی کے نزدیک سین علیحدہ کرنے سے کریہہ صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے ان کے یہاں متروک ہے۔

کاہیکو۔ علامہ نیموی کے نزدیک یہ رکیک لفظ ہے۔ اس لئے وہ اس کا استعمال نہیں کرتے۔ جبکہ دوسرے شعراء کے ہاں اس کا استعمال پایا جاتا ہے۔

مردن۔ شعرائے اردو کے ہاں مردن اور وقت مردن مستعمل ہے لیکن علامہ نیموی کے ہاں یہ غیر مستعمل ہے۔

قافیہ مردہ یا پردہ۔ عروضیوں کا اتفاق ہے کہ اگر ردی متحرک ہو تو اس کے قبل کی حرکت کا اختلاف جائز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعراء چلے کا قافیہ کھلے اور رستہ کا قافیہ شستہ باندھتے ہیں۔ لیکن علامہ نیموی اس طرح کے اختلافات کو اچھا نہیں سمجھتے اس لئے اس کو متروک قرار دیتے ہیں۔

فدائے وطن کا قافیہ دکھائے وطن۔ اس طرح کے قوافی کو علامہ نیموی پسند نہیں کرتے نہ

بہر حال مذکورہ متروکات سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ نیموی کی نظر شعری و ادبی الفاظ اور ان کی تراکیب پر نہایت گہری اور استادانہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب رسالہ اصلاح چھپ کر اہل علم کے سامنے آیا تو وہ نہایت متاثر ہوئے۔ اور ملک کے مختلف اخباروں اور رسالوں میں اس پر تبصرے شائع ہوئے۔ جن میں ان کی ادبی و تحقیقی مقام اور زبان دانی کی تعریف کی گئی۔

یہاں صرف دو تبصرے پیش کئے جاتے ہیں تاکہ علامہ نیموی کا ادبی و تحقیقی مقام واضح ہو سکے۔ اس زمانے میں لکھنؤ سے اختر اودھ کے نام سے ایک پرچہ نکلتا تھا۔ ۷ رمئی ۱۸۹۶ء کے شمارے میں اس نے اصلاح پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا

"یہ رسالہ ان نومشق کو جو دہلی اور لکھنؤ سے سیکڑوں کوس دور ہونے کے سبب یا کوئی مشفق استاد میسر نہ آنے کی وجہ سے بہت کچھ زحمتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ نہایت ہی مفید ہے۔ کیوں کہ نقائص شعری بہت وضاحت اور صفائی کے ساتھ بتائے گئے ہیں۔"

لکھنؤ سے ایک اور پرچہ نکلتا تھا جس کا نام مشیر قیصر تھا۔ اس نے ۱۸ رجون ۱۸۹۶ء کے شمارہ میں اصلاح پر اس طرح تبصرہ لکھا:

"یہ طالبان فن شعر و انشا وغیرہ کے لئے نہایت کار آمد ہے۔ اگر کوئی شخص ایک مدت تک کسی اعلیٰ درجے کے کامل و محقق کی خدمت میں رہے جب بھی ممکن نہیں کہ اس قدر فائدہ حاصل کر سکے، جتنا کہ اس بیس صفحہ کے رسالے کے دیکھنے سے ایک ساعت ہی میں حاصل کر سکتا ہے۔"

کیفیت

متروکات

پُر — جیسے ع لہو سے جام دل میرا ہے اب پُر

علامہ نیموی کے نزدیک یہ لفظ کریہہ ہونے کے علاوہ رکیک بھی ہے اس لئے وہ اس کا استعمال نہیں کرتے لیکن دیدۂ پرنم و نہر پرآب کی صورت میں نہ رکاکت رہتی ہے اور نہ بوئے ذم اس لئے ایسی صورت میں اس کا استعمال کرتے ہیں۔

سبھوں۔ علامہ نیموی کے نزدیک سین علیحدہ کرنے سے کریہہ صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے ان کے یہاں متروک ہے۔

کاہیکو۔ علامہ نیموی کے نزدیک یہ رکیک لفظ ہے۔ اس لئے وہ اس کا استعمال نہیں کرتے۔ جبکہ دوسرے شعراء کے ہاں اس کا استعمال پایا جاتا ہے۔

مردن۔ شعرائے اردو کے ہاں مردن اور وقت مردن مستعمل ہے لیکن علامہ نیموی کے ہاں یہ غیر مستعمل ہے۔

قافیہ مردہ یا پردہ۔ عروضیوں کا اتفاق ہے کہ اگر روی متحرک ہو تو اس کے قبل کی حرکت کا اختلاف جائز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعراء چلے کا قافیہ کھلے اور رستہ کا قافیہ شستہ باندھتے ہیں۔ لیکن علامہ نیموی اس طرح کے اختلافات کو اچھا نہیں سمجھتے اس لئے اس کو متروک قرار دیتے ہیں۔

فدائے وطن کا قافیہ دکھائے وطن۔ اس طرح کے قوافی کو علامہ نیموی پسند نہیں کرتے نہ

بہر حال مذکورہ متروکات سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ نیموی کی نظر شعری و ادبی الفاظ اور ان کی تراکیب پر نہایت گہری اور استادانہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب رسالہ اصلاح چھپ کر اہل علم کے سامنے آیا تو وہ نہایت متاثر ہوئے۔ اور ملک کے مختلف اخباروں اور رسالوں میں اس پر تبصرے شائع ہوئے۔ جن میں ان کی ادبی و تحقیقی مقام اور زبان دانی کی تعریف کی گئی۔

یہاں صرف دو تبصرے پیش کئے جاتے ہیں تاکہ علامہ نیموی کا ادبی و تحقیقی مقام واضح ہو سکے۔ اس زمانے میں لکھنؤ سے اختر اودھ کے نام سے ایک پرچہ نکلتا تھا۔ ۷ر مئی ۱۸۹۷ء کے شمارے میں اس نے اصلاح پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا

"یہ رسالہ ان نومشق کو جو دہلی اور لکھنؤ سے سیکڑوں کوس دور ہونے کے سبب یا کوئی مشفق استاد میسر نہ آنے کی وجہ سے بہت کچھ زحمتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ نہایت ہی مفید ہے۔ کیوں کہ نقائص شعری بہت وضاحت اور صفائی کے ساتھ بتائے گئے ہیں۔"

لکھنؤ سے ایک اور پرچہ نکلتا تھا جس کا نام مشیر قیصر تھا۔ اس نے ۱۸ر جون ۱۸۹۷ء کے شمارہ میں اصلاح پر اس طرح تبصرہ لکھا:

"یہ طالبان فن شعر و انشا وغیرہ کے لئے نہایت کارآمد ہے۔ اگر کوئی شخص ایک مدت تک کسی اعلیٰ درجے کے کامل و محقق کی خدمت میں رہے جب بھی ممکن نہیں کہ اس قدر فائدہ حاصل کر سکے، جتنا کہ اس بیس صفحہ کے رسالے کے دیکھنے سے ایک ساعت ہی میں حاصل کر سکتا ہے۔"

علامہ نیموی اور جلال لکھنوی کا ادبی معرکہ

جیساکہ اوپر بیان کیا گیا علامہ نیموی جب لکھنؤ میں زیر تعلیم تھے۔ اسی زمانے میں اردو زبان و ادب کے رموز و نکات سے بخوبی واقف ہو چکے تھے، روزمرہ، محاورات، الفاظ کے محل استعمال اور طرق استعمال پر پوری قدرت حاصل کر چکے تھے۔ یہاں تک کہ کافی تحقیق و تدقیق کے بعد الفاظ کی صحت و عدم صحت پر ازاحۃ الاغلاط کے نام سے ایک رسالہ لکھا جس میں جلال لکھنوی کی تنقیح اللغات سے جابجا اختلاف ہو گیا تھا جلال لکھنوی اس زمانے میں ہندستان کے مستند اور مشہور شعرا و ادباء میں شمار ہوتے تھے۔ وہ کب گوارا کر سکتے تھے کہ کوئی طالب علم ان کی تحقیقات سے اختلاف کرے اور ان کی ادبی خامیوں کو اہل علم کے سامنے پیش کرے۔ یہی وجہ ہے کہ جب علامہ نیموی نے ان کی بعض ادبی خامیوں کو واضح کر دیا تو وہ نہایت برافروختہ ہو گئے۔ اور ازاحۃ الاغلاط کے جواب میں تردید کے نام سے ایک رسالہ لکھ کر اپنے ایک شاگرد کے نام سے چھپوا دیا۔ اس رسالے میں نہایت گھٹیا اور سطحی انداز میں ازاحۃ الاغلاط کو نشانہ بنایا گیا تھا اور اس کی تحقیق پر بے جا تنقید کی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کا ردعمل علامہ نیموی پر بھی پڑنا ایک فطری امر تھا کیوں کہ علم و تحقیق کے میدان میں وہ خود ممتاز ہو چکے تھے اور کسی بھی اچھے سے اچھے ادیب کے مقابلے میں آنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ۱۳۰۱ھ میں تردید کے جواب میں "سرمۂ تحقیق" کے نام سے ایک رسالہ لکھا جس میں جلال لکھنوی کی خامیوں، غلطیوں اور لغزشوں کو اجاگر کیا۔ اس کے علاوہ تردید ہی کے جواب میں قدس پھر ساڑھی نے

الگ سے دو رسالے "طومار التوبیخ" اور "دنداں شکن" کے نام سے لکھے۔ سرمۂ تحقیق میں جلال لکھنوی کی ایسی علمی و تحقیقی گرفت کی گئی تھی کہ اس کے بعد جواب کی کوئی گنجائش نہ تھی، اس لئے جلال لکھنوی نے بوکھلا کر ایک دوسری حرکت کی وہ یہ کہ علامہ نیموی کی طرف منسوب کر کے ایک جعلی اشتہار لکھ کر، گلدستۂ نغمہ بہار کے فروری ۱۸۹۰ء کے شمارے میں شائع کرا دیا۔ وہ اشتہار یہ تھا:

مؤلف سرمۂ تحقیق کا مراسلہ

" میں یہ جدید رسالہ لکھ کر اور ہدیہ ناظرین کر کے نہایت نادم اور کمال پشیماں ہوں اور ہر بار اپنے اوپر نفرین کرتا ہوں کہ یہ کیا نادانی اور جہالت مجھ سے سرزد ہو گئی کہ میں ایک قصبہ کا رہنے والا اور قصبہ بھی وہ قصبہ کہ عظیم آباد کے مضافات سے ہے، لکھنؤ کے مضافات سے بھی نہیں۔ محاورات اہل لکھنؤ سے اس قدر نابلد "چھان بناں" کی جگہ "چھان بین" اکثر جگہ بول گیا ہوں اور علی هذا القیاس اور محاورے بھی ایسے میری زبان پر ہیں کہ خلاف روزمرہ فصحائے لکھنؤ ہیں۔ باوجود ایسی فضیحتوں اور عیوب کے جو شخص کہ محقق دوراں، سرآمد اردو زباں، افصح الفصحا، مشہور ہو یعنی حضرت جلال باکمال لکھنوی دام فیوضہٗ جس کو تمام سخنور ہندستان مانے ہوئے ہوں اسکی تالیفات و تصنیفات پر بے جا معترض ہو کر آپ اپنا قصباتی اور بے علم محض ہونا اہل زبان اردو، صاحبان علم پر ثابت کیا۔ لہذا اب میں خود اپنی سراسر نادانی اور سرتاپا خطا ہونے کا مقر ہوں اور ناظرین سے امیدوار عفو جرائم ہوں اور مچلکا لکھتا ہوں کہ اب کبھی ایسا امر مجھ سے وقوع میں نہ آئے گا۔

المشتہر

محمد ظہیر احسن شوق نیموی عظیم آبادی

یہ جعلی اشتہار چھپواکر جلال لکھنوی نے انتہائی حماقت کی کیوں کہ ایک تو اس کا جعلی ہونا ظاہر ہو گیا دوسرے یہ کہ ملک کے مختلف اخبار والوں نے اس ادبی بحث میں حصہ لیا اور جلال کو نہ صرف مفتری قرار دیا بلکہ علامہ نیموی کی حمایت میں مضامین لکھے۔ تیسرے یہ کہ خود علامہ نیموی تحقیق کے میدان میں کھل کر سامنے آ گئے۔ اور جہاں جہاں جلال لکھنوی نے زبان و بیان کی تحقیق میں غلطیاں کی تھیں ان پر بھرپور تنقیدیں کیں۔ اور مختلف اخبارات میں مضامین لکھے تاکہ جلال لکھنوی کی تمام علمی و تحقیقی کمزوریاں عوام اور اہل علم دونوں کے سامنے آسکیں۔

سب سے پہلے اس زمانے کے مشہور اخبار مشیر قیصر کے ایڈیٹر تپش دہلوی نے ۲۷ مارچ ۱۸۹۰ء کے شمارے میں جلال لکھنوی کی خبر لی اور اس اشتہار کا جعلی ہونا ثابت کیا۔ اس کے بعد اخبار نیر اعظم مراد آباد کے ایڈیٹر نے ۷ اپریل ۱۸۹۰ء کے شمارے میں اس کی تکذیب لکھی اور جلال لکھنوی پر لعن طعن کیا۔ مدیر اخبار نیر اعظم کا مضمون لائق مطالعہ ہے لکھتے ہیں:

اخبار مشیر قیصر سے جلال لکھنوی کی عجیب چالاکی معلوم ہوئی۔ مولوی محمد ظہیر احسن شوق نیموی عظیم آبادی نے سرمۂ تحقیق لکھ کر جلال کی چشم میں سرمہ لگایا تھا۔ سیکڑوں لاجواب اعتراض کئے، ہزاروں غلطیاں پکڑیں۔ جلال کی زباندانی کے دعوے سب گرد ہوئے۔ خوب منہ کی کھائی، کچھ جواب بن نہ پایا۔ جب جلال نے دیکھا کہ یہ تو بڑی کرکری ہوئی، شاگردوں کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہے۔ استادی کا دعویٰ ٹوٹ گیا۔ چار ناچار انہوں نے ایک عجب چالاکی کی۔ رسالہ نغمۂ بہار کو اپنے اہتمام میں لے کر اس میں جناب شوق کی طرف سے معذرت چھاپ دی۔ مؤلف سرمۂ تحقیق جو اتنی بڑی لیاقت رکھتا ہے

جس نے جلال کے تمام کلام درہم برہم کر دئے اوس کو معذرت کرنے کی کیا ضرورت تھی ایسی جعلی کارروائیوں سے جلال کی ندامت ہرگز نہیں مٹ سکتی۔ اگر کچھ ہمت تھی تو سرمۂ تحقیق کا جواب لکھ کر اپنا الزام مٹایا ہوتا۔"

اس کے بعد علامہ نیموی نے مضامین لکھنا شروع کئے اور ہر مضمون میں جلال لکھنوی کی بری طرح خبر لی اور ان کی ادبی و تحقیقی لغزشوں و خامیوں کو خوب خوب اجاگر کیا۔ جس سے نہ صرف جلال لکھنوی کی خامیاں سامنے آئیں بلکہ ادبی اور تحقیقی لحاظ سے بہت سارے الفاظ و محاورات اصلی اور صحیح شکل میں اہل علم کے سامنے آئے۔ اور زبان و ادب کے سرمایہ میں خاطر خواہ اور وقیع اضافہ ہوا۔

سب سے پہلے علامہ نیموی نے ۲۹ مئی ۱۸۸۹ء کے مشیر قیصر میں ایک مضمون لکھا اور اس میں جلال کی غلطی خود ان کے کلام اور تحریروں سے ثابت کی یہ مضمون مندرجہ ذیل الفاظ کی تحقیقات پر مشتمل ہے۔

(۱) جلال لکھنوی نے اپنی کتاب "سرمایہ زبان اردو" میں لفظ روپیہ کے بارے میں لکھا تھا "روپیا، سکہ دار چاندی کو کہتے ہیں۔ جمع اس کی فصحا روپے بولتے ہیں۔ اور یہ جو ہائے مختفی سے روپیہ لکھا جاتا ہے مؤلف ہیچدان کے عندیے میں غلط ہے"

اس کو رد کرتے ہوئے علامہ نیموی نے لکھا کہ شاید جلال صاحب نے روپیہ ہائے مختفیہ اس لئے غلط سمجھ لیا کہ یہ لفظ ہندی ہے اور الفاظ ہندیہ کے آخر میں ہائے مختفیہ نہیں لکھی جاتی۔ جیسے تارا، کلیجا اس قسم کے الفاظ بہائے مختفیہ درست نہیں، حالانکہ ایسا سمجھنا درست نہیں۔ اصل یہ ہے کہ الفاظ ہندیہ ... درست نہیں۔ لیکن اگر کوئی لفظ ہندی سے مفرس کر لیا جائے تو اس کو ...

کے ساتھ لکھنا بالکل درست ہے، یہی وجہ ہے کہ متاخرین عجم نے ہائے مختفیہ کے ساتھ روپیہ کا استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ جلال لکھنوی نے خود اپنی دوسری کتاب "گلشن فیض" میں روپیہ کو ہائے مختفیہ کے ساتھ استعمال کیا ہے چنانچہ وہ روپیہ کے بارے میں لکھتے ہیں " رای فارسی وتحتانی ہر دو مفتوح بہائے مختفیہ"

پتا نہیں جلال لکھنوی نے کس طرح جس چیز کو سرمایہ زبان اردو میں ناجائز کہا تھا یہاں جائز کر دیا ہے۔ بس کیا تھا علامہ شوق نیموی نے انکی زبردست گرفت کی اور کہا کہ جب آپ یہاں ہائے مختفیہ کے ساتھ روپیہ کا استعمال کر سکتے ہیں تو اوپر کے استعمال میں کیوں کر غلط ہو سکتا ہے۔

(۲) دوسرا لفظ "سونچنا" ہے جس کے بارے میں جلال لکھنوی نے لکھا کہ بدون نون غنہ پڑھنا یا لکھنا غلط ہے۔ علامہ نیموی نے واضح کیا کہ نون غنہ کے ساتھ اور بدون نون غنہ دونوں طرح استعمال کرنا درست ہے کیوں کہ فصحا نے لوچ کے قافیہ میں "سوچ" باندھا ہے۔ یہ لفظ سوچ بھی سوچنا کا حاصل مصدر ہے۔ اس کے علاوہ خود جلال لکھنوی نے گلشن فیض میں لکھا ہے "سوچ بسین مہملہ بواو مجہول وجیم فارسی"

جب یہاں سوچ لکھنا صحیح ہوا تو پھر لفظ سونچنا نون غنہ کے ساتھ کیوں کر غلط ہوگا۔

(۳) تیسرا لفظ غلبہ ہے، جس کے بارے میں جلال لکھنوی نے تنقیح اللغات میں لکھا کہ بسکون لام بہر صورت غلط ہے۔ اردو میں بھی اس لفظ کو لام کی حرکت کیساتھ پڑھنا چاہیئے۔ یہی درست ہے۔ اس کے برعکس جلال نے خود ایک شعر کہا جس میں اس لفظ غلبہ کو بسکون لام باندھا ہے اور وہ شعر دیوان اول ص ۲۱۵ پر اس طرح موجود ہے :-

؎ طوفان سے بیڑا نوح کا تو نے بچا دیا   فرعون پر کلیم کو غلبہ عطا کیا

یہاں لفظ "غلبہ" بسکون لام استعمال ہوا ہے کیوں کہ بحرکت لام وزن قائم نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ علامہ نیموی نے اپنے مضمون میں اس کی نشان دہی کی اور ان کی غلطی خود ان کے کلام سے ثابت کی

(۴) چوتھا لفظ خود "لفظ" ہے جس کے بارے میں حضرت جلال نے اپنی کتاب "کار آمد شعراء" میں تحریر فرمایا کہ اکثر فصحا کے نزدیک لفظ مذکر ہے اور خود وہ بھی اس کی تذکیر کے قائل ہیں۔ علامہ شوق نیموی نے کہا کہ ٹھیک ہے لیکن جب یہ مذکر ہے تو اس کی جمع آپ نے اپنے مندرجہ ذیل شعر میں یاء و نون کے ساتھ کیسے باندھا ہے جبکہ عام قاعدہ ہے کہ مذکر کی جمع یاء و نون کے ساتھ نہیں آتی بلکہ واو و نون کے ساتھ آتی ہے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

کس ترقی پر ہے حسن سخن اللہ اللہ   شوخ لفظیں ہیں دولہن معنی رنگین

علامہ نیموی نے جلال کی ایسی گرفت کی کہ وہ لاجواب ہو گئے اور پھر کچھ جواب نہیں دے سکے۔ علامہ نیموی کا تیور اس مضمون میں ملاحظہ کیجئے۔ فرماتے ہیں:

"جلال والو تم لاکھ لام باندھو، ہزار گیدڑ بھبکیاں دو، یہاں تیور میلے نہیں ہو سکتے۔ تم کو بھگا دینا کچھ ٹیڑھی کھیر نہیں۔ معرکہ مار لینا کوئی بات نہیں جس وقت میر الکلک شیر نیستاں ڈکارتا ہوا ٹوٹ پڑے گا، پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑے گا دھاک بندھ جائے گی۔ رن بول اٹھے گا، دم بھر میں تم تتر بتر ہو جاؤ گے۔ میدان سنسان نظر آنے لگے گا۔"

پھر مضمون کے اخیر میں فرماتے ہیں:

جلال والو تم نے پورہ بی دیہاتی شوق نیموی کا کمال دیکھا۔ آج کیسی

خبر لی، قلعی کھل گئی۔ ممکن نہیں کہ تم آنکھوں میں دھول ڈال دو، تل کی اوٹ پہاڑ، کچھ تاویل کرکے جان بچاؤ۔ آج تمہیں لوہا ماننا پڑے گا۔ اور حضرت جلال کی غلطیوں کا اقرار کرنا ہوگا۔"[1]

کئی مہینے گذر گئے مگر حضرت جلال کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا، جواب دیتے بھی تو کیسے گرفت سخت تھی اور انہیں کے کلام سے ان کی غلطیاں دکھائی گئی تھیں۔ سکوت کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ تقریباً تین مہینے بعد علامہ نیموی نے ۸ر اگست ۱۸۹۰ء کے مشیر قیصر میں ایک دوسرا مضمون لکھا جس میں مندرجہ ذیل الفاظ کی غلطیوں کی نشان دہی کی۔ اور جلال سے جواب طلب کیا۔

(۱) جلال لکھنوی نے "تنقیح اللغات" میں لکھا تھا کہ غل بمعنی غوغا جو متعارف ہے مشہور ہے کہ یہ لفظ ہندی کا ہے عربی اور فارسی میں اس معنی میں نہیں آتا۔ حالاں کہ غل بمعنی شور و غوغا۔ شعرائے پارسی کے کلام میں موجود ہے۔

ملا نظامی "ہفت پیکر" میں لکھتے ہیں:

بر نشستہ ہزار دیو بہ دیو ... از در و دشت بر گرفت غریو

[illegible] جائے سبزہ و گل ... غول در غول بود و غل در غل

یہاں آخری مصرعہ میں لفظ غل آیا ہے جس کے معنی جلال لکھنوی نے شور و غوغا لکھا ہے علامہ نیموی نے فرمایا کہ یہ غلط ہے، کیوں کہ غل عربی لفظ ہے جس کے معنی طوق کے ہیں اور اس کی جمع اغلال آتی ہے۔ [illegible] کے شعر میں بھی غل کا لفظ [illegible] کے معنی میں مستعمل ہے [illegible] شکل [illegible] ہوتی ہے اور غل کی [illegible] [illegible]

ہے اسی مشابہت کی بنا پر یہ دونوں الفاظ لائے گئے ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ صحرا کی ہیبت ناکی اور خوف ناکی ایسی تھی کہ بجائے سبزہ غول بیابانی اور بجائے گل طوقِ آہنی نظر آتے تھے۔ اس سلسلے میں علامہ تمنوی کا اسلوب اور لب ولہجہ قابل دید ہے آپ بھی ملاحظہ کیجیے، فرماتے ہیں:

"اے سبحان اللہ سلف سے لے کر خلف تک کوئی ان معنوں میں غل کی فارسیت ثابت نہ کر سکا مگر باکمال صاحب کی تحقیق کا کیا کہنا کہ نظامی ایسے مسلم الثبوت شاعر کی سند دیدی مگر اتنا نہ سمجھے کہ غل کے معنی طوق کے بھی ہیں اور مدور ہونے کے سبب سے گل کو طوق کے ساتھ فی الجملہ مشابہت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ صحرا ایسا خوفناک و پر بلا تھا کہ بجائے سبزہ سینکڑوں غول بیابانی اور گلوں کے بدلے لاکھوں طوق آہنی نظر آتے تھے"[۱]

(۲) جلال لکھنوی نے دوسری بحث لفظ چھ (۶) عدد کے بارے میں کی اور اس کی تفصیل اس قدر مغلق اور پیچیدہ انداز میں لکھی کہ اصل مطلب ہی خبط ہو گیا علامہ تمنوی نے بڑے دل چسپ انداز میں اس بحث کو "یادگار وطن" میں لکھا ہے۔ قارئین کی دل چسپی کے لئے وہ یہاں بعینہ نقل کیا جاتا ہے۔

"جلال لکھنوی سرمایہ زبان اردو میں لکھتے ہیں:

چھ جیم فارسی مخلوط الہا اور ہائے مظہرہ کے ساتھ عدد معروف زبان ف شش ع (عربی) ستہ اور کبھی اس لفظ کو بجائے ہائے مظہرہ ہائے مختفیہ کے ساتھ بھی بول جاتے ہیں اور فصیح یہی ہے یعنی ہائے مظہرہ کی جگہ ہائے مختفیہ کے ساتھ بولنا........" اور گلشن فیض میں یوں ارشاد ہوتا ہے:

ع[۱] یادگار وطن: ۵۵

" چھ جیم فارسی مخلوط الہا مفتوح بہائے ہوزہ" عدد لیست مشہور فاشش

ع ستہ چنانکہ شیخ امداد علی بحر گوید ؎

چھ لاکھ جبرئیل کے پر ہیں تو رشک کیا   دو ہاتھ آدمی کو بھی ہیں دو کٹورہ پر

دگاہے در آخر ایں لغت بجائے ہائے مظہرہ" ہائے مختفیہ آرند یعنی ہائے غیر ملفوظ د فصیح ہمیں است، یعنی بجائے ہائے مظہرہ بہائے مختفیہ خواندن۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ہمارے باکمال صاحب کا کیا کہنا کہ ایسے پیچیدہ اور لاینحل مطلب کی ہندی چندی کر کے اور اٹھارہ دفعہ یعنی یعنی کہہ کے اچھی طرح سمجھا دیا۔ شاباش! فارسی ہو تو ایسی ہو، مضمون ہو تو ایسا ہو۔ بہرکیف یہ تو پوچھئے کہ جس ہندی لفظ کا کوئی لہجہ ایسا ہو کہ اس کو گاہ گاہ بول جاتے ہیں اور مشہور دوسری طرح ہے وہ بلا وجہ فصیح کیوں ہونے لگا۔ آپ کا یہ فرمانا کہ یوں بھی بول جاتے ہیں اور اس کو فصیح بتانا طرفہ ماجرا ہے خیر اس کو بھی جانے دیجئے۔ یہاں تو ایسی بات لکھی ہے کہ مکتب کے لڑکے بھی ہنستے ہیں۔ طفل دبستاں تک جانتے ہیں کہ سرمہ، سرمایہ لالہ، پیالہ کی ایسی ہی ہائے مختفیہ کہلاتی ہے اور کوہ، انبوہ، راہ، ماہ، شہ، رہ گنہ، سیہ کی ایسی ہا ہای ملفوظ بولی جاتی ہے۔ اب حضرت باکمال استاد کہلائے ماضی و حال سے یہ پوچھئے کہ چھ بہائے ملفوظ بروزن مہ و رہ و شہ تو اچھے بھی نہیں بولتے آخر کس جنگل کی زبان ہے۔ اور مزہ تو یہ ہے کہ بحر کے شعر سے اس کا بہائے ملفوظ ہونا ثابت فرماتے ہیں۔ ایک تو کڑوا کریلا دوسرے نیم چڑھا۔

جناب عالی! کیا چھ۔ رہ، شہ و مہ وغیرہ کے قافیے میں پڑا ہے جو بہائے ملفوظ کہا جاتا ہے۔ یہاں بھی بہائے مختفیہ ہے۔ اس کی تشریح ہم سے سنئے کہ اس لفظ میں چھ کا فتحہ کبھی دبی زبان سے بولا جاتا ہے جیسے ع ساتھ اس کے چھ لاکھ آدمی تھے۔

اور کبھی کھینچ کر پڑھا جاتا ہے۔ بحر کے شعر میں چہ یا شباع فتحہ باندھا ہے جیسے
ع همه با هوا و هوس ساختی۔ میں همه کی حرکت هم باشباع بندھی ہے
اس اشباع سے یہ لفظ ہائے ملفوظ نہیں کہلائے گا۔ کیوں کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ کوہ
ستوہ، رہ، تہ کی ایسی "ہ" ہائے ملفوظ کہلاتی ہے۔ افسوس کہ کمال صاحب
کو آج تک بابِ ریش وغش ہائے ملفوظ و ہائے مختفیہ میں فرق معلوم نہیں۔۔۔"

(۳) حضرت جلال نے اپنی کتاب "سرمایہ زبان اردو" میں ہونٹ کی تحقیق
کرتے ہوئے لکھا:

"اس لفظ کے آخر میں جو بعضے ہائے مخلوط التلفظ بڑھا کر ہونٹھ بولتے
ہیں اور لکھتے ہیں مؤلف ہیچمدان کے عندیے میں نادرست ہے۔"

جلال لکھنوی نے یہاں بھی ایک بڑی غلطی کی کیوں کہ شروع میں یہ لفظ ہائے مخلوط
التلفظ بڑھا کر لکھا اور پڑھا جاتا تھا۔ لیکن بعد میں بعض شعرا نے ہائے مخلوط
التلفظ ترک کر دیا اور ہونٹ لکھنا پڑھنا شروع کر دیا۔ اور اب دونوں
طرح مستعمل ہے اس لئے ہونٹھ کو غلط نہیں کہہ سکتے۔ چنانچہ شعرا کے دواوین میں
یہ لفظ اسی طرح مستعمل ہے۔ اور ردیف الہا کے تحت اس کو استعمال بھی کیا گیا
ہے، اسی بنا پر علامہ شوق نیموی نے اپنے مضمون میں جلال کی اس رائے کو غلط
قرار دیا اور مندرجہ ذیل اساتذہ کا کلام بطور سند کے پیش کیا ؎

ناسخ: اے گل جو تو نے پان چبا کر دکھائے ہونٹھ
حسرت سے کیا ہی غنچۂ گل نے چبائے ہونٹھ

قلق: دانتوں سے جب کہ اس گل تر کے دبائے ہونٹھ
بولا کہ صاحب اپنے سے سمجھو پرائے ہونٹھ

۱۴ ستمبر ۱۸۹۹ء کے مشیر قیصر میں علامہ نیموی نے پھر ایک مضمون لکھا جس میں انہوں نے جلال لکھنوی کی مندرجہ ذیل لغزشوں کی نشان دہی کی اور ان کی تاریخی، لغوی اور لسانی غلطیوں کو اہل علم کے سامنے پیش کیا:

۱۔ جلال لکھنوی نے تنقیح اللغات ص ۷ پر ارژنگ کے سلسلے میں فرمایا کہ ارژنگ ایک نقاش تھا جو مانی کا معاصر تھا۔ اس کے ثبوت میں امیر خسرو کی مثنوی "خسرو شیریں" کا مندرجہ ذیل شعر پیش کیا ؎

بقصر دو ستم مانی و ارژنگ　　　طراز سحر می بستند بر سنگ

مثنوی میں یہ شعر شیریں کی زبان سے کہلوایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے دربار میں فن نقاشی کے مانی اور ارژنگ جیسے ماہر موجود ہیں جنکی نقاشی بے مثل ہے

شیریں کی زبان سے ادا ہونے پر جلال لکھنوی کو غالباً دھوکہ ہوا کہ ارژنگ مانی کا معاصر تھا حالاں کہ بظاہر اس کا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔ کیوں کہ شیریں صرف یہ کہتی ہے کہ اس دور کے نقاش اپنے وقت کے مانی اور ارژنگ ہیں۔ اس شعر سے یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ دونوں میں سے کوئی شیریں کے زمانہ میں تھا یا اس کے محل کی تعمیر میں نقاشی کا کام کرتا تھا۔ اس لئے اس شعر سے معاصرت ثابت کرنا بالکل غلط ہے۔ حضرت جلال سے اس کا صحیح مفہوم سمجھنے میں تاریخی غلطی ہوئی۔ چنانچہ علامہ شوق نیموی نے اس پر گرفت کی اور اپنے مضمون میں بحث کرتے ہوئے طنزاً لکھا:

"اس شعر سے دونوں کا ہمعصر ہونا تو ضرور ثابت ہوتا ہے کیوں کہ اگر ہمعصر نہ ہوتے تو مل جل کر شیریں کا محل کیوں کر بناتے۔ بلکہ یہ بھی فرما دیجئے کہ شیریں بھی ان کے ہمعصر تھی۔ اب کچھ دنوں کے بعد جلال کے نام لیوا فرمائیں گے کہ ہمارے باکمال صاحب نے یہ شعر فرمایا ہے ؎

قیس سے دشت جنوں میں کہ جلال　　　آگے آگے چل میری زنجیر کھینچ

قیس اور حضرت جلال دونوں معاصر تھے اور آپ کو جو کبھی دشت جنوں میں پھرنے کا اتفاق ہو گیا تھا تو قیس سے مدد مانگی تھی ع بریں عقل و دانش بباید گریست ہزار

۲۔ حضرت جلال نے تنقیح اللغات ص ۵ میں لفظ "عقیل" سے بحث کرتے ہوئے لکھا: "عقیل بمعنی عاقل جو متعارف ہے۔ صحت کے مخالف ہے۔ کتب لغات معتبرہ میں یہ لفظ بمعنی مذکور نہیں پایا جاتا۔۔۔"

تعجب ہے کہ جلال لکھنوی نے ایسی مہمل بات کیسے کہہ دی کیوں کہ عقیل بمعنی عاقل صحیح و درست ہے یہ فعیل کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے جو فاعل کے معنی میں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ عقیل نام رکھتے ہیں جو عاقل کے معنی میں آتا ہے۔ رحیم، کریم، نصیر، سمیع وغیرہ اسی قبیل کے الفاظ ہیں۔ علامہ شوق نیموی نے اپنے مضمون میں اسکی بھی خبر لی اور بڑے ہی چبھتے ہوئے انداز میں لکھا:

"بندہ نواز! اگر جناب عقیل لکھنوی سن لیں گے تو ناک بھوں چڑھانے لگیں گے جناب عالی! آپ نے حضرت مسلمؓ کے باپ کا نام عقیل سنا ہو گا، آخر اس نام کی کوئی وجہ تسمیہ ہے یا نہیں۔ کاش آپ نے منتخب اللغات ہی کو دیکھ لیا ہوتا۔ اس میں صاف لکھا ہوا ہے کہ نام پسر ابی طالب کہ دانا تر بود بہ نسبت قریش۔۔۔"

۳۔ جلال لکھنوی نے گلشن فیض میں ص ۲۲۴ پر پیٹ کی بحث میں لکھا:

"پیٹ بہ تحتانی مجہول شکم و بہ تحتانی معروف پشت۔۔۔۔"

مطلب یہ کہ پیٹ کے لفظ کو یای مجہول کے ساتھ پڑھا جائے تو شکم کے معنی میں ہے اور اگر یای معروف کے ساتھ پڑھا جائے تو پشت کے معنی میں ہے ـــــ معلوم نہیں

اتنی بڑی غلطی جلال لکھنوی کیسے کر بیٹھے۔ کیوں کہ سب جانتے ہیں کہ پشت کو پیٹھ کہتے ہیں، پھر یہ اپنی رائے کی تائید میں کوئی ثبوت بھی پیش نہیں کر سکے۔

علامہ شوق نیموی نے جلال لکھنوی کی اس رائے کی بڑے مضحکہ خیز انداز میں تردید کی اور لکھا: "طفل دبستاں تک جانتے ہیں کہ پشت کی ہندی پیٹھ ہے نہ کہ پیٹ بر وزن بیٹ۔ باکمال صاحب پیٹ اور پیٹھ دونوں کو ایک ہی کیا چاہتے ہیں۔ آخر استادی کس دن کام آئے گی؟ دیکھو جناب ہلال لکھنوی ردیف الہا میں فرماتے ہیں: ؎ جو بعد مرگ بھی یاد آگئی تمہاری پیٹھ زمین سے نہیں لگنے کی پھر ہماری پیٹھ

ہلال کا نام امیر علی خاں تھا۔ جناب رشک کے شاگرد تھے، جلال ابتدا سے انہیں سے اصلاح سخن لیتے رہے۔ استاد کے ساتھ مناسبت پیدا کرنے ہی کے لئے ہلال کی وزن پر جلال تخلص بھی رکھا۔ اگرچہ بعد میں شاگردی سے بھی انکار کر دیا جو ایک الگ بحث ہے۔"

۴۔ الفاظ کے علاوہ ضرب الامثال اور محاورات میں بھی حضرت جلال سے بڑی فاش غلطیاں ہوئی ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنے بڑے شاعر اور ادیب ہوتے ہوئے ایسی بڑی بڑی غلطیاں کیسے کر بیٹھے۔

دیکھئے ایک مثل ہے" ہاتھی ہزار لٹیگا جب بھی سوا لاکھ ٹکے کا۔" حضرت جلال نے اپنی کتاب "گلشن فیض" اور "سرمایہ زبان اردو" دونوں میں اس مثل کو اس طرح نقل کیا ہے" ہاتھی ہزار لٹے پھر لاکھ من کا" اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ جلال لکھنوی نے اس مثل کو صحیح طور پر نہیں سمجھا، اور اگر صحیح سمجھا تھا تو اس کی نقل کرنے میں صحت کا خیال نہیں رکھا۔ چنانچہ علامہ شوق نیموی نے طنز آمیز لہجہ میں لکھا:

"اس مثل کی تراش خراش لفظوں کی بندش ہی چلا رہی ہے کہ جلال پورہ کی زبان ہے ورنہ فصحا یوں بولتے ہیں" ہاتھی ہزار لٹیگا جب بھی سوا لاکھ ٹکے کا۔

ہر شخص کا مذاق سلیم دونوں میں فرق نکال سکتا ہے کہ کون فصیح ہے اور کون قبیح ۔۔۔"

۵۔ "رفو چکر ہونا" ایک مشہور محاورہ ہے، جس کو بھاگنے اور فرار ہونے پر بولتے ہیں۔ مثلاً زید رفو چکر ہو گیا۔ یعنی فرار ہو گیا۔ شروع سے اس کا یہی معنی مراد لیا گیا ہے اور اسی معنی میں یہ مستعمل ہے، لیکن حضرت جلال نے اس کا دوسرا معنی بیان کیا جو آج تک کسی نے نہیں بتایا چنانچہ انہوں نے اپنی کتاب "سرمایہ زبان اردو" ص ۲۰۲ میں اس معنی پر بحث کرتے ہوئے لکھا:

"رفو چکر ہونا" کسی کا سرگرداں و حیراں ہونا ۔۔۔۔ انتہیٰ۔

غور کیجئے کہ بھاگنے اور سرگرداں ہونے کے معنی میں آسمان زمین کا فرق ہے اور کسی طرح سے ان دونوں میں مناسبت پیدا نہیں کی جا سکتی۔

اسی طرح الفاظ، محاورات اور امثال وغیرہ کے غلط استعمال اور غلط معنی کی بے شمار مثالیں حضرت جلال کی کتاب میں موجود ہیں۔ بعض بعض جگہ تو تذکیر و تانیث اور اس کے استشہاد میں ایسی غلطیاں نظر آتی ہیں کہ انہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

چھان بین کی بحث

مذکورہ الفاظ و محاورات کی تحقیق کے علاوہ چھان بین اور جگنی و جگنو کے سلسلے میں جلال لکھنوی اور علامہ شوق نیموی کے درمیان زوردار بحث چلتی رہی اور دونوں فریق کی طرف سے مختلف دلیلیں پیش کی جاتی رہیں لیکن اس میں بھی جیت بالآخر علامہ نیموی کو ہوئی، اسی بحث کا خلاصہ ملاحظہ کیجئے،

حضرت جلال نے لکھا تھا کہ اصل محاورہ "چھان بنان" ہے۔ جس کو فصحاء لکھنو اسی طرح بولتے ہیں۔ "چھان بین" غلط ہے۔

اس کے بعد علامہ شوق نیموی نے کتاب لکھی تو واضح کیا کہ "چھان بین" غلط نہیں صحیح ہے۔

اور اکثر فصحا نے اس کا استعمال کیا ہے۔ جب یہ تحقیق جلال لکھنوی کی نظر سے گذری تو نہایت برافروختہ ہوئے، کیوں کہ اس سے ان کی استادی پر دھبہ آرہا تھا۔ حالاں کہ برافروختگی کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی، کیوں کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ تحقیق کا میدان ہے اس میں جو زیادہ محنت اور تلاش و جستجو کرے گا، وہ زیادہ صحیح نتیجہ تک پہنچے گا۔ علامہ نیموی اس سے پہلے کئی علمی مسائل میں اپنا لوہا منوا چکے تھے۔ اس باب میں بھی نہایت تحقیق کے بعد اپنی رائے پیش کی تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ شروع میں اہل دہلی "چھان بین" بولتے تھے اور اہل لکھنو "چھان بنان" استعمال کرتے تھے۔ لیکن بعد میں اکثر فصحا لکھنو چھان بنان ترک کر کے چھان بین ہی استعمال کرنے لگے تھے۔ جلال لکھنوی نے اپنی کتاب میں تیس برس پہلے کی زبان لکھی تھی، جب لکھنؤ میں چھان بنان کا رواج تھا۔ زبان و بیان کے لحاظ سے بعد میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان سے انھیں بحث نہیں تھی۔ چنانچہ جلال لکھنوی اپنے احباب کی مجلسوں اور نجی گفتگوؤں میں اس کا اعتراف بھی کرتے تھے جس کا انکشاف اخبار آزاد لکھنؤ نے ۲۵ اکتوبر ۱۸۸۹ء کے شمارہ میں اس طرح کیا:

"حضرت جلال کے لغت میں اغلاط ہیں، اس میں کچھ شبہ نہیں ہے۔ ہم سے اور حضرت جلال سے بارہا زبانی بات چیت ہوئی اور انھوں نے نہایت سچائی اور صفائی سے کہہ دیا کہ میں نے تیس برس ادھر کی زبان لغت میں لکھی ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ بول چال میں جو تغیر ہوا ہے اس کی نسبت حضرت جلال کو دعوی نہیں ہے۔"

لیکن علامہ نیموی کے مقابلے میں ہار ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ اور نہ ان کے سامنے اعتراف کرنے کے لئے آمادہ تھے۔

جگنو و جگنی کی بحث

اب آیئے جگنو و جگنی کی بحث ملاحظہ کیجیے،
ہم سب جانتے ہیں کہ اردو میں ایک لفظ جگنو ہے۔
جس کے معنی کرمک شب تاب کے ہے۔ اس کے علاوہ اس کا ایک اور معنی ہے جسکو اردو زبان کے فصحا و ادبا نے استعمال کیا ہے، اور اس کو صحیح مانا ہے۔ وہ معنی زیور کے ہے، چوں کہ جگنو میں ایک خاص قسم کی روشنی ہوتی ہے اسی مناسبت سے محبوب کے گلے کے زیور کو بھی "جگنو" کہتے ہیں۔ کیوں کہ اس میں بھی روشنی ہوتی ہے دل چسپ بات یہ ہے کہ چھوٹے زیور کو "جگنی" اور بڑے زیور کو جگنو کہتے ہیں۔
اس کا استعمال شعرا کے علاوہ بیگمات اودھ بھی کرتی تھیں۔ اور جگنو کے اس معنی و مفہوم اور جگنو و جگنی کی تفریق کو تسلیم کرتی تھیں۔

اس سے کسی بھی اہل زبان کو اختلاف نہیں تھا، لیکن سب سے پہلے جلال لکھنوی نے اس سے اختلاف کیا اور ایک نیا شوشہ چھوڑا کہ جگنی زیور اور جگنو کرمک شب تاب کو کہتے ہیں۔ جگنو کو زیور کے معنی میں استعمال کرنا غلط ہے۔ چنانچہ انہوں نے "سرمایۂ زبان اردو" میں لکھا:

"بعضے زیور مذکور یعنی جگنی کو جگنو بواو معروف بولتے ہیں۔ پس مؤلف ہیچ مداں کو بنا بر محاورۂ فصحا لکھنو کے اس کی صحت میں کلام ہے۔ البتہ جگنو کرمک شب تاب کے معنی پر صحیح ہے۔"

جلال لکھنوی اپنے دور کے مستند اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ زبان وادب کے سلسلے میں ان کی رائے فیصلہ کا درجہ رکھتی تھی۔ جب انہوں نے "جگنو و جگنی" کے بارے میں اپنا فیصلہ سنا دیا تو کسی کی کیا مجال کہ کسی طرح لب کشائی کرتا یا ان کے فیصلہ پر نظر ثانی کرتا۔ اس وقت ہندستان میں شعراء و ادباء کی اچھی خاصی تعداد موجود

تھی لیکن سب خاموش تھے۔ سب سے پہلے علامہ شوق نیموی اس میدان میں اترے اور نہایت تحقیق و تدقیق کے بعد جلال لکھنوی کا جواب دیا۔ جس وقت "سرمایۂ زبان اردو" منظر عام پر آئی تھی۔ اسوقت علامہ شوق نیموی لکھنؤ ہی میں زیر تعلیم تھے اور تعلیم ختم کر کے گھر واپس ہونے والے تھے، اپنے ادبی ذوق اور کثرت مطالعہ کی بنا پر اردو زبان و ادب میں کمال تبحر حاصل کر چکے تھے۔ جب جلال لکھنوی کی مذکورہ کتاب میں جگنو و جگنی کی تحقیق ان کی نظر سے گذری تو نہایت متعجب ہوئے۔ انہوں نے لکھنؤ کے زبان دانوں سے مزید تحقیق کی۔ معلوم ہوا کہ جگنو زیور کو بھی کہتے ہیں۔ تحقیق جاری رکھی، یہانتک کہ ۱۶؍ اکتوبر ۱۸۸۹ء کے مشیر قیصر میں ایک مضمون لکھا جس میں جلال لکھنوی کی کئی غلطیوں کی نشان دہی کی۔ یہاں اس کا وہ حصہ پیش کیا جاتا ہے جو جگنو و جگنی سے متعلق ہے۔ لکھتے ہیں:- ——— جناب عالی!

"جگنی و جگنو دونوں صحیح ہیں۔ رند سے

سر کا دوپٹا شب کو جو گردن کے پاس سے
جگنو کی طرح ہار کا جگنو چمک گیا۔

جب علامہ نیموی کا یہ مضمون شائع ہوا تو سب سے پہلے اخبار "آزاد لکھنؤ" کے ایڈیٹر منشی احمد علی شوق جگوری نے ۲۵؍ اکتوبر ۱۸۸۹ء کے شمارے میں قلم اٹھایا۔ اور ایک مضمون لکھا جس میں اپنے آپ کو علامہ شوق نیموی کا دوست ظاہر کیا۔ اور ان کی رای کی تردید کی۔ اس مضمون کی متعلقہ عبارتیں ملاحظہ کیجیے۔

"بعض جگہ ہمارے دوست مولوی ظہیر احسن صاحب نیموی نے زیادتی پر کمر کسی۔ حضرت جلال نے جگنی اور جگنو میں فرق بیان کیا۔ تو مولوی صاحب نے اس فرق کو اڑا کر جگنی اور جگنو دونوں کو حضرت جلال کی ضد میں صحیح کہہ دیا۔"

اس مضمون میں ایڈیٹر موصوف نے جلال لکھنوی کی زوردار لفظوں میں تائید و حمایت کی۔ اور مزید اس طرح لکھا:

"تاہم جگنو و جگنی کا فرق جو حضرت جلال نے لکھا ہے وہی صحیح ہے۔ رند کے کلام سے حضرت نیموی جگنو کی سند لاتے ہیں۔ ان کو یہ تحقیق کرنا چاہیے کہ رند کی گنتی مستند اساتذہ میں ہے یا نہیں۔ جہاں تک ہم واقف ہیں، نہیں ہے۔ رند کے ہاں اغلاط بہت ملیں گے۔ یہی سبب ہے کہ رند کو نہ پہلے کسی نے مستند مانا ہے اور نہ آج مانتا ہے۔ آتش، ناسخ، صبا، وزیر، امیر ان کے کلام کی سند ہو تو ٹھیک ہے۔ آج کلیم، امیر، علی میاں ماہر یہ لوگ سند کے قابل موجود ہیں۔ مگر ان کے یہاں کہیں جگنی اور جگنو دونوں ایک ہی معنی پر نہ ملیں گے۔ اس وقت دیوان ہمارے سامنے نہیں ہے لیکن ہماری یاد اگر خطا نہ کرتی ہو تو خواجہ وزیر کا مصرع ہے ع

کہیں اڑ جائے نہ جگنی تیری جگنو ہو کر

گو قافیہ میں نہیں ہے مگر کتابت جگنی کی شہادت ہے۔ اس کے علاوہ لکھنؤ موجود ہے زیور کے معنی میں فصحا جگنی بولتے ہیں۔ اور کرمک شب تاب کے معنی میں جگنو۔ اور یونہی صحیح ہے۔ اس صورت میں حضرت نیموی کا اعتراض حضرت جلال پر نہیں ہو سکتا اور نہ یہ قول صحیح ہو سکتا ہے کہ جگنی اور جگنو ایک ہی معنی پر دونوں صحیح ہو سکتے ہیں۔

اس مضمون میں ایڈیٹر موصوف نے ایک طرف جلال لکھنوی کی پورے طور پر حمایت کی۔ ان کی تحقیق کو صحیح ثابت کیا، تو دوسری طرف علامہ شوق نیموی کی خوب خبر لی اور ان کی تحقیق کو غلط قرار دیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ تغلیط دوستانہ انداز میں کی گئی تاکہ قاری سمجھیں کہ علامہ نیموی کے یہ کوئی دوست ہیں۔ لیکن ان کی سند کو غیر مستند قرار دے کر دوسرے شعراء کی جو ایک طویل فہرست کی اور ان کے کلام سے

ثبوت طلب کیا تھا تو اس سے پورے طور پر واضح ہو گیا کہ یہ درحقیقت علامہ نیموی کے مخالف اور جلال لکھنوی کے حمایتی ہیں۔

ایڈیٹر موصوف نے اس مضمون میں علامہ نیموی کے ساتھ منشی قیصر کے ایڈیٹر تپش دہلوی کو بھی مخالف کیمپ میں شامل کیا اور دعوت مبارزت دی، چنانچہ اسی مضمون میں تپش دہلوی کو متنبہ کرتے ہوئے لکھا:

"ہم کو امید ہے کہ ایسے صریحی اغلاط پر حضرت منشی قیصر خود نوٹ دے کر ہمارے نیمی دوست کو اور ملک کو واقف کر دیا کریں، اس لئے کہ ایسے مضامین سے فی نفسہ غلط بول چال کا صحیح ہونا مقصود ہے نہ یہ کہ صحیح بول چال غلط ہو۔ حالاں کہ موجودہ حالت کے ساتھ ہم کو کیا کسی بات کی امید نہیں ہے کہ ہمارے دوست نیمی لکھنؤ کی زبان جانتے ہیں اور اس کی صحت کر سکتے ہیں، ہاں وہ علم میں جلال سے اچھے ہیں اور صرف اس رستے پر رہیں تو اچھے رہ سکتے ہیں......"

مضمون کا یہ حصہ پڑھ کر بظاہر یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ ایڈیٹر موصوف نے اظہار حقیقت کا فریضہ انجام دیا ہے اور جناب تپش دہلوی کو نہایت مخلصانہ مشورہ دیا ہے حالاں کہ ایسی بات نہیں ہے۔ بلکہ حضرت تپش کے خلاف ایک چیلنج ہے۔ کیوں کہ تپش دہلوی دہلی اسکول کے نمائندہ تھے جہاں جگنو زیور کے معنی میں پھر جگنو بڑے زیور اور جگنی چھوٹے زیور کے معنی میں مستعمل تھا۔ علامہ شوق نیموی اگرچہ لکھنؤ اسکول سے قریب تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کے بعض مسائل میں دہلوی اسکول کی بھی پیروی کرتے تھے اور جگنو کے مسئلے میں تو پورے طور پر دہلی اسکول کی نمائندگی کر رہے تھے، اس لحاظ سے مذکورہ مضمون علامہ شوق نیموی اور تپش دہلوی، دونوں کے لئے کھلا ہوا چیلنج تھا چنانچہ پہلے تپش دہلوی میدان میں آئے اور منشی قیصر ۳۰ اکتوبر ۹۸ء کے

شمارے میں مذکورہ مضمون کے جواب میں اس طرح لکھا:

"ہم اپنے معزز دوست آزاد کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ اڈیٹر ممبر قیصر آپ کی اس عنایت کا شکریہ ادا کرتا ہے اور عرض کرتا ہے کہ بلاشک بعض بعض باتوں میں ہمارا اور شوق نیموی کا اختلاف ہو جاتا ہے، مگر نہایت افسوس کہ جگنی اور جگنو کے باب میں میری تحقیق اس پایہ کی نہیں ہے کہ میں اس سے اختلاف کرسکوں بلکہ اتفاق ہی کرتے بنتی ہے، کیوں کہ جہاں تک راقم نے اس ہفتہ میں بھی لکھنؤ کے شرفاسے تحقیق کیا۔ مجھ کو یہی معلوم ہوا کہ جگنو اور جگنی دونوں بولتے ہیں۔ مگر آپ کی تحقیق کو بھی غلط نہیں کہہ سکتا۔ غالباً ایسا ہی ہوگا جیسا کہ آپ اور حضرت جلال فرماتے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے معزز ہم عصر کو اس باب میں معذور سمجھیں گے۔ تحقیق مزید محلات کے لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ فی زماننا جگنی کو جگنو نہیں بولتے۔ چھوٹے بڑے ہر قسم کے جگنی کو جگنی ہی کہتے ہیں اور جگنو بجز کرمک شب تاب کے ان کی اصطلاح میں اور کسی چیز کو نہیں کہتے۔ اس واسطے زیور معروف کے معنوں میں جگنو بیگماتی زبان میں متروک ٹھہرا۔ مگر مکرر تحقیق کیا گیا کہ عموماً شہر میں تو بھی بہت سے لوگ جگنو بولتے ہیں۔"

ایڈیٹر موصوف نے مذکورہ مضمون میں کئی باتوں کی وضاحت کی۔ ایک تو یہ کہ ان کی تحقیق علامہ شوق نیموی کی تحقیق کے پایہ کی نہیں ہے اس لئے ایسی محقق بات نہیں کہہ سکتے جیسی علامہ نیموی کہتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اہل دہلی بھی جگنو اور جگنی کو اس معنی و مفہوم میں استعمال کرتے ہیں جس معنی و مفہوم میں علامہ شوق نیموی کہتے ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ ان کی تحقیق پر معلوم ہوا کہ اہل لکھنؤ بھی جگنو زیور کے معنی میں استعمال کرنے لگے ہیں۔ بہرحال یہ علمی بحث رفتہ رفتہ زور پکڑنے لگی۔ اور دونوں کیمپ (جلال لکھنوی و شوق لکھنوی) میں سوال و جواب اور تحقیق و تدقیق کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہانتک کہ

جلال لکھنوی کی حمایت میں مدیر آزاد کے علاوہ نصرت علی خاں نصرت اور کچھ دوسرے اہل علم میدان تحقیق و تدقیق میں کود پڑے اور جلال لکھنوی کی تائید و حمایت میں مضامین پر مضامین لکھنے لگے۔ اب علامہ شوق نیموی اور ان کے متعلقین کے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ جلال کیمپ کا جواب دیں اور اپنے دعووں کو مدلل کر کے پیش کریں۔ چنانچہ اس سلسلے میں علامہ نیموی کے ایک شاگرد واصل عظیم آبادی نے پہل کیا۔ اور ایک مضمون مشیر قیصر مورخہ ۲۰ نومبر ۱۸۸۹ء میں لکھا جس میں جلال کیمپ پر اعتراض کیا کہ جگنو کے سلسلے میں علامہ نیموی نے جب رند کا شعر پیش کیا تو حضرت جلال چراغ پا ہو گئے، اور ان کی طرف سے کہا گیا کہ وہ غیر مستند ہیں لہذا ان کا کلام قابل سند نہیں ہو سکتا، لیکن خود جلال لکھنوی نے جھم کی تذکیر کی سند حضرت رند کے کلام سے پیش کیا ہے۔ یہ کیسے ہو گیا، جو رند آپ کے لئے قابل سند ہو سکتے ہیں وہی رند علامہ شوق نیموی کے لئے نا قابل سند کیوں کر ہو سکتے ہیں، یہ تو سراسر زیادتی اور ناانصافی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے شعرا نے بھی جگنو کو زیور کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ چنانچہ معمولی تلاش و جستجو سے دیوان افسوس میں ایک شعر مل گیا جو اس طرح ہے ؎

شب کو یاد آئے اگر اس کے گلے کا جگنو جو شرارہ ہے میری آہ کا جگنو ہو جائے

اس کے علاوہ مشیر قیصر کے ایڈیٹر خاموش بھی تحقیق میں لگے رہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے لکھنؤ کے معزز اور مستند اہل علم سے رابطہ قائم کیا۔ بیگمات اودھ کے یہاں معتمد عورتوں کو بھیج کر دریافت کرایا اور اس طرح پوری تحقیق کے بعد انہوں نے مشیر قیصر میں ایک بیان شائع کیا۔ وہ یہ تھا:

"اس ہفتہ میں کئی معزز رئیسوں کے علاوہ پانچ بیگمات سے ان کے محلوں میں عورتوں کو بھیج کر دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ہم لوگ بھی جگنو بولتے ہیں۔ اس سے

جگنو جگنی دونوں کا صحیح ہونا ثابت ہو گیا۔ جلال کی تحقیق ناقص ثابت ہوئی حضرت آزاد اپنی تغلیط واپس لیں۔"

اس بیان کے بعد جگنو جگنی کا تحقیقاتی معاملہ بالکل صاف ہو گیا۔ اب مزید کسی استشہاد کی ضرورت باقی نہیں رہی لیکن چوں کہ مدیر "آزاد" لکھنو نے مستند شعراء کی ایک فہرست تحریر کی تھی اور ان کے کلام سے سند طلب کی تھی، اس لئے علامہ نیموی کے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ ان کے کلام سے سند پیش کریں چنانچہ علامہ نیموی نے سب سے پہلے جناب ماہر لکھنوی کے نام ایک خط لکھا جن کا نام مستند شعرا کی فہرست میں تھا اور ان سے جگنو کے بارے میں دریافت کیا۔ جناب ماہر لکھنوی نے اس خط کا جو جواب دیا وہ نہایت دلچسپ اور اہم ہے اسلئے قارئین کی دلچسپی کے لئے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

خط جناب ماہر لکھنوی بنام علامہ شوق نیموی

مجمع الفضائل دام لطفہٗ۔ بعد سلام مسنون کے التماس یہ ہے کہ عنایت نامہ پہنچا مطلب مندرجہ معلوم ہوئے۔ شعرا لکھنؤ نے جگنو اور جگنی دونوں صورتوں سے اس لفظ کو نظم کیا ہے۔ میری رائے میں بھی استعمال لفظ مذکور کا دونوں طور پر صحیح ہے۔ موافق آپ کے لکھنے بغور معائنہ عنایت نامہ دو شعر نظم کئے ہیں ؎

بخت کا میرے ستارہ ہے جگنو تیرا ۔۔۔ کبھی آیا نہ چمکتا ہوا آنکھوں کو نظر

سہیل عکس ہے اس کے گلے کے جگنی کا ۔۔۔ ہلال طوق کا اس مہ جبیں کے پرتو ہے

حررہ السید مہدی حسین ماہر عفی عنہ ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۰۷ھ

لکھنو۔ محلہ پاٹا نالہ

جب یہ خط علامہ نیموی کے یہاں پہنچا تو انہوں نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ اس خط کی اشاعت کی جائے کیوں کہ اس میں علامہ نیموی کی تحقیق کی توثیق کی گئی تھی اور جگنو۔جگنی کے بارے میں وہی رائے دی گئی تھی جو علامہ نیموی کی رای تھی۔ چنانچہ واصل عظیم آبادی نے اس خط کی روشنی میں ایک مضمون لکھا اور مشیر قیصر مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۸۸۹ء کے شمارہ میں وہ شائع کیا گیا۔

اس خط کی اشاعت سے جلال لکھنوی کو بڑا دھچکا لگا۔ کیوں کہ ان کی رائے کی تردید خود لکھنو کے ایک دوسرے مستند شاعر کے شعر سے ہو رہی تھی۔ اور ان کی لکھنویت کو ٹھیس پہنچ رہی تھی۔ دوسری طرف علامہ شوق نیموی کی تحقیق اور علم وفضل کا بڑا شہرہ ہوا اور ان کی زباں دانی اور تحقیق کا ہر طرف چرچا ہوا۔

اس کے علاوہ بیڈھب عظیم آبادی نے ایک اور کام کیا وہ یہ کہ مدیر آزاد لکھنو نے جن شعراء کی فہرست طلب کی تھی اور جنکی اسناد پیش کرنے کا مطالبہ کیا تھا انہیں شعراء کے دواوین وکلیات کا مطالعہ کرنا شروع کیا اور جو سندیں ملیں انہیں مشیر قیصر مورخہ ۱۱ دسمبر ۱۸۸۹ء کے شمارے میں ایک مضمون کی شکل میں شائع کیا۔ مندرجہ ذیل سطور میں ان سندوں کو نقل کیا جاتا ہے تاکہ قارئین کو بھی علامہ نیموی کے ادبی تبحر کا اندازہ ہو سکے۔

(۱) والی رام بو حضرت ابر لکھنوی کے شاگرد تھے، انہوں نے جگنو اس طرح استعمال کیا ہے ؎

کھائیں گے شب وصل رکاوٹ کی ادا پر
ہیرے کی کنی وہ جو ہے جگنو میں تمہارے

(۲) حضرت خورشید اس طرح کہتے ہیں ؎

ملا تھا جو اک دن وہ گل رو گلے سے — چلی آتی ہے پھولوں کی بو گلے سے
اٹھالوں میں آنکھوں کا تارا سمجھ کر — اتارے جو وہ ماہ جگنو گلے سے

(۳) جناب رسا لکھنوی کا شعر بھی ملاحظہ ہو۔

عاشقوں کے بخت کا اختر بھلا کوئی تو ہو　　گر گلے میں آپ کے جگنو نہیں جگنی تو ہو

ان تمام دلائل و شواہد کے بعد حضرت جلال لکھنوی کی حامیوں کی ہمت نہ رہی کہ پھر مقابلے کے لئے میدان میں اتریں۔ بالآخر شکست مان لی اور علامہ شوق نیموی کی تحقیق اور زبان دانی کا سکہ پورے علمی طبقہ پر جم گیا۔

بابِ نہم

علامہ نیموی ادباء و شعراء کی نظر میں

ہم پچھلے صفحات میں علامہ نیموی کی شاعری اور خصوصیات شاعری پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے۔ اس کے علاوہ ان کی زباندانی پر بھی گفتگو کر چکے۔ ان تمام مباحث سے یہ بات بخوبی واضح ہو گئی کہ علامہ نیموی اردو زبان کے ایک مستند شاعر، نامور زبان دان اور محقق تھے یہی وجہ ہے کہ انہیں شعری و تحقیقی دنیا میں کافی مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی اور شعراء و ادباء نے ان کی ادبی و تحقیقی فضل و کمال کا کھل کر اعتراف کیا۔

کسی شخص کے علمی مقام کو جاننے اور پرکھنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اسکے بارے میں مختلف اہل علم کے جو خیالات و تاثرات ہیں وہ قاری کے سامنے پیش کئے جائیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ علامہ نیموی کے شعری و ادبی کارناموں سے متاثر ہو کر جن شعراء و ادباء نے اپنے گراں قدر خیالات پیش کئے ہیں وہ تقریباً زیادہ تر محفوظ ہیں لیکن یہاں ان تمام شعراء و ادباء کے تاثرات نقل کرنا کوئی زیادہ سود مند نہیں اسلئے صرف چند اہم شخصیات کے خیالات تحریر کئے جا رہے ہیں تاکہ علامہ نیموی کی شعری و ادبی خدمات کی قدر و قیمت ہمیں پوری طرح معلوم ہو سکے۔

اساتذہ کی نظر میں

تذکرہ اور تاریخی کتابوں میں عام طور پر ایسے اہل علم ملتے ہیں جن کی قدر دانی اور ان کے علم و فضل کا

اعتراف یا تو ان کے مرنے کے بعد ہوا یا اگر ان کی زندگی میں ہوا تو اخیر عمر میں کیوں کہ عام طور پر ایک اہل علم کا علمی جوہر یا تو اخیر عمر میں کھلتا ہے یا اس کے مرنے کے بعد قدر دان پیدا ہوتے ہیں ایسے اہل علم معدودے چند ہیں جنکی علمی برتری اوائل عمر ہی میں ظاہر ہو گئی ہو اور اس کے قدر دان نہ صرف اس کے معاصرین بلکہ خود ان کے اساتذہ ہوں۔

علامہ نیموی بھی انہیں معدودے چند اہل علم میں ہیں جن کی شعری و ادبی خوبی اور علمی برتری کے قائل ان کے اساتذہ اور معاصرین دونوں تھے، چنانچہ دیکھئے علامہ نیموی ابھی لکھنؤ میں زیر تعلیم تھے کہ ۱۳۰۲ھ میں مثنوی نغمۂ راز لکھی اور اس کا ایک نسخہ اپنے شفیق استاد شمس العلماء مولانا سعید حسرت عظیم آبادی کی خدمت میں بھیجا تو انہوں نے اس کو پڑھ کر ایک خط کے ذریعہ اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور ایسے تعریفی جملے تحریر کئے جو علامہ نیموی کے لئے سرمایۂ افتخار ہیں۔

سعید حسرت عظیم آبادی کا تاثر — فرماتے ہیں:

یگانہ زمن ماہر ہر علم و فن سلمہ اللہ ذو المنن

بعد اہدائے ہدیہ سلام مسنون و اشتیاق لقائ مسرت مشحون واضح خیر محبت مکنون باد کہ مثنوی نغمۂ راز سراپا سوز و گداز طبع زاد آن عندلیب زمزمہ پرداز گلشن ناز و نیاز معشوقان تنازه و عاشقان جان باز با نوشتۂ محبت سرشتہ نہم ذی قعدہ روز چہار شنبہ بوقت عصر بسبیل ڈاک رسیدہ۔ دامن نظارہ را پر از گلہائے رنگا رنگ و جیب را مملو از نغمہ ہای خوش آہنگ گردانیدہ۔ دیروز آن مثنوی را از اول تا آخر دیدم بسیار محظوظ گردیدم از صفائے بندش و روانی الفاظ و نزاکت معنی و لطافت مضامین ہرچہ باید

دارد۔ مع هذا درد که جان اشعار عاشقاں است از ہر شعر آں می بارد چنانچہ هنگام دیدنش اشک از چشم بارید و ایں گهر ہا نثار آں تکلم دل کش گردید۔ للہ درہم للہ درکم، لبسی ممنون الطاف آں عزیزم شدم کہ بسیر ایں گلستاں ہمیشہ بہار دریں موسم خزاں بدستیاری ایشان بپائے نظر درآمدم ؏

ای وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی

محمد سعید عفی عنہ ۱۷ ذی قعدہ روز جمعہ ۱۳۰۳ھ[1]

شمشاد لکھنوی کا تاثر:- جناب محمد عبدالاحد شمشاد لکھنوی اردو زبان کے مشہور شاعر اور علامہ نیموی کے استاد ہیں جب ان کے ہاں مثنوی نغمہ راز پہنچی تو انہوں نے درج ذیل قطعہ تاریخ لکھ کر بھیجا جس میں علامہ نیموی کی شاعری اور اسلوب بیان کی تعریف کی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ظہیر احسن کہ با شوق است معروف | بجو یہای رنگار نگ موصوف
نوا سنج گلستان فصاحت | ترنم ریز بستان بلاغت
چمن پیرائے باغ نکتہ دانی | بہار افزای گلزار معانی
نہال بوستاں خوش مقالی | گلے از گلشن نازک خیالی
چو کرد ایں نامۂ نایاب تصنیف | کہ بیرون است اوصافش ز توصیف

پے سالش دلم شمشاد گفتا

تعالی اللہ کتاب روح افزا[2]

تسلیم لکھنوی کا تاثر:- حضرت تسلیم لکھنوی بھی اردو کے مشہور شاعر اور علامہ نیموی کے استاد ہیں۔ انہوں نے اپنے شاگرد کی اس طرح تعریف کی

---

[1] یادگار وطن: ۹۴ [2] نغمہ راز: ۱۱

ہے ؎

بارک اللہ اے ظہیر احسن | مجمع علم و ماہر ہر فن
مثنوی لکھی کیا نئی تم نے | ساحری شاعری میں کی تم نے
وہ فصاحت زباں میں رکھی ہے | وہ بلاغت بیاں میں رکھی ہے
دل ہی جس کا مزہ اٹھاتا ہے | شعر جس لبوں تک آتا ہے
اوج بخشا کمال کو کیا کیا | دی بلندی خیال کو کیا کیا
سیر نے اک مزا دیا دل کو | نقش حیرت بنا دیا دل کو

بہر تاریخ کلک کی ہے یہ لئے
وہ کیا دل پسند نغمہ ہے

حبذا چوں شوق ممتاز جہاں | زد رقم ایں مثنوی بے مثال
خامۂ تسلیم تاریخش نوشت | مثنوی دلکش و سحر حلال [۱]

یہ تو علامہ نیموی کے زمانہ طالب علمی کی بات تھی جوان کی زندگی کا ابتدائی دور تھا۔ ایسے ابتدائی دور میں ان کے اساتذہ کرام کا ان کے بارے میں تعریفی و توصیفی کلمات کہنا ہی ان کے ادبی و شعری فضل و کمال کا ضامن ہے۔ لیکن ایک عرصہ کے بعد جب ان کا دیوان شائع ہوا تو اس موقع پر بھی ان کے اساتذہ نے اپنے قلبی تاثرات کا اظہار کیا اور ان کے علمی و ادبی فضل و کمال کا کھل کر اعتراف کیا، چنانچہ حضرت تسلیم لکھنوی فرماتے ہیں ؎

ہوا طبع صد شکر دیوان شوق | سراپا دل آرا ہمہ دل پذیر
ہوا دیکھ کر شاد دل نے مرے | کہا واہ کیا خوب فکر ظہیر

ہر اک سطر میں زلف لیلیٰ کا رنگ — بیاض ورق رشک ماہ منیر
پئے سال تسلیم لکھو یہی — کہ واللہ دیوان چھپا بے نظیر[۱]

مولانا محمد عبدالاحد شمشاد نے بھی مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ کہا ہے جس میں نہ صرف دیوان شوق پر اپنا خیال ظاہر کیا ہے بلکہ ان کی تمام تصنیفات پر اپنا تاثر پیش کیا ہے۔ وہ قطعہ تاریخ ملاحظہ کیجئے :-

از ظہیر احسن کہ مشہور است شوق — شہرۂ علم و ہنر ہر جا بپا
کرد تصنیفات شتے در علوم — ہر کتابش در فنے شد رہنما
در ازاحہ کرد سقم عامیاں — دور از الفاظ صحت اسما
کرد در ایضاح اصلاح سخن — سرمۂ تحقیق در چشم رجا
یادگارے ہست از وے یادگار — نیز بنگالہ ہم از تالیفہا
نغمۂ راز از صریر کلک او — شد بشکل مثنوی ذوق آزما
او شعلہ در جید تقلید او فگند — تا فتہ حبل المتین تامین را
رد سکین ہست بر اعدائے فقہ — بر کمال زور طبع او گوا
ہست تذئیل و مقالہ کاملہ — در ثبوت قول ارباب صفا
کرد او آغاز آثار السنن — جدا ہر نکتہ اش معجز نما
فقہ نعمانی مدلل کردہ است — از حدیث حضرت خیر الورا
حیف جز دو حصہ ننوشت و مرد — وا دریغا حسرتا وا حسرتا
کلیاتش نیز بے تدوین بماند — بود ہر شعرش عروس دلربا
آنچہ ماند از دست برد روزگار — جمع کردش مولوی نور الہدیٰ

۱؎ دیوان شوق : ۱۲۴

اهتمام طبع آں ھم میکند اجرایں محنت ورا بخشد خدا
بھر سال طبع آں شمشاد گفت
نالۂ محمود نظم جان فزا[1]
۱۴ ۲۶

معاصر شعراء و ادباء کی نظر میں: علامہ نیموی کے اساتذہ کے تاثرات کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب ان کے معاصر شعراء و ادباء کے تاثرات بھی پیش کر دیئے جائیں، جو انہوں نے ان کی مختلف ادبی و تحقیقی کتابوں کی طباعت کے بعد تحریر کئے ہیں کیوں کہ کسی اہل علم کی علمی قدر و قیمت متعین کرنے میں ان کے معاصرین کے خیالات نہایت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں. یہاں ہم چند اہم شعراء و ادباء کے خیالات تحریر کرتے ہیں۔

داغ دہلوی کا تاثر یہ بات پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ نواب رام پور کلب علی خاں کے یہاں جب علامہ نیموی پہنچے تو حضرت داغ دہلوی وہاں موجود تھے اور علامہ نیموی کا قصیدہ سن کر بہت متاثر ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ علامہ نیموی کی دوسری تصنیفات مطالعہ کر کے ان کے علم و فضل کے نہایت معترف تھے، چنانچہ ۱۳۱۲ھ میں جب علامہ نیموی نے سوز و گداز کا ایک نسخہ حضرت داغ کی خدمت میں بھیجا اور اس پر قطعہ تاریخ لکھنے کی گزارش کی تو حضرت داغ نے جواباً لکھا:

"اے زیب آرائے بزم کمال محقق بے مثال۔ دام عنایتکم
میں چھ مہینے تک ہم رکاب حضور بندگان عالی کے سفر میں رہا۔ اس دورے

---

[1] دیوان شوق: ۱۲۶

میں آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ سواری مبارک بلدہ واپس آئی۔ شیر کے شکار سے نجات پائی تو شعر کی طرف توجہ ہوئی۔ حسب ارشاد قطعہ تاریخ حاضر ہے۔ اس کی رسید سے مطلع فرمائیں۔ غزل دیکھ کر کیا دل خوش ہوا۔ اچھوں کی سبھی باتیں اچھی ہوتی ہیں۔ ہمیشہ کار لایقہ سے مع کلام تازہ کے مسرور فرماتے رہیے۔ فقط[1]

اس کے بعد حضرت داغ کا وہ قطعہ تاریخ ملاحظہ کیجیے جو انھوں نے مثنوی سوز و گداز کے سلسلے میں کہی ہے۔ اور دیکھیے انھوں نے علامہ نیموی کے علمی و شعری کمال کا کس طرح اعتراف کیا ہے ؎

مثنوی جس کا نام سوز و گداز — اس سے بہتر نہیں فسانۂ شوق
حضرت شوق کی ہے یہ تصنیف — باعث رونق زمانۂ شوق
معدن طبع میں ہے گوہر عشق — مخزن دل میں ہے خزانۂ شوق
انہیں اشعار کی زمیں وہ ہے — جس میں پیدا ہوا ہے دانۂ شوق
اس سے لبریز بادۂ جام شوق — اس سے آباد عیش خانۂ شوق
تو بھی لکھ داغ مصرع تاریخ — سنو دل سے یہ ہے ترانۂ شوق[2]

امیر مینائی کا تاثر

حضرت امیر مینائی ہندستان کے مشہور شاعر ہیں۔ انھوں نے مثنوی نغمۂ راز کی طباعت پر مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ کہا ہے جس میں اس مثنوی کی بے حد تعریف کی گئی ہے ؎

جواہر مضامین کے لاکھوں بھرے ہیں — بلاغت کی کان آج یہ مثنوی ہے
امیر اس کی تاریخ میں نے یہ لکھی — فصاحت کی جان آج یہ مثنوی ہے[3]

ع[1] یادگار وطن: ۱۰۰ ع[2] نغمۂ راز: ۷۰

عبد العلی آسی مدراسی کا تاثر

مولانا محمد عبد العلی آسی مدراسی ہندستان کے مشہور فاضل اور اردو زبان کے معروف شاعر ہیں، انھوں نے دیوان شوق کی طباعت پر مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ کہا ہے جو خاصا طویل ہے اور جس میں علامہ نیموی کے شعری و ادبی کمال کا نہایت کھل کر اعتراف کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

بحمد للہ کہ با صد ساز و ساماں — چھپا احسن ظہیر احسن کا دیوان
وہ دیوان شوق کا ذوق اس سے ظاہر — وہ دیوان ذوق کا شوق اس میں پنہاں
وہ دیوان مرکز ادوار تبئین — وہ دیوان نقطۂ پرکار تبیاں
وہ دیوان مصدر آثار خوبی — وہ دیوان منظر انظار خوباں
وہ دیوان مطلع انوار معنی — وہ دیوان منبع اسرار عرفاں
وہ دیوان ساحری اور سحر کا دل — وہ دیوان شاعری اور شعر کی جاں
وہ دیوان قرۂ چشم غزل گو — وہ دیوان درۂ تاج غزل خواں
وہ دیوان شاعروں کی دل کا مقصد — وہ دیوان ماہروں کے جی کا ارماں
وہ دیوان کیا ہے حرز بازو دل — وہ دیوان کیا ہے تعویذ رگ جاں
وہ دیوان ہے بیاض نور ضیا — وہ دیوان ہے سواد چشم حوراں
وہ دیوان صاحب دیوان سے جس کی — سخن گوئی کا جوہر ہے نمایاں
وہ یعنی حضرت ظہیر احسن سخنور — سخن سنج و سخن فہم و سخن داں
وہ شوق نیموی علامہ فن — وہ ذوق معنوی کے عین اعیاں
بہار آرائے گلزار معنون — چمن پیرائے آب و رنگ عنواں
نصیحت اور وصیت میں تھے سعدی — بلاغت اور فصاحت میں تھے سحباں

عروض و قافیہ املاء و انشاء — ہر اک فن میں تھے استاد زباں داں
فن حکمت میں حکمت انکی لونڈی — شفا ان کی غلامی میں تھی ہر آن
کہاں اب ایسا علامہ کہ حاصل — ہو اس کو علم ابداں علم ادیاں
ہے اس دیوان سے انکی شاعری بھی — کمال اوج پر خورشید تاباں
ہر ایک بیت اس کی رشک بیت ابرو — ہر اک شعر اس کا شعرائے درخشاں
سواد خط میں روشن نور مضمون — سیہ بادل میں جیسے برق جولاں
بلاغت کے جواہر کا خزانہ — فصاحت کے نظائر کا گلستاں
ہر اک نقطہ ہر اک کلمہ ہر اک لفظ — در افشاں گوہر افشاں لولو افشاں
ہے پیدا شوق کی ہر اک غزل سے — پیام ذوق وصل جان جاناں
جو پوچھی غیب سے آسی نے تاریخ — ندا آئی ظہیر احسن کا دیوان [۱]

علامہ نیموی نے ۱۷ رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ میں انتقال کیا۔ ان کے انتقال سے پوری علمی و ادبی دنیا کو صدمۂ عظیم پہنچا تھا کیوں کہ ان کی موت درحقیقت علم و ادب کی موت تھی۔ اس لئے مختلف اہل علم اور شعرا و ادبا نے غم کے آنسو بہائے اور ماتم کناں ہوئے۔ یہاں خاص طور پر مولینا عبد العلی آسی مدراسی اور احسن مارہروی کے اشعار تحریر کئے جاتے ہیں جن میں نہ صرف اظہار غم ہے بلکہ علامہ نیموی کے فضل و کمال کا اعتراف بھی موجود ہے۔

عبد العلی آسی فرماتے ہیں ؎

صد حیف ظہیر احسن شوق احسن دوراں — ناگاہ جواں مرد کہ چوں گل بہ چمن بود
ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد — ایں ہم یکی از دور نو چرخ کہن بود
در نیمۂ آدینہ و ہم رمضاں — ہم در دہ نیمی وطنش گور و کفن بود

[۱] دیوان شوق: ۲۲۲

یا روی درخشندہ و باراں درخشاں | مہر فلک شعر و مہ چرخ سخن بود
ہم در فقہا واقف احکام شرائع | ہم در علما عالم آیات و سنن بود
افصح بمبانی بدو ابلغ بمعانی | اکمل بکمالات اہم در ہمہ فن بود
ہم پایۂ خاقانی و ہم رتبۂ سعدی | ہم مفخر قاآنی و ہم فخر زمن بود
در مدح سخن سنجی او ناطقہ لال است | چوں شمع بزم شعرا جلوہ فگن بود
با شعر و سخن ذات وی از وحدت ارواح | یک راح و دو پیمانہ و یک روح و دو تن بود
ہم ظاہر و باطن دلش آئینۂ صفت صاف | ہم با ہمہ و بے ہمہ در سر و علن بود
در ندوہ حل سخن و نادی تحقیق | چوں بدر درخشندہ بہ پروین و پرن بود
آں یار وفادار کہ در خلوت و جلوت | ہم راز و ہم آہنگ و ہم آوازۂ من بود
افسوس صد افسوس کہ ناگہ اجلش برد | روزیکہ گزشت او شب یلدای حزن بود
زد مصرع تاریخ وفاتش رقم آسی | علامہ سخن نامی دوران زمن بود[1]

احسن مارہروی کا تاثر

احسن مارہروی ہندستان کے مشہور اہل علم اور شاعر ہیں۔ انہوں نے بھی علامہ نیموی کی وفات پر اظہار غم کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

حیف مولانا ظہیر احسن شدہ ؎ | رہگرائے عالم قدوسیاں
شاعراں خوانند شوق نیموی | شہرتش شد با تخلص در جہاں
طبع او موزون و ذوق او سلیم | نکتہ رس کم دیدہ بدست شاعراں
ہر کہ تصنیفات او را دیدہ است | رتبۂ اولی شناسد بے گماں
چوں رسید آدینہ و ماہ صیام | الوداع عمر خواندہ جسم و جاں
بہر تاریخ وفات او شدہ | جو طلب از طالب شیوا بیاں
کرد انشا احسن مارہروی | یافت شوق نیموی دار جناں[2]

---

[1] دیوان شوق: ۱۱۱ [2] ایضاً ۱۱۲

باب دہم

مذہبی تصنیفات

علامہ شوق نیموی کا دینی رجحان اور اسکے اسباب

علامہ نیموی کی زندگی کے جو مفصل حالات اوپر بیان کئے گئے ہیں ان سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہوں نے زمانۂ طالب علمی میں اور پھر فراغت کے بعد چند برسوں تک اردو زبان وادب سے خصوصی دل چسپی لی اور اس موضوع پر کچھ اہم کتابیں تصنیف کر ڈالیں لیکن اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا طبعی میلان اور فکری رجحان یکسر بدل جاتا ہے اور اردو زبان وادب کے بجائے علوم دینیہ کے مطالعہ اور اس کی تبلیغ واشاعت میں ہمہ تن مصروف ہو جاتے ہیں۔ خاص طور پر فن حدیث میں اس قدر دل چسپی لیتے ہیں اور غائر مطالعہ کرتے ہیں کہ اس میدان میں تمام ہندستانی علمائے احناف کے سرخیل ہو جاتے ہیں۔ اور مرکزی شخصیت اختیار کر جاتے ہیں۔ اس کے اسباب وعلل پر غور کرنے سے مندرجہ ذیل وجوہ سامنے آتی ہیں۔

۱۔ پہلی وجہ علامہ نیموی کا وہ متبرک خواب ہے جو انہوں نے خدمت حدیث کے سلسلے میں ایک بار دیکھا تھا۔ اس کا ذکر انہوں نے اپنی کتاب "یادگار وطن" اور "آثار السنن" دونوں ہی میں کیا ہے۔ چنانچہ یادگار وطن میں اس کا اور اس کے اثرات کا ذکر خود ہی اس طرح کرتے ہیں:

"ایک دفعہ خواب میں دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جنازۂ مبارک میرے اٹھائے ہوا ہوں، جسکی تعبیر دل نے یہ کہی کہ تو انشاء اللہ حامل علم نبوی ہوگا۔ اور واقعی اسی زمانے سے مجھکو دینیات خصوصاً حدیث شریف سے زیادہ شوق ہے۔ فالحمد للہ علی ذالک"[1]

اس طرح کے ایک اور مبترک خواب کا ذکر انہوں نے کیا ہے جس کے بعد انہیں دینی علوم سے زیادہ دلچسپی پیدا ہوئی۔ وہ خواب بھی انہیں کی زبانی سنیئے۔ فرماتے ہیں:

"ایک دفعہ وعظ میں ایک نعتیہ شعر پڑھنے کا اتفاق ہوا جس نے مجھے عجیب مزا دیا۔ میں نے بھی ایک نعت شریف میں ایک فارسی قصیدہ کہنا شروع کیا۔ جس شب کو میں نے تمام کیا خواب میں دیکھا کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے ابھی مدینہ طیبہ میں تشریف لائے ہیں اور ایک جماعت میں رونق افروز ہیں اور میں بھی شریک جماعت ہوں۔ اٹھ کر آپ سے ایک مسئلہ پوچھنے کا قصد کیا کہ آنکھیں کھل گئیں۔ رویت پر شکر بجا لایا اور بیداری پر تاسف ہوا۔ اس قصیدے میں ایک شعر یہ بھی تھا ؎

نقاب خویش بکشائی میخواہم جلوہ فرمائی

جمال پاک بنمائی کہ یا ایم نعمت عظمیٰ"[2]

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کا پورا گھرانا مذہبی تھا۔ اور علوم دینیہ سے خصوصی شغف رکھتا تھا۔ ان کے تمام اساتذہ مذہبی اور علوم دینیہ کے متبحر عالم تھے اور

---

[1] یادگار وطن: ۱۲۱ [2] ایضاً: ۱۲۱

انہیں کی نگرانی اور تربیت میں علامہ نیموی کی پرورش و پرداخت ہوئی تھی اس لئے ان علوم و فنون سے دل چسپی پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔

۳۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ علامہ نیموی نے ہندوستان کے مشہور عالم دین اور محدث مولانا عبد الحئی فرنگی محلی سے علوم دینیہ اور حدیث شریف کی تعلیم خاص طور سے حاصل کی تھی۔ اور ان کی بابرکت صحبت میں برسوں رہے تھے۔ اس زمانے میں مولانا عبد الحئی فرنگی محلی اور نواب صدیق حسن خاں (بھوپال) کے درمیان دینی موضوعات پر اکثر بحثیں ہوتی تھیں۔ خاص طور پر تقلید ائمہ اور عدم تقلید پر دونوں طرف سے ایک دوسرے کے خلاف مضامین اور کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ مختلف فیہ فقہی مسائل میں دونوں طرف سے اختلافی امور اٹھائے جاتے تھے۔ اور ایک دوسرے کے خلاف جوابات دیئے جاتے تھے۔ اس میدان میں علمائے احناف کی طرف سے مولانا عبد الحئی فرنگی محلی نمائندگی کر رہے تھے تو علمائے جماعت اہل حدیث کی طرف سے مولانا صدیق خاں ترجمانی کر رہے تھے۔

چوں کہ علامہ نیموی مولانا عبد الحئی فرنگی محلی کی شاگردی میں تھے اور یہ تمام مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور اسی طرح کی کتابیں مطالعہ کرتے رہتے تھے اس لئے مسلک احناف سے دل چسپی پیدا ہونا ایک فطری بات تھی، اور پھر احناف کی تائید و حمایت میں کھڑا ہونا اس کا لازمی نتیجہ تھا۔

۴۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں جب غیر مقلدین علماء نے ائمہ اربعہ کو مورد عتاب بنایا، فقہی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے کو حرام اور ناجائز قرار دیا۔ اور حدیث شریف کی غلط تعبیر و تشریح کرنی شروع کر دی تو

علامہ نیموی کی دینی غیرت وحمیت جاگ اٹھی اور احناف کی طرف سے جواب دینے کی شدت کے ساتھ ضرورت محسوس کی۔ تلاش وجستجو اور تحقیق کے بعد اہل علم کے سامنے، حقائق پیش کرنے کی فکر دامن گیر ہوئی۔ اس بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ نیموی اس کے بعد علوم دینیہ اور خاص طور پر حدیث شریف کی خدمت کی طرف پورے طور پر متوجہ ہو گئے۔ مسلک احناف کی تائید وحمایت میں اپنا پورا زور اور پوری صلاحیت صرف کر دی۔ یہ شغلہ اخیر عمر تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

علامہ نیموی کی دینی تصنیفات کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ چوں کہ غیر مقلدین علماء نے حدیث وفقہ کو اپنی بحث ومباحثہ کا اصل میدان قرار دیا تھا، اس لئے علامہ نیموی نے اپنی تصنیفات کے لئے انہیں دو موضوعات کو منتخب کیا اور انہیں موضوعات میں کمال پیدا کر کے نہایت تحقیق وتدقیق کے بعد علمائے احناف کی طرف سے جوابات دینے کی بھرپور کوشش کی۔

مذہبی تصنیفات وتالیفات

مولانا عبدالرشید فوقانی نے علامہ نیموی کی مندرجہ ذیل مذہبی تصنیفات وتالیفات کی نشان دہی کی ہے۔

(۱) اوشحۃ الجید فی اثبات التقلید
(۲) حبل المتین
(۳) ردالسکین
(۴) جلاء العین فی رفع الیدین
(۵) جامع الآثار فی صلوٰۃ الجمعۃ فی القری
(۶) لامع الانوار فی نظر المختار
(۷) مقالہ کاملہ
(۸) تذئیل
(۹) المجلی فی رد قول المحلی
(۱۰) وسیلۃ العقبی
(۱۱) تبیان التحقیق
(۱۲) آثار السنن

افسوس ہے کہ مجھے ابتک مذکورہ تمام کتابیں دستیاب نہ ہوسکیں تاہم جو کتابیں تلاش وجستجو کے بعد دستیاب ہوگئیں ان کا تعارف پیش خدمت ہے۔

اوشحۃ الجید فی اثبات التقلید

یہ کتاب قومی پریس لکھنؤ سے چھپی جو ۱۱۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ دراصل

فقہ اسلامی کی مختصر تاریخ ہے۔ چوں کہ غیر مقلدین علماء، ائمہ اربعہ کی تقلید کے قائل نہیں تھے، بلکہ ان کی تقلید کو ضلالت اور گمراہی قرار دے رہے تھے اور ان کی علمی و دینی عظمت کے منکر تھے اس لئے ضرورت تھی کہ احناف کی طرف سے اس کا جواب دیا جاتا اور یہ بات ثابت کی جاتی کہ تقلید کہاں تک برحق ہے، اور ائمہ اربعہ کا علمی و دینی مقام کہاں تک اعلیٰ و ارفع ہے چنانچہ اسی مقصد کے پیش نظر علامہ نیموی نے اوشحتہ الجید فی اثبات التقلید نامی کتاب لکھی۔

اس کتاب کے آغاز میں تقلید پر بحث کی گئی ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حیات تھے تمام دینی و فقہی مسائل آپ ہی سے دریافت کئے جاتے تھے، جب آپ کا وصال ہو گیا تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مختلف مقامات اور شہروں میں پھیل چکے تھے اس لئے اپنے مقام اور شہر کے قاضی اور مفتی بنے کیوں کہ ان صحابہ کرام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت حاصل تھی اور انہوں نے بلا واسطہ آپ سے دینی علوم حاصل کئے تھے۔ اس لئے صحابہ کرام سے بڑھ کر مسئلہ بتانے والی کوئی دوسری جماعت نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر ان صحابہ کرام سے جن لوگوں نے بلا واسطہ استفادہ کیا وہ علمائے تابعین تھے خصوصاً ائمہ اربعہ کی شخصیتیں تھیں۔ اس لئے اس دور کے عوام و خواص نے دینی مسائل میں انہیں کی طرف رجوع کیا کیوں کہ قرآن و حدیث کے رموز و نکات کو اچھی طرح جاننے والا ان کے علاوہ کوئی دوسرا طبقہ نہیں تھا۔ تیسری صدی ہجری میں جب اسلام دور دور تک پھیل گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے کافی دن گذر گئے تو عوام میں نفسانیت زیادہ بڑھ گئی، طرح طرح کے اختلافات رونما ہونے لگے۔ من مانی فتاوے دیئے جانے لگے، اس لئے اس صدی کے علماء اس بات پر متفق

ہو گئے کہ ہر مسلمان پر کسی امام مجتہد کی تقلید لازم ہے۔ اور فقہی مسائل میں اس کے بتائے ہوئے اصول پر چلنا ضروری ہے۔ تاکہ مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد باقی رہے اور دین کی حفاظت ہو سکے۔ اس کے علاوہ محدثین کرام نے بھی اسکی تائید کی اور تقلید ائمہ کو ضروری قرار دیا چنانچہ حافظ زیلعی، علامہ عینی، علامہ سیوطی، ملا علی قاری، ابن حجر عسقلانی، امام نووی ابن عبدالبر وغیرہ فن حدیث کے بڑے عالم ہیں اور اہم محدثین کرام میں ان کا شمار ہوتا ہے لیکن ان میں سے کسی نے تقلید ائمہ کی مخالفت نہیں کی بلکہ وہ خود بھی کسی نہ کسی امام کی تقلید کرتے رہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم قرآن میں کہا گیا ہے۔ اس آیت میں اولی الامر سے کسی نے شیخ مراد لیا۔ کسی نے محدث کہا اور کسی نے سلطان مراد لیا۔ علامہ نیموی فرماتے ہیں کہ ان کے نزدیک سب ہو سکتے ہیں۔ کیوں کہ دینی اور دنیاوی امور کے لئے الگ الگ ذمہ دار ہیں اور اسلام میں سب کی اطاعت ضروری ہے۔ دینی امور میں باطنی اولی الامر سے مراد شیوخ ہونگے اور ان کی اطاعت ضروری ہوگی اور ظاہری اولی الامر سے مراد علماء ہوں گے اور اس میدان میں ان کی اطاعت لازمی ہوگی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اتباع اس وقت ہو سکتی ہے جب تابع متبوع کے درجہ تک نہ پہنچے۔ اس لئے آیت کریمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ جو مسلمان مجتہد نہ ہو اس پر کسی مجتہد عالم دین کی تقلید لازمی ہوگی۔

اس کے بعد علامہ نیموی نے امام ابوحنیفہ کے کشف و کرامات بیان کئے ہیں اور خاص طور پر علم حدیث میں ان کی مہارت اور تبحر کو تفصیل سے لکھا ہے، اور اس سلسلے میں کچھ مزید اہم باتیں لکھی ہیں۔ جن کا یہاں بیان فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ عام طور پر امام ابوحنیفہ پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ انہیں فن حدیث میں کوئی زیادہ دخل نہ تھا اور صرف سترہ حدیثیں یاد تھیں۔ اس کا

جواب اس طرح دیا ہے کہ امام ابو حنیفہ کو ہزاروں حدیثیں یاد تھیں۔ اس کے باوجود فقیہ اس لئے مشہور ہوئے کہ فقہ یعنی درایت میں ان کا درجہ بہت بڑھا ہوا تھا۔ اور یہ مسلم ہے کہ درایت کا مرتبہ روایت سے بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ جیساکہ امام ترمذی نے باب غسل المیت کے تحت ایک جگہ لکھا ہے "وکذالک قال الفقہاء وھم اعلم بمعانی الحدیث" اس سے فقہا کا بلند مرتبہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ چوں کہ امام ابو حنیفہ فقہ کے مقنن اور مدون تھے، اس لئے فقیہ کہلائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ بعض اجلہ محدثین مثلاً عبداللہ بن مبارک وغیرہ فقہ میں آپ کے شاگرد تھے اور یہ ظاہر ہے کہ دوران تعلیم احادیث کی بھی ضرورت پڑتی ہوگی اگر آپ حدیث میں پوری دسترس نہ رکھتے تو فقہ کی تعلیم کس طرح دے سکتے تھے۔

تیسری بات یہ ہے کہ امام ذہبی جو فن حدیث میں امام مانے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اسماء الرجال کے ناقد بھی ہیں انھوں نے تذکرۃ الحفاظ میں امام ابو حنیفہ کو حفاظ حدیث کے پانچویں طبقہ میں شمار کیا ہے۔ اس کے علاوہ عقود الجمان میں ایک باب باندھا گیا ہے جس کا عنوان ہے الباب الثالث والعشرون فی بیان کثرۃ حدیثہ وکونہ من اعیان الحفاظ المحدثین" اور یہ بات مسلم ہے کہ اصطلاح حدیث میں حافظ حدیث اس شخص کو کہتے ہیں جسے لاکھ حدیثیں یاد ہوں۔ اگر امام صاحب کو لاکھ سے زیادہ احادیث یاد نہیں تھیں تو امام ذہبی وغیرہ نے انہیں حفاظ حدیث میں کیسے شامل کر لیا۔

غرض کہ یہ تقلید ائمہ اربعہ پر نہایت مدلل اور مفید کتاب ہے اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نہ صرف دینی علوم میں مہارت رکھتے ہیں بلکہ تاریخ اسلامی پر بھی نہایت گہری نظر رکھتے ہیں۔

حبل المتین

ایک فقہی مسئلہ ہے کہ نماز میں سورہ فاتحہ پڑھنے کے بعد نمازی باآواز بلند آمین کہے یا آہستہ ــــــ امام شافعی اور علمائے اہل حدیث کے یہاں آمین باآواز بلند کہنا چاہیے لیکن امام ابو حنیفہ کے یہاں آہستہ کہنا زیادہ بہتر ہے۔ یہ کتاب امام ابو حنیفہ کے مسلک کی تائید میں لکھی گئی ہے اور اس کے لیے احادیث صحیحہ آثار صحابہ اور علماء کے اقوال وافعال پیش کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ علمائے اہل حدیث کے دلائل نقل کرکے ان کے جوابات بھی تحریر کئے گئے ہیں۔ اور اپنی بات نہایت مدلل اور محققانہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس موضوع پر یہ نہایت مفید اور معلوماتی کتاب ہے۔

رد السکین

یہ ایک رسالہ ہے جو کل ۱۸ صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۳۱۲ھ میں قومی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔

حبل المتین نامی کتاب چھپ کر منظر عام پر آئی تو احناف کے علمی حلقہ میں اسکی کافی پذیرائی ہوئی۔ لیکن اہل حدیث طبقہ میں کافی برہمی اور بے چینی کا اظہار کیا گیا۔ چنانچہ مولانا محمد سعید بنارسی نے اس کی رد میں سکین نامی ایک کتاب لکھی جس میں انھوں نے مختلف اعتراضات کئے اور حبل المتین کے بعض حوالوں کو غلط قرار دیا۔ احناف کی طرف سے اس کا جواب دینا اور اس کے حوالہ جات کو صحیح ثابت کرنا نہایت ضروری تھا، چنانچہ علامہ نیموی نے خود ہی اس کے جواب کے لئے قلم اٹھایا اور نہایت فاضلانہ اور محققانہ انداز میں اس کا جواب دیا، اور اس کا نام رد السکین رکھا۔

اس رسالہ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا محمد سعید بنارسی کے زیادہ تر اعتراضات کم فہمی اور لاعلمی پر مبنی تھے۔ کیوں کہ علامہ نیموی نے جو حوالے پیش کئے تھے وہ مولینا محمد سعید بنارسی کے دائرہ علم سے باہر کے تھے۔ اس وجہ سے انھوں نے لکھ

دیا تھا کہ جو حوالے حبل المتین میں دیئے گئے ہیں وہ غلط ہیں۔ اور ان کتابوں کا دنیا میں کہیں وجود نہیں۔

علامہ نیموی نے اس رسالے میں ان کی غلطیوں کی اصلاح کی ہے۔ اور جو اعتراضات کئے گئے ہیں ان کا مفصل اور مدلل جواب دیا ہے۔ مثال کے طور پر علامہ نیموی نے حبل المتین کے صفحہ ۲۶ پر لکھا تھا کہ امام بخاری کے استاد امام حمیدی نے اپنی مسند میں ایک روایت اس طرح لکھی ہے:

"حدثنا سفیان بن عیینہ نا سعید المقبری عن ابی ھریرۃ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا قال ولا الضالین رفع صوتہ وقال آمین حتی سمع من یلیہ من الصف الاول" مولانا محمد سعید بنارسی نے اس حدیث کے بارے میں اعتراض کیا کہ مسند حمیدی نایاب ہے، اس کا نسخہ کہیں ملتا نہیں۔ حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی یہ حدیث ملتی نہیں۔ پھر یہ حدیث کہاں سے نقل کر دی گئی۔

علامہ نیموی نے رد السکین میں اس کا جواب دیا کہ مسند حمیدی نایاب نہیں بلکہ اس کے تین نسخے صرف ہندستان میں پائے جاتے ہیں۔ ایک نسخہ مولانا محمد سعید مفتی عدالت عالیہ حیدرآباد کے ذاتی کتب خانہ میں ہے۔ دوسرا نسخہ مولانا شیخ احمد مکی محدث کے یہاں ہے مگر یہ ناقص ہے، تیسرا نسخہ مولانا عبد الحق ساکن کرنول ضلع مدراس کے کتب خانہ میں ہے اور علامہ نیموی نے مذکورہ حدیث اسی کرنول والے نسخے سے نقل کی ہے۔ اور اس میں مذکورہ عبارت بعینہ موجود ہے۔

اس رسالے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ کسی مسئلہ کو علمائے احناف کے علاوہ خود شوافع اور علمائے اہل حدیث کے اقوال و بیانات سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس طرح اپنی بات کو شوافع اور اہل حدیث علماء کے اقوال و بیانات سے ثابت کرنے

کی کوشش کی گئی ہے، اور اس طرح اپنی بات کو شوافع اور اہل حدیث سے منوانے کی بہترین شکل اختیار کی گئی ہے۔ چنانچہ دیکھیئے علامہ نیموی نے حبل المتین کے ص۲۷ پر لکھا تھا کہ آمین بالسر کے بارے میں ابن جریر طبری نے ابو وائل سے اس طرح روایت کی ہے۔

"اخبرنا ابو کریب ثنا ابو بکر بن عیاش عن ابی سعید عن ابی وائل قال لم یکن عمر و علی یجہران ببسم اللہ الرحمٰن الرحیم ولا آمین"

مولانا محمد سعید بنارسی نے سکین میں اس پر اعتراض کیا کہ یہ اثر بعض متعصب حنفیوں کا من گڑھت ہے۔ احادیث و آثار کی کتابوں میں کہیں یہ اثر نہیں ملتا۔

علامہ نیموی نے رد السکین میں اس کا جواب نہایت مدلل انداز میں اس طرح دیا ہے کہ حافظ زیلعی کے استاد علامہ علاء الدین ترکمانی نے جوہر النقی میں تہذیب الآثار للطبری کے حوالے سے اس اثر کو نقل کیا ہے اور حافظ عینی نے بھی شرح بخاری میں اس کو نقل کیا ہے مگر اس میں ابو کریب کا نام نہیں جو غالباً سہو کاتب ہے، خیر یہ لوگ تو حنفی تھے۔ خود شوافع نے اس کو نقل کیا ہے، چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطی نے جمع الجوامع میں اس اثر کے بارے میں لکھا ہے۔ "رواہ ابو جریر والطحاوی وابن شاہین فی السنن" اس عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ ابو جریر طبری نے تہذیب الآثار میں اس اثر کی روایت کی ہے۔

بہر حال یہ ایک نہایت مفید کتاب ہے جس کے مطالعہ سے علامہ نیموی کی وسعت نظری، علمی پختگی اور قوت استدلال کا پتا چلتا ہے۔

جلاء العین فی رفع الیدین

یہ ایک رسالہ ہے جو قومی پریس لکھنو سے چھپا ہے ۱۶ر صفحات پر مشتمل ہے، فقہ کا ایک مسئلہ ہے کہ حالت نماز میں رکوع اور قیام کے وقت ہاتھ اٹھایا جائے یا نہیں۔

شوافع اور علمائے اہل حدیث کے نزدیک ہاتھ اٹھانا مستحب ہے۔ یہ رسالہ احناف کی تائید میں لکھا گیا ہے اور بدلل طور ثابت کیا گیا ہے کہ ہاتھ نہ اٹھانا ہی مستحب ہے۔ اس کیلئے احادیث، آثار صحابہ اور علما کے اقوال واعمال پیش کئے گئے ہیں۔

اس رسالے میں ایک مقدمہ اور پھر ہاتھ نہ اٹھانے والی چھ روائتیں تحریر کی گئی ہیں مقدمہ میں دو دعوے کئے گئے ہیں جو علامہ نیموی کی تمام تحقیقات کا خلاصہ ہیں یہ دعوے اس لائق ہیں کہ انہیں یہاں بھی نقل کر دیئے جائیں، تاکہ علامہ نیموی کا انداز تحقیق اور علمی بصیرت ہمارے سامنے آسکے، مناسب ہوگا کہ وہ انہیں کی زبانی سنئے۔ فرماتے ہیں:

• ایک دعوی یہ کہ میں نے سنن و مسانید و معاجم کے علاوہ شروح و رسائل کی بھی خوب سیر کی، کسی روایت صحیحہ سے خلفاء اربعہ کا رفع یدین کرنا ہرگز ثابت نہیں، اس باب میں جو دو ایک آثار مروی ہیں وہ صحیح نہیں۔ اب میں پھر زور دے کر کہتا ہوں کہ کوئی شخص انشاء اللہ باسناد صحیح ان مقدس حضرات سے رفع یدین کرنا ثابت نہیں کر سکتا۔ امام بخاری نے رفع یدین کے ثبوت میں خاص ایک رسالہ لکھا ہے جس میں بہت زور مارا ہے اور آثار صحابہ بھی لکھے ہیں مگر خلفائے اربعہ کی بہ نسبت کوئی روایت سند کے ساتھ نہ لکھ سکے۔ بیہقی نے اپنی تصانیف میں بہت سی روائتیں لکھیں مگر خلفائے اربعہ کے بارے میں بعض ضعیف روایتوں کے سوا کوئی صحیح روایت پیش نہ کر سکے۔

دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ خلفاء اربعہ میں سے حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عثمان ذی النورین کا حال بسند صحیح کچھ معلوم نہیں مگر حضرت عمر فاروق رض اور علی مرتضیٰ رض سے بسند صحیح ترک رفع یدین ثابت ہے۔ اور کچھ انہیں پر موقوف

نہیں بلکہ دوسرے صحابہ کا بھی رفع یدین نہ کرنا ثابت ہے"

جامع الآثار فی اختصاص الجمعۃ بالامصار

یہ ایک نہایت معرکۃ الآرا رسالہ ہے جو احسن المطابع پٹنہ سے چھپا ہے اور ۱۲۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ مسئلہ علماء کے درمیان مختلف فیہ ہے کہ نماز جمعہ دیہات میں واجب ہے یا نہیں۔ شوافع اور علمائے اہلحدیث کے یہاں دیہات میں رہنے والوں پر بھی نماز جمعہ واجب ہے جبکہ علمائے احناف کے یہاں نماز جمعہ صرف شہر اور بڑے قصبات میں واجب ہے۔ اس موضوع پر احناف کی طرف سے بہت ساری کتابیں تصنیف کی گئی ہیں لیکن علامہ نیموی کی اس تصنیف کو خاص اہمیت حاصل ہے، کیوں کہ انہوں نے اپنے مسلک کے ثبوت میں آٹھ دلیلیں پیش کی ہیں اور ہر دلیل علمی و تحقیقی لحاظ سے نہایت قوی اور مضبوط ہے۔ بعض بعض جگہ انہوں نے کچھ ایسی دلیلیں پیش کی ہیں جنہیں ان سے پہلے کسی حنفی عالم نے پیش نہیں کی تھیں۔ ایسے ہی مقامات پر ان کی مجتہدانہ شان اور محققانہ صلاحیت ظاہر ہوتی ہے ہم چند سطور میں اس رسالہ کی بحث کا خلاصہ پیش کرتے ہیں تاکہ علامہ نیموی کی تحقیق اور اسلوب تحقیق کا اندازہ ہو سکے۔ اور اس رسالے کی اہمیت ہمارے سامنے آ سکے اس سلسلے میں علامہ نیموی نے سب سے پہلے ہدایہ کی عبارت "لا تصح الجمعۃ الا فی مصر جامع او فی مصلی المصر ولا تجوز فی القری" پیش کی ہے۔ اس کے بعد بخاری شریف کی یہ حدیث "عن ابن عباس قال ان اول جمعۃ جمعت بعد جمعۃ فی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مسجد عبد القیس بجواثی من البحرین" نقل کی ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اس روایت سے صاف پتا چلتا ہے کہ مسجد نبوی کے بعد سب سے پہلے جواثا میں نماز جمعہ ادا کی گئی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہجرت سے کتنے دنوں بعد جواثا میں نماز جمعہ پڑھی گئی۔ چنانچہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری کے صہ ۱۲۳ جلد اول میں لکھا ہے کہ وانما جمعوا بعد رجوع وفدھم الیھم یعنی عبد القیس نے اپنے یہاں جمعہ اس وقت قائم کیا جب ان کا وفد ان کے یہاں واپس آگیا۔ آگے علامہ نیموی لکھتے ہیں کہ اس واقعہ کے قبل حرمت شراب والی آیت یقیناً نازل ہو چکی تھی کیوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد عبد القیس کو جو تعلیمات دی تھیں ان میں ایک تعلیم یہ بھی تھی کہ وہ لوگ شراب استعمال نہیں کریں گے۔

غرض کہ ہجرت کو کم از کم دو برس ضرور گذر چکے تھے۔ بلکہ قاضی عیاض نے تصریح کی ہے کہ وفد عبد القیس کا آنا ۸ھ میں ہوا تھا۔ اب قابل غور بات یہ ہے کہ اتنی طویل مدت میں سیکڑوں اہل قریہ مسلمان ہو چکے تھے لیکن پھر بھی وہاں نماز جمعہ نہیں پڑھی جاتی تھی۔

دوسری دلیل یہ پیش کی گئی ہے کہ مقام قبا جو مدینہ طیبہ سے تین کوس کے فاصلے پر ہے، جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر ہفتہ تشریف لے جاتے تھے اور جہاں کی مسجد کی فضیلت یہ تھی کہ اس کی بنیاد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے خود ڈالی تھی اور اس کی شان میں قرآن پاک میں أُسِّسَ عَلَى التَّقْوىٰ جیسی متبرک آیت نازل ہوئی تھی۔ پھر ایسی متبرک مسجد میں نہ تو آپ نے اس وقت جمعہ پڑھا جب آپ نے مکہ سے ہجرت کر کے وہاں آکر دو ہفتہ کے قریب قیام کیا اور نہ مدینہ میں قیام کے بعد، فرض تو فرض اگر جمعہ صرف جائز ہوتا تو جواثا سے بہت پہلے وہاں جمعہ قائم ہو چکا ہوتا۔

غرض کہ قبا میں جمعہ نہ پڑھنا اور مسجد نبوی کے بعد پہلا جمعہ ہجرت کے کئی سال بعد جواثا میں منعقد ہونا اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ وہ جگہیں قیام جمعہ کے لئے مناسب نہیں تھیں [1]

---

[1] جامع الآثار : ۸

علامہ نیموی نے نہایت قوی دلیل سے اپنے مسلک کو صحیح ثابت کیا ہے۔ ان کا ایک طریقہ استدلال یہ بھی ہے کہ مخالفین کے ذہنوں میں جو اعتراضات یا سوالات آسکتے ہیں انہیں پہلے نقل کرتے ہیں اور پھر ان کا جواب نہایت محققانہ انداز میں دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے دار قطنی کی مندرجہ ذیل روایت نقل کی ہے جس سے جمعہ ہر قریہ میں منعقد ہونا ثابت ہوتا ہے۔

"عن ام عبد اللہ الدوسیہ مرفوعًا الجمعة واقعة علی کل قریة فیها امام، اس کے بعد اس کا جواب اس طرح دیتے ہیں۔

"یہ حدیث غایت درجہ ضعیف ہے، دارقطنی نے لکھا ہے لا یصح هذا عن الزهری کل من رواه متروک۔ اسی طرح بیہقی نے معرفۃ السنن والآثار میں لکھا ہے وهذا ایضًا ضعیف لا یصح۔ علامہ شوکانی نے نیل الاوطار میں لکھا ہے۔ وقد ضعفه الطبرانی وابن عدی وانه متروک "[1]

غرض کہ اس مختصر رسالہ میں مصنف نے جمعہ کے متعلق تمام متعلقہ سوالات کے جوابات نہایت مدلل طریقہ سے دیئے ہیں اور اپنے موقف کو بڑے محققانہ انداز میں پیش کیا ہے

مقالہ کاملہ | یہ رسالہ قومی پریس لکھنؤ سے چھپا جو ۲۷ صفحات پر مشتمل ہے یہ رسالہ الاجوبة الفاخرة الفاضلہ مصنفہ حکیم محمد علی اعظمی کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ حکیم محمد علی نے اپنی کتاب میں حضرت مولٰنا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی پر کچھ اعتراضات کئے تھے اور اس ضمن میں امام ابوحنیفہ پر بھی تنقید کی تھی، چوں کہ علامہ نیموی حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج کے مرید خاص اور

[1] جامع الآثار: ۱۰

معتقد تھے۔ اس لئے انہوں نے الاجوبۃ الفاخرہ کا جواب لکھا اور المقالۃ الکاملہ اس کا نام رکھا۔ اس رسالہ میں انہوں نے نہ صرف معترض کے اعتراضات کے جوابات دیئے ہیں بلکہ اس ضمن میں بہت سارے علمی مباحث بھی پیش کئے ہیں۔ خاص طور پر بیعت وارادت، تصور شیخ، کرامت اور کشف وغیرہ کے متعلق مفید معلومات تحریر کئے ہیں، احادیث، آثار صحابہ اور علماء کے افعال واعمال بیان کرکے اپنی باتوں کو مدلل طور پر پیش کیا ہے۔

امام ابوحنیفہ کے سلسلے میں جو اعتراضات کئے گئے تھے ان کا بھی مدلل جواب دیا ہے۔

وسیلۃ العقبیٰ

یہ فارسی زبان میں ایک رسالہ ہے جس میں مرض اور موت سے متعلق ضروری باتیں تحریر کی گئی ہیں۔ مرض سے متعلق جو احادیث ہیں اور جن متعدی امراض سے بچنے اور پرہیز کرنے کی تلقین کی گئی ہے وہ سب احادیث پیش کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ موت کیا ہے، شرعی لحاظ سے اس کا مقام کیا ہے، روزانہ موت کو یاد کرنے سے دل پر کیا اثر پڑتا ہے اور شرعی لحاظ سے اس کا کتنا ثواب ہے، قرآن نے موت کی غرض وغایت کیا بتائی ہے۔ یہ تمام امور زیر بحث لائے گئے ہیں اور پوری تفصیل کے ساتھ ان تمام امور پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس سلسلے میں قرآن وحدیث کے حوالے جابجا پیش کئے گئے ہیں۔ تاکہ ہر بات مدلل ہوکر قارئین کے سامنے آسکے۔

مثال کے طور پر موت کے سلسلے میں ایک جگہ فرماتے ہیں۔

"یاد کردن موت باعث حسنات وبرکات است۔ ومانع می شود از ارتکاب معاصی وتحریک می کند بسوئے عبادت، در ابن ماجہ وترمذی است قال رسول اللہ

اکثروا ذکر ھاذم اللذات ـ یعنی الموت ، یعنی فرمود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کہ قاطع لذات را کہ موت است زیادہ یاد کنید و بزار باسناد حسن روایت کردہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مر بمجلس وھم یضحکون فقال اکثروا ذکر ھاذم اللذات یعنی ہر آئینہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بر مجلسی گذر فرمود د مردمان آنجا می خندید ند پس فرمود کہ ھاذم لذات را زیادہ یاد کنند

ایک دوسری جگہ نیک مرد کی موت کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

"چوں مرد صالح وفات یابد زمین و آسمان بر او می گرید بعض اوقات آثار حزن و ملال او چشم بینند گان عیاں می شود۔ مجاہد در باب آیت کریمہ فما بکت علیہم السماء والارض گفتہ ما مات مؤمن الابکت علیہ السمٰوات والارض فقیل اتبکی علیہ قال وما الارض لا تبکی علی عبد کان یعمرھا بالرکوع والسجود وما للسماء لا تبکی علی عبد کان بتکبیرہ وتسبیحہ دوی کدوی النحل"

غرض کہ مختلف ابواب کے تحت مرض و موت کے متعلقہ مسائل نہایت موثر انداز میں تحریر کئے گئے ہیں اور انداز بیان موثر ہونے کی وجہ سے قاری کے دل پر ایک خاص طرح کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔

الدرۃ الغرۃ اس رسالے کا پورا نام الدرۃ الغرۃ فی وضع الیدین علی الصدر و تحت السرہ ہے۔ یہ ایک مختصر رسالہ ہے جو قومی پریس لکھنؤ سے چھپا اور اس کے کل گیارہ صفحات ہیں۔

فقہ کا ایک مسئلہ ہے کہ نیت باندھنے کے بعد حالت نماز میں نمازی اپنے دونوں ہاتھ کہاں رکھے۔ شوافع اور غیر مقلدین علماء کے نزدیک ہاتھ اپنے سینہ پر

رکھنا اولیٰ ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا چاہیئے۔

علامہ نیموی نے امام ابوحنیفہ کی تائید میں یہ رسالہ لکھا ہے۔

پہلے انہوں نے آٹھ ایسی روایتیں تحریر کی ہیں جو شوافع کے مسلک کی تائید میں ہیں اور ان سے سینہ پر ہاتھ رکھنا ثابت ہوتا ہے۔ لیکن ہر روایت کی عدم صحت کے بارے میں محدثین کرام نے اپنے جو خیالات پیش کئے ہیں وہ بھی بیان کر دیئے گئے ہیں۔ اس کی وجہ سے یہ روایتیں خود ہی ناقابل اعتبار ہو جاتی ہیں۔

اس کے بعد چھ ایسی روایتیں بیان کی ہیں جن سے ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا ثابت ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں کسی روایت پر اگر مخالفین کا کوئی اعتراض ہوتا ہے تو اس کا بھی جواب دیا ہے۔ جس سے یہ روایتیں نہایت معتمد اور مستند ہو جاتی ہیں۔

اس کے بعد قول فیصل کے عنوان سے اپنا فیصلہ تحریر کیا ہے، چوں کہ اس فیصلہ میں پوری بحث کا خلاصہ آگیا ہے اس لئے ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

• بعد تحقیق و تنقید یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابومجلز کے اثر کے سوا بقیہ احادیث واخبار جو محل وضع الیدین کے باب میں مروی ہیں ضعف اسناد یا کسی علت سے خالی نہیں اور حق یہ ہے کہ اس بات میں امر واسع ہے سینے سے لے کر کمر تک ہاتھ رکھنا جائز ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ نے ستر ہونے کے خیال سے عورتوں کے لئے چھاتیوں پر اور مردوں کے لئے بلحاظ خشوع وخضوع یا بنظر سہولت زیر ناف ہاتھ باندھنے کو تجویز فرمایا ہے۔ بخاری شریف میں مروی ہے عن سھل ابن سعد قال کان الناس یومرون ان یضع الرجل الید الیمنی علی ذراعہ الیسری فی الصلوٰۃ اور یہ ظاہر ہے کہ جب محل وضع بیان نہیں کیا گیا تو مقصود یہ ہوگا کہ جہاں بمقتضائے طبع بآسانی ہاتھ باندھ سکتے ہوں باندھیں۔ ناف سے جہاں تک اوپر ہاتھ باندھے

جائیں گے تکلف اور دقت بڑھتی جائے گی کیوں کہ ہاتھوں کا میلان طبعی جب ہوگا جانب اسفل ہوگا۔ اور چوں کہ ہاتھوں کی کہنیاں زیر ناف کے محاذات تک پہونچے گی لہذا زیر ناف ہاتھ باندھنے میں سراسر سہولت ہے۔"

اس رسالے میں بعض روایات کی صحت یا عدم صحت کے بارے میں علامہ نیموی نے نہایت نادر اور اہم تحقیقات پیش کی ہیں۔ اس لحاظ سے اس رسالے کی قدر و قیمت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

تبصرۃ الانظار فی رد تنویر الابصار

یہ ایک مختصر رسالہ ہے جو تین صفحات پر مشتمل ہے، اور تنویر الابصار کی رد میں لکھا گیا ہے۔ یہ سیر بنگال کے ساتھ چھپا ہے۔ مؤلف تنویر الابصار نے اپنے رسالہ میں بعض مقامات پر حدیث کی عبارتوں کے غلط حوالے دیئے ہیں۔ یا اپنے مدعا کو صحیح ثابت کرنے کے لئے غلط تاویلات پیش کی ہیں۔ علامہ شوق نیموی نے مذکورہ رسالے میں انہیں سب باتوں کا ذکر کر کے ان کا مدلل جواب دیا ہے۔ اور ان کی غلطیوں کی نشان دہی کی ہے۔

تبیان التحقیق

یہ رسالہ ضخامت کے لحاظ سے علامہ نیموی کی تصانیف میں سب سے کم یعنی ۹ صفحات پر مشتمل ہے لیکن قدر و قیمت اور اہمیت کے لحاظ سے پچھلی تمام تصانیف میں سب سے زیادہ گرانقدر اور اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ آثار السنن میں بعض احادیث کے سلسلے میں علامہ نیموی کی جو منفرد اور نادر تحقیقات ملتی ہیں ان میں سے زیادہ تر تحقیقات اس مختصر رسالے میں جمع کر دی گئی ہیں۔

آثار السنن

پچھلے صفحات میں علامہ نیموی کی جو مذہبی تصنیفات پیش کی گئی ہیں اور ان کے ذیل میں ان کی تحریر کے جو نمونے تحریر کئے گئے ہیں ان سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ فقہ کے ساتھ فن حدیث کے بھی بڑے عالم تھے اور انہیں اس فن میں پوری دسترس حاصل تھی۔ تاہم انہوں نے اس فن میں ایک الگ کتاب مرتب کی جو "آثار السنن" کے نام سے مشہور ہے اور ان کی تمام مذہبی تصنیفات میں سب سے زیادہ اہم اور قابل قدر ہے۔ چوں کہ فن حدیث میں اس کتاب کو نہایت اونچا مقام حاصل ہے اور علامہ نیموی کی شاہکار تالیف ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ پوری تفصیل کے ساتھ اس کا تعارف کرائیں اور اس کے علمی و تحقیقی مقام کو واضح کریں، اسکے علاوہ اس کے شروح و حواشی اور علمار کرام کے خیالات بھی پیش کریں تاکہ پورے طور پر اس کی قدر و قیمت واضح ہو سکے۔

آثار السنن دراصل احادیث کا ایک مجموعہ ہے جس میں ایسی صحیح احادیث جمع کی گئی ہیں جو مسلک احناف کی مؤید ہیں۔ یہ دو جزو پر مشتمل ہے۔ پہلا جزو کتاب الطہارت سے شروع ہو کر باب فی الصلوٰۃ بحضرۃ الطعام پر ختم ہوتا ہے۔ دوسرا جزو باب ما علی الامام سے شروع ہوتا ہے اور خاتمہ باب فی زیارۃ قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوتا ہے۔ اس کے بعد کے ابواب علامہ نیموی لکھنا ہی چاہ رہے تھے کہ پیام اجل آگیا اور رحلت فرما گئے۔ اس لئے افسوس ہے کہ یہ کتاب مکمل نہ ہو سکی۔ اگر یہ مکمل ہو جاتی تو احناف کے نقطۂ نظر سے نہایت عظیم الشان کارنامہ ہوتا، اور پورے علمائے احناف کے لئے قابل فخر تحفہ ہوتا۔

یہ کتاب قومی پریس لکھنؤ سے ۱۳۱۵ھ میں چھپی جو ۲۱۱ صفحات پر مشتمل ہے۔

مقصد تالیف

ہندستان کے دینی مدارس میں عام طور پر حدیث کی ایسی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جو شوافع علماء کی مرتب کردہ ہیں۔ علامہ نیموی کے زمانہ میں غیر مقلد علماء جو کہ ہر لحاظ سے علمائے احناف کے خلاف زہر افشانی کر رہے تھے اور نفرت کا جذبہ پیدا کر رہے تھے اس لئے جب وہ حدیث کی یہ کتابیں پڑھاتے تو مزید زہر افشانی کرتے اور طلباء کو یہ کہکر بدگمان کرنے کی کوشش کرتے کہ حنفی مسائل کی بنیاد جو کہ صحیح احادیث پر نہیں ہے اس لئے ان کا کوئی مستند اور باضابطہ مجموعہ احادیث نہیں ہے اور نہ ہندستان کے کسی عالم نے اس کی طرف توجہ کی ہے۔

یہ وقت کا ایک اہم چیلنج تھا جس کو علامہ نیموی نے قبول کیا اور یہ حقیقت تھی کہ علمائے احناف کی طرف سے اس وقت تک کوئی صحیح مجموعہ احادیث مرتب نہیں کیا گیا تھا چنانچہ علامہ نیموی نے اس ضرورت کو پورے طور پر محسوس کیا اور نہایت دیدہ ریزی، تلاش وجستجو، تحقیق اور محنت شاقہ کے بعد یہ کتاب مرتب کی جو "آثار السنن" کے نام سے موسوم ہے۔

علامہ نیموی نے اس کتاب کی تالیف کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک جگہ خود ہی لکھا ہے جو اس کتاب کے اخیر میں درج ہے۔

" یہ تو ظاہر ہے کہ حدیث میں پہلے بلوغ المرام یا مشکوٰۃ شریف پڑھائی جاتی ہے اور ان کے مؤلف شافع المسلک تھے، ان کتابوں میں زیادہ تر وہی حدیثیں ہیں جو مذہب امام شافعی کے مؤید اور مذہب حنفی کے خلاف ہیں اس پر طرہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر معلم در پردہ غیر مقلد ہوتے ہیں۔ بیچارے اکثر طلبا یہ ابتدائی کتابیں پڑھ کر مذہب حنفی سے بد عقیدہ ہو جاتے ہیں پھر جب صحاح ستہ کی نوبت آتی ہے تو ان کے

خیالات اور بھی بدل جاتے ہیں۔ علمائے حنفیہ نے کوئی ایسی کتاب قابل درس تالیف ہی نہیں کی کہ جس میں مختلف کتب احادیث کی وہ حدیثیں ہوں جن سے مذہب حنفی کی تائید ہوتی ہو بیچارے طلبہ ابتدا میں پڑھیں تو کیا اور ان کے عقائد درست ہوں تو کیوں کر، آخر بیچارے غیر مقلد نہ ہوں تو کیا ہوں۔ فقیر نے انہیں خیالات سے حدیث شریف میں آثار السنن نام ایک کتاب بنائے تالیف کی ہے"

کتب احادیث کی فراہمی کا اہتمام

علامہ نیموی نے جب آثار السنن کی تالیف کا ارادہ کیا تو اس کے لئے کافی اہتمام کیا مختلف مقامات سے حدیث شریف کی اہم کتابیں منگائیں۔ نادر اور قابل قدر مخطوطات جمع کئے، دور دراز مقامات کا سفر کیا۔ احباب اور اساتذہ فن کے یہاں خطوط لکھ کر معلومات فراہم کیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آثار السنن لکھتے وقت ان کے پاس حدیث کی بعض نادر کتابیں اور اہم قلمی نسخے اکٹھے ہو گئے۔

حدیث، نقد حدیث، رجال اور تاریخ حدیث کے نامور مصنفین و مؤلفین حافظ ابن حجر عسقلانی، علامہ ابن عبد البر، علامہ ذہبی، امام حمیدی، امام بخاری، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام مالک، امام ترمذی، ابن ماجہ، امام نسائی، امام عبد الرزاق امام بیہقی، امام دارمی، ابن حجر مکی ہیثمی، امام محمد، امام ابو حنیفہ، شیخ علی متقی گجراتی وغیرہ کی تقریباً تمام تصنیفات و تالیفات ان کے ذخیرۂ کتب میں آگئیں۔ ان میں بعض مصنفین و مؤلفین کے ایسے نادر اور نایاب قلمی نسخے بھی ہاتھ آگئے، جو نہ صرف ہندستان میں نایاب تھے بلکہ عرب میں بھی کم یاب تھے۔ ان میں کچھ ایسے نسخے بھی تھے جن کے بارے میں بعض ہندستانی علماء کو کوئی خبر نہ تھی کہ یہ نسخے کہاں ہیں۔ اور کس کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔

علامہ نیموی کی تحریر سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ انہوں نے اس غرض سے ہندستان کے علاوہ مصر، شام، روم، اور سعودی عربیہ کے سفر کا ارادہ بھی کیا تھا۔

اب علامہ نیموی کی وہ تحریر ملاحظہ کیجیے جس میں کتب حدیث کی فراہمی کے اہتمام کا ذکر انہوں نے خود ہی کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں،

"آج کل بطور مشکوٰۃ شریف حدیث میں آثار السنن نام کی ایک کتاب کی بنا ہے تالیف ڈالی ہے جس کے لئے بلاد مختلفہ خصوصاً مصر و روم و حرمین شریفین کا سفر درکار ہے۔ "السعی منی والاتمام من اللہ" اگر یہ کتاب تیار ہو گئی تو انشاء اللہ تعالیٰ حنفیہ کے لئے نہایت کارآمد ہوگی۔ حضرت واہب العطایا کا یہ مجھ پر بہت بڑا احسان ہے کہ فن حدیث میں جس کا شوق مجھ کو زیادہ ہے چند قلمی کتابیں ایسی ہاتھ آگئی ہیں جو ہندستان کیا عرب میں بھی کم یاب ہیں۔"[1]

خصوصیات کتاب

اب ہم چاہتے ہیں کہ اس کتاب کی چند اہم خصوصیات بیان کریں تاکہ پورے طور پر اس کا تعارف ہو سکے۔

(۱) ہندستان کی پہلی تالیف: اس کتاب کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہندستان کی پہلی کتاب ہے جس میں وہی صحیح احادیث جمع کی گئی ہیں جو مسلک احناف کی تائید کرتی ہیں اور فقہی ترتیب کے ساتھ خالص محدثانہ رنگ میں بحث کی گئی ہے۔ اس پر تاریخی لحاظ سے گفتگو آگے آرہی ہے۔

(۲) منفرد اور نادر تحقیقات: اس کتاب کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں علامہ نیموی نے احادیث و رجال کی صحت و عدم صحت اور ضعف کے بارے میں جابجا اپنے ذاتی خیالات کا اظہار کیا ہے اور انہیں قال النیموی

---

[1] آثار السنن: ۱

کہ کر پیش کیا ہے۔ یہ خیالات درحقیقت علامہ نیموی کی نہایت گراں قدر تحقیقات ہیں
میں نے ان کے اس طرح کے خیالات و تحقیقات کو شمار کیا تو صرف آثار السنن میں
سینتالیس [۴۷] تحقیقات ملی ہیں۔ جن میں سے پہلے جزو میں ۲۳ اور دوسرے جزو میں
۲۴ ہیں۔ یہ اس کے علاوہ ہیں جو آثار السنن کی حواشی التعلیق الحسن اور
تعلیق التعلیق میں پیش کی گئی ہیں۔ ان تمام تحقیقات میں کچھ ایسی تحقیقات بھی
ہیں جنہیں علامہ نیموی سے قبل کسی حنفی عالم نے کبھی بھی پیش نہیں کی تھیں۔
یہاں ان کی تحقیقات کے چند نمونے تحریر کیے جاتے ہیں، تاکہ مذکورہ بیان کی
وضاحت ہو سکے۔

ابواب النجاسات کے ذیل میں چند احادیث پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

قال النیموی والموقوف اصح فی الباب [۱]

آداب الخلاء کے ذیل میں کئی احادیث نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

قال النیموی النہی للتنزیہ وفعلہ صلی اللہ علیہ وسلم
کان للاباحۃ او مخصوصا بہ جمعا بین الاحادیث [۲]

نماز ظہر کے اوقات کے بارے میں احناف، شوافع اور مالکیہ کا زبردست اختلاف
پایا جاتا ہے۔ احناف کی تائید میں احادیث بیان کرتے ہوئے زوردار انداز میں
علامہ نیموی لکھتے ہیں:

قال النیموی استدل الحنفیۃ بھذا الحدیث علی ان وقت
الظہر لا ینقضی بعد المثل بل یبقی بعدہ ووقتہ ازید من وقت
العصر وفی الاستدلال بھا ابحاث وانی لم اجد حدیثا
صریحا ولا ضعیفا یدل علی ان وقت الظہر یبقی الی ان یصیر

[۱] ابواب النجاسات: ۱۱ [۲] باب آداب الخلاء: ۲۳

الظل مثلیہ وعن الامام ابی حنیفۃ فیہ قولان[1]

فقہا کے یہاں آمین بالجہر کا مسئلہ نہایت مختلف فیہ رہا ہے۔ شوافع نے اپنی تائید میں کئی احادیث پیش کی ہیں۔ ان احادیث کو نقل کرنے کے بعد علامہ نیموی اپنی تحقیق اس طرح پیش کرتے ہیں:

"قال النیموی لم یثبت الجہر بالتامین عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم و عن الخلفاء الاربعۃ وما جاء فی الباب فہو لا یخلو من شئی"[2]

دیہات میں نماز جمعہ پڑھی جائے یا نہیں اس کے بارے میں فقہا کے یہاں زبردست اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں کئی روایات لکھنے کے بعد علامہ نیموی فرماتے ہیں:

قال النیموی قولہ قریۃ من قری البحرین او قریۃ من قری عبد القیس تفسیر من جہۃ الراوی لا من کلام ابن عباسؓ والقریۃ قد تطلق علی المدن وکانت بجواثا بعض آثار المدینۃ وقال ابو عبید البکری فی معجمہ ھی مدینۃ بالبحرین لعبد القیس"[3]

اس سلسلے میں مزید لکھتے ہیں

"قال النیموی ان تجمیعہم ھذا کان برأیہم قبل ان تشرع الجمعۃ لا بامر النبی صلی اللہ علیہ وسلم کما یدل علیہ مرسل ابن سیرین اخرجہ عبد الرزاق"[4]

(۳) **فقہی ترتیب** | چوں کہ یہ کتاب احناف کی تائید میں لکھی گئی ہے اس لئے اس کے ابواب کی ترتیب فقہی مسائل کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ چنانچہ

---

[1] باب ما جاء فی الظہر: ۴۳ [2] باب الجہر بالتامین: ۹۵ [3] باب اقامۃ الجمعۃ فی القری
[4] باب اقامۃ الجمعۃ فی القری: ۸۱

سب سے پہلے اس کتاب کا آغاز کتاب الطہارت سے کیا گیا ہے۔ اور پھر اس کے تحت باب المیاہ، باب سور الھرہ اور باب الکلب کا عنوان قائم کرکے ان کے ذیل میں مناسب احادیث تحریر کی گئی ہیں۔ اسی طرح کتاب الصلوٰۃ کے نام سے ایک عنوان قائم کیا گیا ہے اور پھر اس کے تحت باب المواقیت، باب ماجاء فی الظہر، باب ماجاء فی العصر وغیرہ کا عنوان قائم کرکے متعلقہ احادیث بیان کی گئی ہیں۔

(۴) نئی وضع کردہ اصطلاحات علامہ نیموی نے اس کتاب میں احادیث کے راویوں کے لئے کچھ خاص قسم کی اصطلاحات وضع کی ہیں اور پھر انہیں کو خاص خاص موقع پر استعمال کیا ہے۔ جب تک قاری ان اصطلاحات کو ذہن نشین نہ کرلے اس وقت تک پورے طور پر وہ اس کتاب سے استفادہ نہیں کرسکتا، اور نہ کسی حدیث کی صحت وضعف کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔

علامہ نیموی نے ان اصطلاحات کی توضیح وتشریح خود ہی کر دی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: "واذا استعمل فیہ لفظ الشیخان فالمراد بہ البخاری والمسلم واذا استعمل لفظ الثلاثۃ فالمراد بہ ابوداؤد والنسائی والترمذی وللاربعۃ یراد بہ الثلاثۃ مع ابن ماجہ والخمسۃ للاربعۃ مع احمد والستۃ للاربعۃ مع الشیخین والجماعۃ لاصحاب الکتب الستۃ معہ وکثیرا ما لا اذکر مع الشیخین غیرھما من مخرجی الحدیث وایما اقول بعد ذکر بعض المخرجین وآخرون فالمراد بہ وغیرہ من اصحاب التخریج سواء کانوا من الجماعۃ او من غیرھم کالامام مالک والشافعی والدارمی وابن منده والطحاوی والطبرانی والدارقطنی والحاکم والبیھقی وامثالھم واذا عزوت حدیثا الی غیر واحد من اصحاب التخریج مصرحا

باسماءهم او القابهم فاللفظ للاول وكذالك الحكم بالصحة باعتبار روايته من غير نظر الى الاخرين واذا اكتفيت بالعلامة فان قلت الجماعة او الستة او الشيخان فاللفظ لاحدهما وان قلت غير ذالك من العلامة فاللفظ لاحدهم والحكم بالصحة باعتبار اسانيد جميعهم او بعضهم واما اذا حكمت بالضعف فالحكم باعتبار روايته كل واحد من الذين عزوت الحديث اليهم"[1]

(۵) مختلف کتب احادیث سے استفادہ۔ اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نہ صرف صحاح ستہ کی احادیث جمع کی گئی ہیں بلکہ ان کے علاوہ سنن، معاجم، اور مسانید کی جو بھی مستند اور ثقہ احادیث مل گئیں ان تمام سے استفادہ کیا گیا ہے اور انہیں استدلال میں پیش کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس میں المستدرک للحاکم، مصنف عبدالرزاق، مسند حمیدی الوہم والایہام لابن القطان، مصنف ابی بکر بن ابی شیبہ، کتاب المعرفۃ للبیہقی، المنتقی لابن الجارود، صحیح ابن خزیمہ، کتاب الاوسط للطبرانی وغیرہ جیسی نادر اور اہم کتابوں کے حوالے پاتے ہیں۔

(۶) صحیح وضعیف اسناد کی صراحت اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جو روائتیں صحیحین کے علاوہ حدیث کی دوسری کتابوں سے لی گئی ہیں ان کی اسناد کے بارے میں صراحت کردی گئی ہے کہ وہ صحیح ہیں یا غیر صحیح، چنانچہ کسی حدیث کے بارے میں اسنادہ صحیح کہا گیا ہے تو کسی کے بارے میں اسنادہ لین بتایا گیا ہے۔ اسی طرح کسی روایت کے بارے میں اسنادہ حسن کہا گیا ہے تو کسی کے بارے میں

---

[1] آثار السنن - ۱

وھو معلول بالانقطاع کہا گیا ہے۔

اس کے علاوہ اگر کوئی حدیث ایسی ہے جس کے بارے میں محدثین نے اختلاف کیا ہے تو اس کی بھی تصریح کر دی گئی ہے بیر بضاعہ کے بارے میں فرماتے ہیں رواہ الثلاثہ وآخرون وصححہ احمد وحسنہ الترمذی وضعفہ ابن القطان۔

(۷) **کثرت اسناد سے اجتناب** | اس کتاب کی ایک خصوصیت اختصار بھی ہے اور اس کی وجہ سے ہر روایت میں اس کے تمام اسانید کے بیان سے احتراز کیا گیا ہے، بلکہ اس کے بجائے ہر روایت کے آخری راوی کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر اگر حضرت ابوہریرہ کی کوئی روایت ہے تو صرف عن ابی ھریرہ کہہ کر وہ روایت بیان کر دی گئی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی حدیث ابو سعید الخدری سے مروی ہے تو عن ابی سعید الخدری کہہ کر وہ حدیث تحریر کر دی گئی ہے۔

غرض کہ یہی اختصار پوری کتاب میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔

(۸) **توثیق احادیث** | اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اگر کوئی روایت بیان کی گئی ہے تو دوسری اہم کتاب سے اس کی توثیق وتائید کر دی گئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اگر ضرورت پیش آئی ہے تو قرآن کی آیتوں اور صحابہ کے آثار سے بھی اس کی توثیق کر دی گئی ہے۔ کہیں کہیں تین تین چار چار کتابوں کے حوالوں سے توثیق کر دی گئی ہے۔ چنانچہ کہیں کسی روایت کے بعد صححہ الترمذی والبخاری والمسلم کہا گیا ہے تو کہیں رواہ الطبرانی والبیہقی والحاکم کہہ کر اس روایت کو مضبوط کیا گیا ہے۔

(۹) **تکرار احادیث سے پرہیز** اس کتاب میں عام طور پر تکرار حدیث سے پرہیز کیا گیا ہے اور جو حدیث ایک جگہ بیان کر دی گئی ہے حتی الامکان دوسری جگہ وہی حدیث بیان کرنے سے پرہیز کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کم صفحات میں زیادہ احادیث بیان کر دی گئی ہیں۔ غرض کہ آثار السنن کی یہ چند خصوصیات ہیں جنکے مطالعہ سے اس کتاب کی اہمیت ہمارے سامنے آتی ہے اور علامہ نیموی کے تبحر علمی کا ثبوت ملتا ہے۔

شروح وحواشی

کسی کتاب کی قدر وقیمت اس کی شروح وحواشی سے بھی لگائی جا سکتی ہے کیوں کہ علمی اعتبار سے جس معیار کی کتاب ہوتی ہے اسی معیار کے لوگ اس کی شروح وحواشی لکھتے ہیں۔ آثار السنن کی عظمت کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس کے دو حواشی خود اسکے مؤلف نے لکھے ایک کا نام "التعلیق الحسن" ہے اور دوسری کا "تعلیق التعلیق" اس کے علاوہ ہندستان کے مشہور عالم اور محدث انور شاہ کشمیری نے اس کا ایک حاشیہ لکھا اور اس کا نام "الاتحاف لمذہب الاحناف" رکھا۔

اس کے علاوہ مولانا عبد الرشید فوقانی نے العول الحسن کے نام سے اور مولانا حفیظ الرحمٰن سابق پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ نے "القول الاحسن" کے نام سے شرحین لکھی ہیں۔ اب ہر ایک حاشیہ وشرح کا تعارف ملاحظہ کیجیے اور اس کی قدر وقیمت کا اندازہ لگائیے۔

التعلیق الحسن

یہ نہایت اہم اور مفید حواشی ہیں جو خود علامہ نیموی کی لکھے ہوئے ہیں۔ کیوں کہ آثار السنن میں صرف احادیث جمع کر دی گئی ہیں، اور اس ضمن میں جا بجا ان کے ضعیف یا صحیح وغیرہ ہونے کی

صراحت کردی گئی ہے۔ لیکن ان کے ضعیف ہونے کے کیا اسباب ہیں۔ کون کون سے راوی کمزور ہیں اسی طرح اگر کوئی حدیث صحیح ہے لیکن شوافع نے اس کو کمزور بتایا ہے تو کس وجہ سے ضعیف بتایا ہے اور پھر احناف کی طرف سے کیا مناسب جواب دیا گیا ہے۔ یہ تمام تفصیلات مذکورہ حواشی میں بیان کی گئی ہیں۔

اس کے علاوہ آثار السنن میں اگر کسی روایت کے بارے میں رواہ آخرونی رواہ غیر واحد من المحدثین یا ھو معلول کہہ دیا گیا ہے تو اس کے حاشیہ میں ان تمام راویوں کے نام اور ثقاہت و عدم ثقاہت کی تفصیل دے دی گئی ہے مختلف ناقدین حدیث کے اقوال و بیانات تحریر کر دیئے گئے ہیں تاکہ روایت کی پوری تفصیل ناظرین کے سامنے آسکے۔

اس حاشیہ میں علامہ نیموی نے بعض روایات یا ان کے رواۃ کے بارے میں ایسی نادر تحقیقات پیش کی ہیں جو اس کے علاوہ کسی اور جگہ نہیں ملتیں۔ اس لحاظ سے اس حاشیہ کی کافی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔

غرض کہ یہ حاشیہ کافی تحقیقی اور علمی انداز میں لکھا گیا ہے، اور آثار السنن کے سمجھنے کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ خاص طور پر رجال سے متعلق جو مباحث ہیں وہ نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔

تعلیق التعلیق

یہ علامہ نیموی کا حاشیہ بر حاشیہ ہے، جب التعلیق الحسن چھپ گئی تو علامہ نیموی نے ضرورت محسوس کی کہ بعض مقامات پر مزید تشریحی نوٹ دیں چنانچہ اسی ضرورت کے تحت انہوں نے جابجا مزید باتیں تحریر کیں اور تعلیق التعلیق نام رکھ کر اسے چھپوا دیا۔

اس کا تحقیقی اور علمی انداز وہی ہے جو التعلیق الحسن کا ہے۔ لیکن اگر

التعلیق الحسن میں کسی روایت کے بارے میں رواہ احمد یا حدیث صحیح یا ضعیف کہہ دیا گیا ہے تو اس حاشیہ میں اس کی تفصیل اور صحت وضعف کی وجہ بیان کردی گئی ہے۔

الاتحاف لمذہب الاحناف

یہ دراصل مولانا انورشاہ کشمیری کی ضروری اور اہم یادداشتیں ہیں۔ جو آثارالسنن کے دوران مطالعہ قلم بند کی گئی ہیں ــــ مولانا انورشاہ کشمیری چونکہ علامہ نیموی کے علمی فضل وکمال کے نہایت معترف اور ان کے عقیدت مند تھے۔ اس لئے آثارالسنن جب ان کے یہاں پہنچی تو اس کا بغور مطالعہ کرتے اور اسکو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اس دوران میں کوئی اہم چیز یاد آجاتی یا اس کتاب میں نظر آجاتی تو اس کتاب کے کنارے لکھتے جاتے تھے یہاں تک کہ یہ خود کتابی شکل میں تیار ہو گئی۔

اس کا عکسی نسخہ ۲۶۸ صفحات پر مشتمل ہے جس کو مولانا محمد بن موسیٰ میاں سملکی نے ۱۹۵۹ء میں مجلس علمی ڈابھیل کی طرف سے لندن سے شائع کرایا تھا۔ شروع میں پاکستان کے مشہور عالم حدیث مولانا یوسف بنوری کے قلم سے اس کتاب کا تعارف بھی شامل ہے۔

اس کتاب پر جو یادداشتیں ہیں وہ عموماً آثارالسنن سے متعلق ہیں، بعض صفحات پر پچاسوں نوٹ اور پچاسوں حوالے تحریر کئے گئے ہیں، جو حوالے نادر اور اہم کتابوں کے ہیں، ان کی اصل عبارت بھی بقدر ضرورت دے دی گئی ہے۔ اگر مشہور کتابیں ہیں تو صرف ان کے حوالوں پر اکتفا کیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ علامہ انورشاہ کشمیری کا یہ نہایت عمدہ، مفید اور تحقیقی

وعلمی حاشیہ ہے جس کے مطالعہ سے حاشیہ نگار کی دیدہ ریزی، محنت اور وسعت معلومات کا علم ہوتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ آثار السنن کی قیمت کافی بڑھ جاتی ہے۔

القول الحسن

یہ مولانا عبد الرشید فوقانی کی شرح ہے۔ جو دراصل کتاب ابکار المنن فی جواب آثار السنن کی رد میں اور آثار السنن کی تائید میں لکھی گئی ہے۔ اس لئے یہ گویا بالواسطہ آثار السنن کی شرح کہی جائیگی شارح نے پہلے علامہ نیموی کی پیش کردہ احادیث اور دلائل بیان کئے ہیں اس کے بعد مصنف ابکار المنن کے اعتراضات نقل کرکے ان کے جوابات تحریر کئے ہیں۔ بہت سے مقامات پر علامہ نیموی کے دلائل کی توضیح وتشریح کی ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ یہ آثار السنن کی ایک مفید اور معلوماتی شرح ہوگئی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے مکمل نہ ہوسکی، صرف باب المیاہ سے باب الجہر بالتامین تک کے ابواب پر مشتمل ہے۔

القول الاحسن

یہ شرح مولانا حفیظ الرحمن سابق پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کی ہے جو القول الاحسن فی شرح آثار السنن کے نام سے چھپی۔

اس کتاب کے شروع میں حدیث کی تعریف، اسکی اقسام، کتب حدیث کی اقسام کی تفصیل وتعریف دی گئی ہے۔ اس کے بعد یہ شرح شروع ہوتی ہے۔ یہ شرح اردو زبان میں لکھی گئی ہے۔ سب سے پہلے کسی حدیث کا معنی و مفہوم بیان کیا گیا ہے، اس کے بعد اس کی لغوی اور نحوی ترکیب بتائی گئی ہے۔

اور پھر متعلقہ اور ضروری امور بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ جہاں مختلف فیہ احادیث ہیں وہاں اختلافات واضح کئے گئے ہیں، اور پھر احناف کی طرف سے

علامہ نیموی کی تحقیقات کی روشنی میں ان کے جوابات دیئے گئے ہیں۔
ہر باب کی تقدیم و تاخیر اور اس کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔
غرض کہ اردو زبان میں آثار السنن کی یہ ایک مفید شرح ہے۔
جو شارح کی محنت اور صلاحیت کی نشان دہی کرتی ہے۔

بابِ یازدہم

علامہ نیموی بحیثیت محدث

ہندستان میں حدیث نبوی کی ترویج و اشاعت کی تاریخ نہایت قدیم ہے۔ مشہور روایت کے مطابق شیخ ربیع بن صبیح سعدی پہلے محدث ہیں جو خلیفہ مہدی کے زمانہ میں ۱۵۹ھ میں ہندستان آئے۔ حدیث کے موضوع پر کچھ لکھا۔ ۱۶۰ھ میں وفات پائی اور اسی سرزمین کے کسی جزیرہ میں مدفون ہوئے۔[۱]

اس کے بعد شیخ اسماعیل کا نام قابل ذکر ہے جو پانچویں صدی ہجری میں محمود غزنوی کے زمانے میں لاہور آئے اور حدیث نبوی کی ترویج و اشاعت میں مصروف ہو گئے یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے حدیث و تفسیر کی باضابطہ تبلیغ و اشاعت کی۔[۲]

لاہور کی دوسری عظیم شخصیت شیخ حسن بن محمد صغانی لاہوری (م ۶۵۰ھ) کی ہے جو لاہور ہی میں پیدا ہوئے یہیں پرورش پائی اور مشارق الانوار نامی کتاب مرتب کی جو صدیوں بعد تک ہندستان کے دینی مدارس میں داخل درس رہی۔ یہ دراصل ایک مجموعہ احادیث ہے جس میں مختلف موضوعات کے تحت صحیح احادیث جمع کی گئی ہیں۔

اس کے بعد شیخ نورالدین شیرازی، مولانا رضی الدین گجراتی، شیخ علی متقی، شیخ عبدالوہاب متقی، محمد طاہر پٹنی اور شیخ محمد لاہوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے اپنے عہد میں درس و تدریس اور اہم تصنیفات و تالیفات کے۔

---

[۱] رجال السند والہند: ۲۵۵ یاد ایام: ۵ [۲] تذکرہ علمائے ہند: ۲۵

ذریعہ حدیث نبوی کی گراں قدر خدمات انجام دیں لیکن انہوں نے اپنے مدارس میں حدیث کی وہی کتابیں پڑھائیں جو شوافع علماء کی مرتبہ تھیں اور حدیث کی وہی کتابیں تالیف کیں جو زیادہ تر شوافع علماء کی کتابوں پر شروح و حواشی تھیں نتیجہ یہ ہوا کہ اس ملک میں شوافع مسلک کی ترویج و اشاعت زیادہ ہوتی رہی۔ جہاں تک حنفی مسلک کی ترویج و اشاعت کا سوال ہے، اس نقطۂ نظر سے نہ تو کوئی مجموعہ احادیث مرتب کیا گیا اور نہ کوئی گراں قدر کتاب تصنیف کی گئی، گیارہویں صدی ہجری میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی پہلے حنفی عالم دین ہیں جنہوں نے شروح و حواشی سے ہٹ کر خاص طور پر مسلک احناف کی تائید میں ایک مجموعہ احادیث مرتب کیا جو فتح المنان فی تائید مذہب النعمان کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ مجموعہ احادیث خالص فقہی رنگ میں لکھا گیا تھا اور یہی رنگ اس پر غالب ہے۔ اس کے بعد شیخ سید مرتضیٰ بلگرامی زبیدی دوسرے حنفی عالم ہیں جنہوں نے عقود الجواہر المنیفہ کے نام سے ایک مستقل کتاب مرتب کی اور اس میں وہی احادیث جمع کیں جو مسلک احناف کی موئد ہیں۔ اس میں گرچہ فقہی مباحث نہیں ہیں لیکن نقد احادیث اور رواۃ کے جرح و تعدیل کے مباحث سے تقریباً یہ کتاب خالی ہے۔ نہایت تعجب ہے کہ تیرہویں صدی ہجری تک لاہور، گجرات، سندھ، دہلی، حیدرآباد، لکھنؤ اور دیوبند جیسی علمی مراکز میں بے شمار حنفی علما پیدا ہوئے اور انہوں نے بہت ساری کتابیں دینی موضوعات پر تصنیف و تالیف کیں۔ لیکن فن حدیث میں کوئی ایسی ایک کتاب بھی تالیف نہ کر سکے جو خالص محدثانہ رنگ میں ہوتی اور مسلک احناف کی تائید کرتی۔

انہوں نے درس و تدریس اور تصنیفات و تالیفات کے ذریعہ بلاشبہ حدیث شریف کی اہم خدمات انجام دیں۔ لیکن ان کی یہ خدمات زیادہ تر شروح و حواشی تک محدود

نقیس۔ یہ کہتے ہوئے ہم نہایت فخر محسوس کرتے ہیں کہ اس قدر اہم اور عظیم الشان خدمت کے لئے اللہ تعالیٰ نے صوبہ بہار کی سرزمین کو منتخب کیا اور اس سرزمین کے ایک فرد کو اس عظیم کارنامہ کے لئے چن لیا میری مراد اس سے محقق دوراں محدث عصر اور سرتاج علمائے احناف علامہ ظہیر احسن شوق نیموی ہیں جنھوں نے فقہی ترتیب کے ساتھ خالص محدثانہ رنگ میں آثار السنن کے نام سے ایک مجموعہ احادیث مرتب کیا اور اس میں وہی صحیح احادیث جمع کیں جو مسلک احناف کی موئد ہیں۔

اس کے علاوہ نقد احادیث اور رواۃ کے جرح و تعدیل کے مباحث بھی نہایت فاضلانہ اور محدثانہ رنگ میں پیش کئے۔ اس موقع پر ہندستان کے مشہور محدث اور عالم دین مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی مدظلہ العالی کا خیال پیش کرنا نہایت مفید ہوگا جس کو انھوں نے راقم سطور کے دریافت کرنے پر اپنے ایک خط میں ظاہر فرمایا تھا۔ مولانا کا اصل خط ملاحظہ فرمایئے۔

۷۸۶

مئو
۲۸ر جولائی ۱۹۷۰ء

عزیزم سلمہ اللہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

ہندستانی علمائے اعلام میں حنفی نقطۂ نظر سے غالباً سب سے پہلے شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ایک مجموعہ احادیث فتح المنان فی تائید مذہب النعمان کے نام سے تالیف فرمایا ہے۔ یہ مجموعہ تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک نسخہ مئو میں اور ایک جامعہ ملیہ کے کتب خانہ میں ہے، میں نے اس کا مطالعہ کیا ہے۔ مگر وہ کتاب فقہی رنگ میں لکھی گئی ہے۔ اور اس میں یہی رنگ نمایاں ہے۔ ہندستانی

ہی کہ ایک اور عالم جن کا سکہ بلاد اسلامیہ میں ابھی بیٹھا ہوا ہے۔ سید مرتضیٰ بلگرامی زبیدی ہیں۔ انہوں نے بھی اسی نقطۂ نظر سے ایک کتاب لکھی جس کا نام "عقود الجواہر المنیفہ" ہے اس میں فقہی مباحث نہیں ہیں مگر اس کے ساتھ وہ جرح و تعدیل رواۃ اور نقد احادیث کے فنی مباحث سے بھی قریب قریب خالی ہے۔ خالص محدثانہ میں حنفی نقطۂ نظر سے ہندستان میں جو پہلی کتاب لکھی گئی جہاں تک مجھے معلوم ہے "آثار السنن" ہے۔ میری نگاہ میں اس کتاب کی بہت قدر و قیمت ہے اور مولانا ظہیر احسن شوق نیموی کا تصنیفی شاہکار ہے۔ ہمارے استاذ مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ بھی اس کتاب کی بہت قدر کرتے تھے۔ اس کتاب اور اس کے مؤلف کی منقبت میں ان کا ایک قصیدہ آثار السنن کے آخر میں طبع ہو چکا ہے۔ اس سے بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے اس کتاب کو ہمیشہ مطالعہ میں رکھ کر اس کے مباحث میں بکثرت اضافے کئے ہیں۔

والسلام

حبیب الرحمٰن الاعظمی

بقلم۔ رشید احمد

اس کے علاوہ علامہ نیموی کا دوسرا اہم کارنامہ یہ ہے کہ جن روایات پر شوافع علماء سیکڑوں برس سے اعتراض کرتے چلے آرہے تھے اور انہیں مجروح قرار دے رہے تھے، علامہ نیموی نے ان کے مدلل جواب دیئے، اور اس ضمن میں کچھ ایسی منفرد اور نادر تحقیقات پیش کیں کہ ان سے قبل متقدمین و متاخرین علمائے احناف میں سے کسی نے بھی ایسی تحقیقات پیش نہیں کی تھیں۔ چنانچہ علامہ نیموی خود ہی بیان التحقیق میں ایک جگہ فرماتے ہیں :۔

وقد تفردت فی مواضع من آثار السنن بتحقیقات عجیبة وفوائد غریبة خلت عنها زبر المحدثین ولم یظفر بها احد من المتقدمین والمتاخرین وسنذکر لک بعض منها حتی یاتیک الیقین و یکون تبصرة لک ولسائر الناظرین[1]

(ترجمہ) میں نے آثار السنن میں چند ایسی نادر تحقیقات پیش کی ہیں جو نہ تو متقدمین علما کے یہاں پائی جاتی ہیں اور نہ متاخرین علما کے یہاں۔ ہم عنقریب کچھ تحقیقات پیش کریں گے تاکہ تمہیں اس کا یقین ہو جائے۔

اس کے علاوہ آثار السنن میں ایک حدیث نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

فالحدیث معلولٌ بثلاثة وجوه و قد بینت ضعفه بادلة قویة لم یسبق الی بعضها ذهن احد من المتقدمین فضلا عن المتاخرین[2]

یہ حدیث تین وجوہ کی بنا پر معلول ہے اور میں نے اس کے ضعف کی ایسی قوی دلائل پیش کی ہیں کہ متقدمین اور متاخرین علما میں سے کسی کا ذہن انکی طرف نہیں گیا تھا۔

علمائے احناف کی طرف سے پذیرائی اور استفادہ

جب آثار السنن چھپ کر منظر عام پر آئی تو علمائے احناف بہت خوش ہوئے اور انہوں نے اپنی تقریر و تحریر سے اس پر اظہار مسرت کیا چنانچہ علامہ نیموی نے ۱۳۱۸ھ میں جب اس کا ایک نسخہ حضرت مولانا شاہ محمد عبد الحق مہاجر مکی کے یہاں بھیجا تو انہوں نے جواباً ایک خط لکھا اور اس پر اظہار مسرت کیا۔ خط کے چند جملے ملاحظہ کیجئے۔

"آپ کی کتاب آثار السنن عین عید کے روز اس وقت پہنچی جب علمائے مکہ کی ایک جماعت موجود تھی، ان لوگوں نے آپ کی کتاب پڑھی اور آپ کی

---

[1] تبیان التحقیق: ۳ [2] آثار السنن: ۷۵

تحقیقات نادرہ معلوم کر کے بے حد مسرور ہوئے اور آپ کو دعائیں دیں۔!

اسکے علاوہ ہندستان کے وہ حنفی علما جو فن حدیث میں سب سے زیادہ عظیم المرتبت، باوقار، اور مستند سمجھے جاتے تھے، انہوں نے بھی اس کی طباعت پر نہ صرف اظہار مسرت کیا بلکہ اپنی اپنی تصنیفات وتالیفات میں قال النیموی یا قال العلامہ النیموی کہہ کر جابجا علامہ نیموی کی تحقیقات کے حوالے پیش کیے۔ یہ تحقیقات مختلف طریقوں سے پیش کی گئی ہیں۔ بعض جگہ آثار السنن کی کوئی حدیث صحیح ہونے کی بناپر بطور تائید تحریر کی گئی ہے۔ کسی جگہ علامہ نیموی کے بیان کردہ خاص معنی ومفہوم سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کسی حدیث کے صحیح، ضعیف، مرفوع، مرسل، حسن وغیرہ ہونے پر جو تحقیقات پیش کی گئی ہیں۔ ان سے علمائے احناف نے خاص طور پر استفادہ کیا ہے اور انہیں سند کے طور پر پیش کیا ہے، اسی طرح رجال حدیث کے ثقہ وعدم ثقہ، عادل وغیر عادل اور صحیح وضعیف ہونے پر علامہ نیموی نے جو گراں قدر اور منفرد خیالات پیش کیے ہیں انہیں ہندستان کے تقریباً بھی ممتاز علمائے احناف نے اپنی اپنی تصنیفات وتالیفات میں پیش کیے ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ علامہ نیموی کی تحقیقات کو علمائے ہند نے اس شان اور اہمیت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ انہیں پڑھ کر شبہ ہونے لگتا ہے کہ علامہ شوق نیموی عرب، نیشاپور بغداد یا بخاری کے باشندہ ہیں، نہ کہ نیمی کے جو ہندستان کے صوبہ بہار کا ایک معمولی قصبہ ہے۔

چنانچہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا کہ جب میں ۱۹۸۲ء میں آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے سہ روزہ اجلاس منعقدہ دار العلوم

ندوۃ العلماء لکھنؤ میں شریک ہوا اور "بہار میں علوم اسلامیہ کا ارتقا" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا جس میں علمائے بہار کی علمی و دینی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے علامہ شوق نیموی کی حدیث کی خدمات پیش کیں تو حدیث کے ایک اچھے عالم نے کھڑے ہو کر میرے مقالے پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ آج یہ جان کر بہایت خوشی ہوئی کہ علامہ نیموی ہندستان کے باشندہ تھے۔ ورنہ میں ابتک یہ سمجھتا تھا کہ وہ عرب کے کسی خطہ کے رہنے والے ہیں، کیوں کہ علمائے ہند نے کثرت سے ان کی کتاب کے حوالے پیش کئے ہیں۔

اب میں درج ذیل سطور میں چند ایسے علمائے کرام کے نام اور ان کی تالیفات پیش کرتا ہوں جن کا مقام خود فن حدیث میں مسلم ہے اور اس فن کے وہ امام سمجھے جاتے ہیں تاہم انھوں نے اپنی تالیفات میں علامہ نیموی کی تحقیقات پیش کی ہیں اور ان سے استفادہ کیا ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیری

علامہ انور شاہ کشمیری علامہ نیموی کے علمی تبحر اور مہارت حدیث سے بہایت متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آثار السنن کا نسخہ ان کے یہاں پہنچا تو انھوں نے اس پر حاشیہ لکھا جو الاتحاف لمذہب الاحناف کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ اپنی دوسری تصنیفات مثلاً فیض الباری اور العرف الشذی وغیرہ میں علامہ نیموی کی تحقیقات نقل کی ہیں۔ یہاں صرف العرف الشذی سے چند نمونے تحریر کئے جاتے ہیں۔ قرأۃ خلف الامام کے ذیل میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

واما مرفوع ابن مسعود ففی آثار السنن صـ۸۰ رواہ الطحاوی و الطبرانی واما فتواہ فمشہور وقرائن اخر علی دعوینا فی روایۃ انس

مرفوعة فانه روى عنه ابن ابى شيبة فى مصنفه [1]

صلوٰۃ وتر کے سلسلے میں ایک جگہ لکھتے ہیں

بل استمر امره على الوتر بركعة واحدة كما نقل فى آثار السنن ص ۹/۲۲ عن الرافعى فى شرح الوجيز وفيه قال محمد بن نصر المروزى لم نجد عن النبى صلى الله عليه وسلم خبراً ثابتاً صريحاً انه اوتر بثلث موصولة [2]

اس کے علاوہ ذوالیدین اور خرباق بن عمرو کے ایک ہونے کے سلسلے میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

واما ذواليدين فهو خرباق بن عمرو من بنى سليم واتوا بنقول على بداهة دالة على كونهما رجلين والاحناف فلهم ايضاً نقول عديدة على انهما رجل واحد ونقول الطرفين ذكرها مولانا ظهير احسن فى آثار السنن وعن نقولنا رواية النسائى [3]

مولانا خلیل احمد سہارنپوری

مولانا خلیل احمد سہارنپوری ہندوستان کے مشہور علماء میں شمار ہوتے ہیں خاص طور پر حدیث شریف میں انہیں ایک مقام حاصل ہے۔ یہ علامہ نیموی کے معاصر ہیں۔ انھوں نے آثار السنن سے کافی استفادہ کیا اور پھر اپنی تصنیفات میں جا بجا علامہ نیموی کی تحقیقات تحریر کی ہیں۔ خاص طور پر بذل المجہود میں استفادہ کیا ہے اور مستفاد کتابوں کی فہرست میں آثار السنن اور اسکی تعلیق کو بھی پیش کیا ہے۔ جس سے علامہ نیموی کے ساتھ ان کی پرخلوص محبت اور

---

[1] العرف الشذی: ۱/۱۵۲ [2] العرف الشذی ۱۵ [3] العرف الشذی: ۱۷۹

علمی تعلق کا اندازہ ہوتا ہے۔ دیکھئے بذل المجہود کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

"وکان عندی حین املاء هذا التعليق كتب من العلوم المختلفة فمن علم الحديث وشروحه الصحاح الستة والموطأن لمالك بن انس ولمحمد بن الحسن الشيباني وسنن الدارمي والدارقطني ومصنف ابن ابي شيبة والسنن الكبرى للبيهقي وانجاح الحاجة على ابن ماجة لحضرة الاستاذ الشيخ عبد الغني وآثار السنن وتعليقه كلاهما لمولانا الشوق النيموي"[1]

اس کے بعد بذل المجہود میں سلیمان التیمی کے تفرد کے سلسلے میں علامہ نیموی کی ایک منفرد اور بے مثال تحقیق قال العلامہ النیموی کہہ کر یوں پیش کرتے ہیں۔

وأما ادعاءهم في حديث ابي موسى الاشعري تفرد سليمان التيمي بهذه الزيادة فهذا ايضا غلط وباطل فان عمرو بن عامر وسعيد بن ابي عروبة عن قتادة تابعه كما في الدارقطني من حديث سالم بن نوح وقال العلامة النيموي وسالم بن نوح هذا وان قال الدارقطني ليس بالقوي فقد اخرج له مسلم وابن خزيمة وابن حبان في صحاحهم — قلت قال ابو زرعة لا بأس به صدوق ثقة وقال الساجي صدوق ثقة واهل البصرة اعلم به من ابن معين وذكره ابن معين وابن شاهين في الثقات وقال ابن قانع هو بصري ثقة قاله الحافظ في تهذيب التهذيب وقد ذكر العلامة النيموي متابعا آخر لسليمان التيمي من صحيح ابي عوانة ثنا سهيل بن بحر ثنا عبد الله

---

[1] بذل المجہود: ۱/۲

بن رشید ثنا ابو عبیدہ من قتادہ وفیہ واذا قرا الامام فانصتوا فبطل بذالک دعوی تفرد سلیمان"[1]

مولانا شبیر احمد عثمانی

مولانا شبیر احمد عثمانی ہندستان کے مشہور عالم ہیں، خاص طور پر حدیث کے مستند فاضل ہیں، یہ علامہ نیموی کے نہایت معتقد اور ان کے تبحر سے بے حد متاثر تھے، یہی وجہ ہے کہ اپنی کتاب فتح الملہم میں ________ جا بجا ان کی تحقیق نقل کی ہے اور انہیں بطور سند اور دلیل پیش کیا ہے، چنانچہ دیکھئے باب استحباب رفع الیدین کے تحت ایک جگہ لکھتے ہیں:

قلت وکذالک سائر ما اوردوہا مثالا لنسیانہ لم یکن نسیانہ بل کان لہ وجہ آخر قد بینوہ فی موضعہ واول من نسب النسیان الی عبد اللہ بن مسعود فی ہذہ المواضع ہو ابو بکر بن اسحاق نقل قولہ البیہقی فی سننہ ثم ابن عبد الہادی فی التنقیح وقد بالغ فی رد کلام ابی بکر بن اسحاق ہذا العلامہ ابن الترکمانی فی الجوہر النقی فی الرد علی البیہقی کذا قال النیموی فی آثار السنن"[2]

پھر اسی باب میں دوسری جگہ لکھتے ہیں:

" واما ما قال الحاکم من روایۃ الاسود لا تعارض بہا الاخبار الصحیحۃ من طاؤس بن کیسان عن ابن عمر کان یرفع یدیہ فی التکبیر فی الرکوع وعند الرفع عنہ فقال النیموی زیادۃ قولہ ان عمر سہو غیر صحیحۃ

[1] بذل المجہود: ۱/۳۳۹ [2] فتح الملہم ۲/۱۴

والصواب عن ابن عمر كان يرفع يديه واتی علیه بقرائن توجب التردد فی صحتها[1] قرأت فاتحہ کے ذیل میں علامہ نیموی کی تحقیق اس طرح پیش کرتے ہیں،

قال النیموی واما ما رواہ الحاکم فی المستدرک وزعم مستقیم الاسناد عن عطاء وعن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم من صلی صلوٰۃ مکتوبۃ مع الامام فلیقرأ بفاتحۃ الکتاب فی سکتاتہ الحدیث ففیہ محمد بن عبد اللہ بن عبید بن عمیر اللیثی ضعفہ ابن معین والدارقطنی وقال البخاری منکر الحدیث وقال النسائی متروک ومع ذالک اختلف فی اسنادہ [illegible] مرۃ عن عطاء عن ابی ھریرۃ مرفوعاً کما ھو عند الحاکم ومرۃ [illegible] عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ مرفوعاً کما ھو عند الدار قطنی فلا یحتج بہ۔

پھر باب وضع یدہ الیمنی علی الیسری تحت صدرہ کے تحت لکھتے ہیں۔

"وروی البیھقی فی سننہ من طریق محمد بن المثنی عن مؤمل بن اسماعیل عن الثوری عن عاصم بن کلیب عن ابیہ عن وائل بن حجر انہ رای النبی صلی اللہ علیہ وسلم وضع یمینہ علی شمالہ علی صدرہ قال العلامہ النیموی زیادۃ علی صدرہ غیر محفوظۃ فان الحدیث رواہ احمد فی مسندہ من طریق عبد اللہ بن الولید عن سفیان عن عاصم بن کلیب عن ابیہ عن وائل بن حجر واحمد والنسائی من طریق زائدہ عن عاصم عن ابیہ عن وائل وابوداؤد من طریق بشر بن المفضل عن عاصم عن ابیہ عن وائل واحمد من طریق عبد

---

[1] فتح الملھم : ۱۵/۲

الواحد وزهير ابن معاوية وشعبة عن عاصم عن ابيه عن ابی وائل كلهم بغير هذه الزيادة - وقد نص ابن القيم فی اعلام الموقعين لم يقل على صدره غير مؤمل بن اسمعيل عن سفيان الثوری فثبت انه متفرد فی ذالک وقد روی هذا الحديث من طريق علقمة وغيره عن وائل بن حجر وليس فيه هذه الزيادة فلا شك انها غير محفوظة.

وقال النيموی ومؤمل بن اسماعيل ليّنه غير واحد قال الذهبی فی الكاشف صدوق شديد فی السنة كثير الخطاء وقيل دفن كتبه وحدث حفظا فغلط وقال الحافظ ابن حجر فی تهذيب التهذيب قال البخاری مؤمل منكر الحديث وقال ابن سعد ثقة كثير الغلط وقال ابن قانع صالح يخطئ وقال الدارقطنی ثقة كثير الخطا وقال فی التقريب صدوق سیئ الحفظ وقال ابن التركمانی فی الجوهر النقی فی الرد علی البيهقی قلت مؤمل هذا قيل انه دفن كتبه فكان يحدث من حفظه فيكثر خطاءه كذا ذكره صاحب الكمال فی الميزان قال البخاری منكر الحديث وقال ابو حاتم كثير الخطأ وقال ابو زرعة فی حديثه خطأ كثيرا انتهی كلامه [1]

قرأت فاتحہ کے ذیل میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

"وقد رد العلامة النيموی فی آثار السنن وجوه الطعن فيه و اظهر صحته من شاء فليراجع" [2]

آمین بالجہر کے ذیل میں حضرت شعبہ کی روایت کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

"وقال النيموی وعندی وجه حسن لترجيح رواية شعبة على ما

---

[1] فتح الملہم: ۲/۳۹-۴۰۰ [2] ایضاً ۲/۲۲

رواہ الثوری وھو ان شعبۃ لم یکن یدلس الا عن الضعفاء ولا عن الثقات
الخ قال الذھبی فی تذکرۃ الحفاظ قال ابو زید الھاروں سمعت شعبۃ
یقول لان اقع من السماء فانقطع احب الی من ان ادلس انتہی قلت
ومع انہ لا یدلس قد صرح فیہ بالاخبار قال اخبرنی سلمہ بن کہیل
کما ھو عند ابی داؤد الطیالسی واما الثوری فکان ربما یدلس و
قد عنعنہ قال الذھبی فی المیزان سفیان بن سعید الحجۃ الثبت
متفق علیہ مع انہ کان یدلس عن الضعفاء ولکن لہ نقد وذوق
ولا عبرۃ بقول من قال یدلس ویکذب عن الکذابین انتہی ۔ قلت فبھذا
یرجح ما رواہ شعبۃ من حدیث ..... علی ما رواہ الثوری عن
حدیث الرفع لشبھۃ التدلیس فیہ انتہی کلام النیموی [۱]

اس کے علاوہ مختلف مقامات پر مولانا شبیر احمد عثمانی نے علامہ نیموی کی
تحقیقات نقل کی ہیں اور انہیں سند کے طور پر پیش کیا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی

مولانا اشرف علی تھانوی ہندستان کے
مشہور علماء دین ہیں۔ انہوں نے علامہ
نیموی کی تحقیقات سے کافی استفادہ کیا ہے خاص طور پر اعلاء السنن میں
جابجا ان کا حوالہ دیا ہے اور سند کے طور پر انہیں پیش کیا ہے۔

مولانا اشفاق الرحمن کاندھلوی

مولانا اشفاق الرحمن کاندھلوی
ہندستان کے مشہور عالم ہیں اور
حدیث میں پوری دسترس رکھتے [illegible]۔ انہوں نے الطیب الشذی شرح [illegible]

[۱] فتح الملہم ۲/۵۶

الحواشی الجدیدۃ علی سنن النسائی اور البعیۃ الالمعی فی تخریج الزیلعی میں جا بجا علامہ نیموی کی تحقیقات نقل کی ہیں۔

مولانا محمد زکریا سہارنپوری

مولانا محمد زکریا سہارنپوری علوم دینیہ اور خاص طور پر حدیث کے مشہور عالم ہیں۔ انہوں نے موطا امام مالک کی شرح اوجز المسالک میں جا بجا علامہ نیموی کی تحقیقات سے استفادہ کیا ہے۔ اور انہیں حوالے کے طور پر پیش کیا ہے۔

علمائے اہل حدیث پر ردعمل

آثار السنن چوں کہ تحقیقی لحاظ سے نہایت اہم کتاب تھی اور احناف کی تائید میں لکھی گئی تھی اس لیے اس کی طباعت سے ایک طرف علمائے احناف نہایت خوش ہوئے اور انہوں نے پورے طور پر اس سے استفادہ کیا تو دوسری طرف علمائے اہل حدیث پر اس کا بڑا سخت ردعمل ہوا اور وہ نہایت برہم ہوئے کیوں کہ آثار السنن میں جو تحقیقات پیش کی گئی تھیں ان سے شوافع مسلک کے ساتھ ساتھ جماعت اہل حدیث کے عقائد اور فقہی مسالک پر بھی کاری ضرب پڑ رہی تھی، یہی وجہ ہے کہ علمائے اہل حدیث کی طرف سے آثار السنن کے جواب میں مختلف کتابیں لکھی گئیں۔ خاص طور پر مندرجہ ذیل علمائے اہل حدیث نے کتابیں لکھیں اور اس کے جوابات دینے کی بھرپور کوششیں کیں۔

مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری

مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری جماعت اہل حدیث کے مشہور عالم ہیں اور حدیث کے فن میں کمال رکھتے ہیں۔ اس جماعت میں آثار السنن کی طباعت سے سب سے زیادہ وہی متاثر ہوئے اور انہوں نے اس کے جواب میں دو کتابیں خاص طور پر

لکھیں ایک کا نام ابکار المنن فی تنقید آثار السنن رکھا اور دوسری تحفۃ الاحوذی۔

ابکار المنن دراصل آثار السنن کی تنقید اور اس کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ چنانچہ مصنف اس کے مقدمہ میں اس کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اما بعد فهذا فوائد علقتها على آثار السنن وعلى تعليقه المسمى بالتعليق الحسن وعلى تعليق تعليقه المسمى بتعليق التعليق كلها للمولوي ظهير احسن النيموي اكثرها اعتراضات عليه ومناقشات له وبعضها معه وسميتها بابكار المنن في تنقيد آثار السنن"

اس کتاب میں پہلے علامہ نیموی کی تحقیقات نقل کی گئی ہیں پھر ان کا جواب دیا گیا ہے۔ دیکھیے ایک جگہ فرماتے ہیں:

قال النيموي ومنها ما اخرجه البخاري والدارقطني عن علي بن ابي طالب انه كان يامر ويحب ان يقرأ في الظهر والعصر بفاتحة الكتاب وسورة وفي الاخريين بفاتحة الكتاب انتهى۔ قال الدارقطني هذا اسناد صحيح عن شعبة قلت فيه سفيان بن حسين عن الزهري وهو في الزهري ضعيف. قال الذهبي في الميزان قال احمد ليس بذلك في الزهري الخ قلت قد غفل النيموي فان هذا الاثر رواه عن سفيان بن حسين شعبة وهو لا يحمل عن مشائخهم الا صحيح حديثهم كما صرح به الحافظ في فتح الباري ص۱ ولذلك قال الدارقطني بعد روايته هذا اسناد صحيح عن شعبة انتهى۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

وقال النیموی ومنھا مارواہ البخاری فی جزءہ بقولہ وروی سفیان بن حسین عن الزہری عن مولی جابر بن عبد اللہ قال جابر بن عبد اللہ اقرأ فی الظہر والعصر خلف الامام قلت لم یذکر البخاری تمام اسنادہ وقد مران سفیان بن حسین عن الزہری ضعیف ومولی جابر مجہول قلت روی البیہقی ھذا الاثر فی کتاب القراءۃ باسناد آخر لیس فیہ سفیان بن حسین ولا مولی جابر فقال اخبرنا ابو سعید محمد بن موسی نا ابو العباس الاصم نا احمد بن عبد الحمید نا ابو یحیی الحمانی عبد الحمید بن...... عن الاعمش عن ... وھو الفقیر عن جابر بن عبد اللہ قال اقرء فی الاولیین بالحمد وسورۃ والاخریین بالحمد[1]

ان کی دوسری کتاب تحفۃ ... ہے جس میں انھوں نے علامہ نیموی کی تحقیقات نقل کرکے ان کے جوابات دینے کی کوشش کی ہے۔ دیکھئے نماز وتر کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"فان قلت قال النیموی فی آثار السنن بعد ذکر حدیث جابر المذکور فی اسنادہ لین قال فی تعلیقہ مدارہ علی عیسی بن جاریۃ ثم ذکر جرح ابن معین والنسائی وابی داؤد وتوثیق ابی زرعۃ وابن حبان ثم قال قول الذہبی اسنادہ وسط لیس بصواب بل اسنادہ دون وسط انتہی قلت قال الحافظ ابن حجر فی شرح النخبۃ الذہبی من اہل الاستقراء التام فی نقد الرجال انتہی فلما حکم الذہبی بان اسنادہ وسط ...

[1] ابکار المنن: ۱۴۴

ذکر الجرح والتعدیل فی عیسیٰ بن جاریہ وھو من اھل الاستقراء التام فی نقد الرجال محکم بأن اسنادہ وسط وھو الصواب ویؤیدہ اخراج ابن خزیمۃ وابن حبان ھذا الحدیث فی صحیحیھما ولا یلتفت الی ما قال النیموی ویشھد لحدیث جابر ھذا حدیث عائشۃ المذکور یزید فی رمضان ولا فی غیرہ علی احدی عشرۃ رکعۃ"[1]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"وقال النیموی فی آثار السنن ما قال ابن عبد البر من وھم مالک .... ان مالکا قد تابعہ عبد العزیز بن محمد وھو ثقۃ ویحیی بن سعید القطان امام الجرح والتعدیل عند ابی بکر بن ابی شیبۃ فی مصنفہ کلاھما عن محمد بن یوسف وقالا احدی عشرۃ کما رواہ مالک عن محمد بن یوسف واخراج محمد بن نصر المروزی فی قیام اللیل من طریق محمد بن اسحاق حدثنی محمد بن یوسف عن جدہ السائب بن یزید قال کنا نصلی فی زمن عمر فی رمضان ثلاث عشرۃ رکعۃ قال النیموی ھذا قریب مما رواہ مالک عن محمد بن یوسف ای مع الرکعتین بعد العشاء انتھی کلام النیموی۔

قلت فلما ثبت ان الامام مالکا لم ینفرد بقول احدی عشرۃ بل تابع علیہ عبد العزیز بن محمد وھو ثقۃ ویحیی بن سعید القطان امام الجرح والتعدیل قال قال الحافظ فی التقریب ثقۃ متقن حافظ ظھر لک حق الظھور ان قول ابن عبد البر الاغلب ان قولہ احدی عشرۃ

---

[1] تحفۃ الاحوذی ۷۲/۲

وهم ليس بصحيح بل لو تدبرت ظهر لك ان الامر على خلاف ما قال ابن عبد البر اعني ان الاغلب ان قول غير مالك في هذا الاثر احدى و عشرون كما في رواية عبد الرزاق فانه قد انفرد باخراج هذا الاثر بهذا اللفظ ولم يخرج به احد غيره فيما اعلم وعبد الرزاق وان كان ثقة حافظا لكنه قد عمی في آخر عمره فتغير كما صرح به الحافظ في التقريب وانما الامام مالك فقال الحافظ في التقريب امام دار الهجرة رأس المتقنين وكبير المثبتين حتى قال البخاري اصح الاسانيد كلها مالك عن نافع عن ابن عمر انتهى"[1]

غرض یہ کہ اس کتاب میں بھی مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری نے پہلے علامہ نیموی کی تحقیقات نقل کی ہیں اور پھر ان کے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

اس کے علاوہ مولانا عبدالرشید فوقانی نے مندرجہ ذیل علمائے اہل حدیث کے نام لکھے ہیں جنہوں نے آثار السنن کے جواب میں کتابیں لکھیں۔

مولانا عبدالسمیع مبارکپوری

مولانا عبدالسمیع مبارک پوری جماعت اہل حدیث کے ایک اچھے عالم ہیں۔ انہوں نے تحفۃ الاحوذی پر ایک مقالہ لکھا اور اس میں جا بجا علامہ نیموی کی تحقیقات کے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

مولانا حافظ محمد گوندلوی پنجابی

مولانا حافظ محمد گوندلوی جماعت اہل حدیث کے ایک اچھے عالم ہیں انہوں نے اردو زبان میں التحقیق الراسخ کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے

---

[1] تحفۃ الاحوذی ۷۴/۲

اور اس میں علامہ نیموی کی تحقیقات نقل کر کے ان کے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

مولانا چراغ گل یہ بھی جماعت اہل حدیث کے مشہور عالم ہیں۔ انہوں نے تقریر ترمذی کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں علامہ نیموی کی تحقیقات نقل کی ہیں اور ان کے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

باب دوازدہم

علامہ نیموی علمائے کرام کی نظر میں

علامہ نیموی نے علوم دینیہ اور خاص طور سے فن حدیث کی جو زبردست خدمت انجام دی ہے اس کی وجہ سے تمام علمائے ہند انہیں نہایت احترام اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور قدر کرتے ہیں۔ سب سے بڑی اور اہم بات یہ ہے کہ علامہ نیموی جس عہد سے تعلق رکھتے ہیں اس عہد میں ہندستان میں نامی گرامی علماء موجود تھے جو علوم دینیہ اور خاص طور پر حدیث میں امام تسلیم کئے جاتے تھے ان کے علم و فضل کا شہرہ نہ صرف ہندستان بلکہ عرب میں بھی تھا۔ تاہم انہوں نے بھی علامہ نیموی کو فن حدیث میں اپنا امام تسلیم کیا اور "علامہ" کہہ کر انہیں یاد کیا یہی نہیں بلکہ مولانا انور شاہ کشمیری جیسے متبحر عالم اور محدث نے فرمایا کہ تین سو برس سے علامہ نیموی کے پایہ کا محدث پیدا نہیں ہوا۔ اور ۱۴ ویں صدی میں ایسی عظیم شخصیت کا پیدا ہونا حیرت انگیز ہے۔

بہر حال اب ہم درج ذیل سطور میں ان علماء کرام کے تاثرات اور خیالات پیش کریں گے جنہوں نے علامہ نیموی کے فضل و کمال کے سلسلے میں اپنی رائے دی اور مختلف القاب و آداب سے انہیں یاد کیا ہے۔

شیخ عبدالحق مہاجر مکی کا تاثر

سب سے پہلے ہم شیخ عبدالحق مہاجر مکی کا تاثر بیان کریں گے جس کے ایک حصے کا اردو ترجمہ گرچہ پچھلے باب میں دیا جا چکا ہے تاہم اس کی اصل عربی عبارت یہاں پیش کی

جارہی ہے تاکہ علامہ نیموی کے بارے میں ان کا جو تاثر ہے وہ صحیح طور پر قاری کے سامنے آسکے۔ درحقیقت یہ ایک خط ہے جو آثار السنن کی وصول یابی کے جواب میں لکھا گیا ہے اور اس میں علامہ نیموی کو اجازت حدیث دی گئی ہے ساتھ ہی ساتھ انہیں اچھے القاب و آداب سے یاد کیا گیا ہے

خط ملاحظہ کیجئے:

ان ھدیتکم وصلت الیّ یوم العید واذھا دھا قد زھرت لدی فی الساعۃ المبارکۃ فی جماعۃ من احبابی وملأ من اصحابی فطالعوھا وسرحوا الانظار فی بیانیھا وطرحوا الافکار فی معانیھا وفرحوا ما لا یسعہ البیان دعوتکم دعاءً یضیق عنہ نطاق البیان وان شیخ العلماء قد دعا لکم فی المسجد الحرام رافعا یدیہ۔ اما بعد فقد التمس منی الشیخ الفاضل السابق فی حلبۃ الفضائل الباذل فی تحصیل العلوم الشرعیہ الجھد المشمر فی اقتنامھا مساعد الجد مولانا العلامہ المحقق المدقق المولوی محمد ظہیر احسن ادام اللہ بقاءہ وزاد کل یوم فی مصاعد الفضل ارتقاءہ۔[1]

مولانا رشید احمد گنگوہی کا تاثر

مولانا رشید احمد گنگوہی سے بھی علامہ نیموی کی خط و کتابت ہوتی تھی اور مولانا رشید احمد گنگوہی علامہ نیموی کی حدیث دانی اور تفقہ سے متاثر تھے۔ ان کے بہت سے خطوط علامہ نیموی کے پاس تھے جو بعد میں ضائع ہو گئے۔

ایک خط علامہ نیموی کے رسالہ ردالرد کے صفحہ اول پر درج ہے جس کے القاب یہ ہیں:

از بندہ رشید احمد عفی عنہ بعد سلام مسنون الاسلام مطالعہ فرمانید؟[1]

---

[1] القول الحسن: ۲۰

مولانا شیخ الہند کا تاثر

شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی علامہ نیموی کے علم وفضل کے قائل تھے اور دوسروں سے بھی اس کا اظہار کرتے تھے، چنانچہ مولانا محمد محسن نیموی کا بیان ہے کہ وہ عربی علوم کی تحصیل کے لیے دار العلوم دیوبند گئے تو شیخ الہند سے ملاقات کی حضرت شیخ الہند نے دریافت فرمایا کہ آپ کا گھر کہاں ہے؟ انہوں نے کہا "نیمی۔ فرمایا کہ جہاں مولانا نیمی کا مکان ہے؟ جواب دیا کہ جی ہاں۔ حضرت شیخ الہند نے فرمایا کہ مولانا شوق نیموی نے جامع الآثار فی اختصاص الجمعۃ بالامصار میں نماز جمعہ پر لاجواب بحث کی ہے۔ پھر شیخ الہند نے ان کی رہائش کے لیے حجرہ اور تیل کا انتظام کر دیا[1]

ایک دوسرے موقع پر فرمایا کہ مولانا ظہیر احسن سے صلوٰۃ العید فی القریٰ تکرہ تحریماً کی دلیل پوچھی جاتی ہے جس سے ارشاد السوال نصف العلم کی تصدیق ہوتی ہے[2]

علامہ انور شاہ کشمیری کا تاثر

علامہ انور شاہ کشمیری ہندستان میں اپنے دور کے ممتاز علماء میں شمار ہوتے ہیں بلکہ فن حدیث میں امامت کے درجہ پر فائق تھے تاہم یہ عجیب بات ہے کہ علامہ نیموی کی حدیث دانی اور علمی مقام سے سب سے زیادہ وہی متاثر تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کی دلی خواہش تھی کہ وہ بہار آکر علامہ نیموی سے ملاقات کریں لیکن اسی دوران ۱۳۲۲ھ میں علامہ نیموی اچانک انتقال کر گئے جس کی وجہ سے ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی، اور دل کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔

[1] ہماری زبان علی گڈھ مئی ۱۹۶۱ء [2] احسن القری، ۲۲۷

اس کے علاوہ جب آثار السنن کا ایک نسخہ ان کے یہاں پہنچا تو نہایت خوش ہوئے اور پھر درس و مطالعہ کے وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے، اور اس پر حاشیہ لکھتے رہتے تھے یہاں تک کہ یہ کتاب الاتحاف لمذہب الاحناف کے نام سے شائع ہوئی جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔

وہ فرماتے تھے کہ "محدث نیموی بڑے محقق گذرے ہیں اور مذہب حنفی کی بڑی خدمت انجام دی ہے[1] ـــــ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ تین سو برس سے ہندستان میں اس پایہ کا محدث پیدا نہیں ہوا ہے[2]"

مولانا انور شاہ کشمیری علامہ نیموی کے تبحر علمی اور خدمت حدیث سے اس قدر متاثر تھے کہ ان کی شان میں دو طویل قصیدے کہے ہیں جو عربی زبان میں ہیں۔ دونوں قصیدے یہاں تحریر کئے جاتے ہیں، جس میں علامہ نیموی کی بے حد تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ انہیں وحید عصر اور حافظ حدیث کہنے کے علاوہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ انکی علمی برتری اور فضیلت بیان کرنا مولانا انور شاہ کی بساط سے باہر ہے۔

قصیدۂ اولیٰ ملاحظہ کیجئے :ـ

رویت وطبت نفسا فی ارتواء ۔۔۔ وعلات فازدری ماء السماء
بجی ذا المناقب والمعالے ۔۔۔ شریف المجد عظریف العلاء
کریم الخلق محمود السجایا ۔۔۔ خلیقا للمحامد والثناء
اثیل المجد مفقود المثیل ۔۔۔ سنیان الفضائل والبهاء
کثیر العلم فی فهم غزیر ۔۔۔ وسیع الحفظ فی فضل ارتقاء
رحیب الباع فی رای مصیب ۔۔۔ طویل الطول فی وسع الذکاء

---

[1] القول الاحسن: ٢٠۔ [2] ہندستانی مسلمان: ٥٠

سنا علم الحديث كثير حفظ — و رواية الزمان بلا امتراء
فذا هو رحلة الآفاق طرا — فحافظ عصره اهل اقتداء
و عمدة قارئ ارشاد سار — و فتح المغلقات على وفاء
و خير جاء استوفى البرايا — افاضته على طول البقاء
وحيد العصر محسود الندايد — سديد القول في حسن الصفاء
رفيع القدر ذو القدر الرفيع — باعلال الرواية والتقاء
ظهير الحق مولانا الظهير — اضاء الارض في نور اهتداء
مصابيح الهدى مشكوة هدى — و مرقات المعالي والسناء
فشمس ذالك او بصر العيون — و نور ذاك او كحل الجلاء
فزخار و مدرار مطير — و عين لا تكدر بالدلاء
و شرعك في الشرائع والمسائل — و حسبك في اقتداء وانتقاء
سحاب الفيض او فيض السحاب — ضياء النور او نور الضياء
وجود الجود ذا اجود جود — صدور الصادرين لمجي جاء
و حبر ذاك او بحر عميق — و علم ذاك او فيضان ماء
مزيح الغوث او غيث مغيث — رباب ربا ربيع الاربعاء
فصيح ذاك او سيح نسيح — بيان ذاك او ماء الرواء
فلا عين ولا غير و هذا — تفض صاح عن هذ الغطاء
ولا استطيع انومداح فضله — مرام ذاك في غير الرجاء
فمد الله الا له ظليل ظل — و جازاه بخير من جزاء

(٢) قصيدة اخرى

الا نعم صباحا ايها العصر الخالي   تنورت فيك النور من جبل عالي
حييت حيوة بعد ما كنت ماضيا   وجددت تجديدا على عمر بالي
ومهما اقلب فيك عيني بتسمت   تباشير تبشير على حزن البال
يقولون ما هذا الكان لم يبصروا   بنورا تام سافر لهم حبال
نعم طالع الاسلام طلاع انجد   على الافق الاعلى اضاء بالكمال
فاشرق اشراقا وزحزح عن دجى   واسفر اسفارا مدى النظر العالي
فنور ولكن للعوام هاطل   وهل من ضياء للعوام هطال
امين مكين حافظ ثقة هدى   وبالصدق للصديق كان مزآل
بري ابهى بارع ثم فارع   مجل قد استقطى بنص وارقال
ظهير الهدى ظهير احسن فيضه   حيوة قلوب دائما كوثر مالي
فسيح المجاري سيب سيب تكرما   تعطف بالمجد الاثيل باسبال
ازاح الدجى نورا فلح بالسرى   كليل سري عند الصباح باجفال
نعم ملأ الآفاق نورا فماله   مكان فيأويه ويأخذه خال
احار واعى فى مدايحه فضيلة   كحيرة عيني والشعاع باقبال
وقد جمع العليا لمجد هوى على   نير كثير غير حصر واجمال
وقد جاء بالآثار للناس راويا   عن النور عن فيض عن القال عن حال
فدونك سفرا مسافرا بالشوارق   ونورا على نور بالطول اذيال
هداه حديث والفقاهة لحمته   نسيج على وحد بابداع منوال
وتعليقه مثل الطراز المذهب   معانيه اعلام باتقان اعمال

علی مثل هذا یعقد القلب خیطه | ویاخذه حفظا ربتمة اذهال
وشاخ لجید القلب حلیة وجهه | سحاب وقطر الدر فیه باسجال
فتنقیح تحقیق وتلخیص سنة | ومیزان تعدیل وکنز لعمال
وتهذیب آثار وفتح لباابنا | ومشکوٰة نور للغدو واصال
صحیح وموصول عزیز ومسند | ومن غیر اعلال ومن غیر ارسال
فمن عجب بدار من الصدر طالع | بنور مبین مستبین لاعفال
جنی جنة فردوس فضل ومنة | نعیم مقیم فی میاه واظلال
شقائق نعمان وانوار سنة | وشعبة ایمان واوراق افضال
کا ترجة طابت بریح وطعمها | وقد نفعت جارا علی کل احوال
یقولون ادرک مدحة قلت انه | بعید فلا یلفی بجد و ایغال
فما زال حرز الدین والحق والهدی | وذا فلیکن اقصی امانی وامالی[۱]

مولانا حکیم عبد الحیٔ کا تاثر

مولانا حکیم عبد الحیٔ لکھنوی (متوفی ۱۹۲۱ مطابق ۱۳۴۱ھ) ہندستان کے مشہور عالم ہیں جنہوں نے تاریخ اسلامی ہند پر کئی اہم اور گراں قدر کتابیں اردو عربی دونوں زبانوں میں تصنیف کی ہیں۔ ان میں خاص طور پر نزھۃ الخواطر قابل ذکر تصنیف ہے جس میں انہوں نے پہلی صدی ہجری سے لےکر چودھویں صدی کے اوائل تک کے علماء وصلحا کے حالات تحریر کئے ہیں۔ انہوں نے علامہ نیموی کے حالات بھی لکھے ہیں ان کا تعارف اس طرح کراتے ہیں۔

۲۷ الشیخ العالم الفقیہ ظھیر احسن بن سبحان علی الحنفی النیموی

[۱] آثار السنن جزء ثانی: ۱۳۱

العظیم آبادی احدی العلماء المبرزین فی الفقہ والحدیث"

حالات کے بعد اخیر میں ان کی حدیث دانی اور فنی مہارت پر اپنی رائے پیش کی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

" وکان عالی الکعب، واسع الاطلاع، دقیق النظر فی الحدیث والرجال، ونقد الحدیث ومعرفۃ عللہ وطبقاتہ" [۱]

مولانا ابوالحسن علی ندوی

مولانا ابوالحسن علی ندوی موجودہ دور میں عالم اسلام کے مشہور عالم دین اور داعی اسلام ہیں۔ اردو کے علاوہ عربی زبان کے صاحب طرز ادیب اور مختلف اہم کتابوں کے مصنف ہیں جن میں تاریخ دعوت وعزیمت سیرت احمد شہید، ہندوستانی مسلمان، عالم اسلام میں اسلامیت ومغربیت کی کشمکش، ارکان اربعہ اور نبی رحمت خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے ہندوستانی مسلمان میں علامہ نیموی کے حالات نہایت اختصار کے ساتھ لکھے ہیں۔ ان کی کتاب آثار السنن پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مولانا ظہیر احسن شوق نیموی کی کتاب آثار السنن محدثانہ نقد ونظر اور مذہب حنفی کی تائید میں ایک بلند پایہ تصنیف اور ہندوستان کی فن حدیث کی تصنیفات میں ایک وقیع اور جدید اضافہ ہے۔ افسوس ہے کہ مصنف کی عمر نے وفا نہ کی اور یہ کتاب مکمل نہ ہو سکی۔ اگر یہ کتاب مکمل ہو جاتی تو حنفی نقطۂ نظر اور محدثانہ طرز پر ایک بڑا علمی کارنامہ ہوتا" [۲]

---

[۱] نزہۃ الخواطر ۲۰۶/۸ [۲] ہندوستانی مسلمان: ۵۰

کتابیات

اردو

- آثار الصنادید: سر سید احمد خاں۔ لکھنو
- آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی عبد الرزاق ملیح آبادی
- احسن القریٰ :۔ مولانا محمود حسن دیوبندی،
  مطبع بلالی۔ ساڈھوراہ
- احوال علمائے فرنگی محل : الطاف الرحمٰن
  مجتبائی لکھنؤ۔ ۱۷
- اردو شاعری پر ایک نظر: کلیم الدین احمد، پٹنہ
- اصلاح شوق نیموی: قومی پریس لکھنؤ
- اعیانِ وطن: حکیم شعیب پھلواروی، پٹنہ
- ازاحۃ الجید: شوق نیموی، لکھنؤ
- الیضاح: شوق نیموی، قومی پریس لکھنؤ
- تاریخ شعرائے بہار: عزیز الدین بلخی، قومی پریس پٹنہ
- تبصرۃ الابصار فی رد تنویر الابصار: شوق نیموی
- تذکرہ علمائے اہل سنت۔
- تذکرہ علمائے فرنگی محل
- تذکرہ علمائے ہند: رحمٰن علی
- تذکرہ مسلم شعرائے بہار: حکیم احمد اللہ ندوی،
  انٹرنیشنل پریس، کراچی
- تذکرہ مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی:
  ابو الحسن علی ندوی، انتظامی پریس، کانپور
- ترجمہ مکتوبات صدی
- جامع الآثار فی صلوٰۃ الجمعۃ فی القریٰ:
  شوق نیموی، احسن المطابع پٹنہ
- جلاء العینین فی رفع الیدین: شوق نیموی،
  قومی پریس لکھنو
- حبل المتین: شوق نیموی
- حدائق الحنفیہ: ابو جہلمی، مکتبہ حسن سہیل، لاہور
- الحیات بعد الممات: فضل حسینی، آرہ
- خم خانۂ جاوید: لالہ سری رام گلاب سنگھ پریس، لاہور
- دائرۂ معارف اسلامیہ، لاہور
- الدرۃ الغرہ: شوق نیموی، قومی پریس، لکھنؤ
- دکنی ادب کی تاریخ: محی الدین قادری زور، دہلی
- دیوان شوق: شوق نیموی، مطبع سیدی، پٹنہ
- رد السکین: شوق نیموی، قومی پریس لکھنؤ
- سرمۂ تحقیق: شوق نیموی
- سوز و گداز: شوق نیموی، نظامی پریس، پٹنہ
- سیر بنگال: شوق نیموی، احسن المطابع، پٹنہ
- شعر العجم: شبلی نعمانی، اعظم گڑھ
- عرب و ہند کے تعلقات:
  سید سلیمان ندوی، اعظم گڑھ
- علمائے ہند کا شاندار ماضی: محمد میاں
- غزل اور مطالعۂ غزل: عبادت بریلوی،
  کوہ نور پریس، دہلی
- القول الاحسن: حفیظ الرحمٰن، پٹنہ
- کاشف الحقائق: امداد امام اثر، لکھنؤ
- مقالات شبلی: شبلی نعمانی، اعظم گڑھ
- مقالۂ کاملہ: شوق نیموی، قومی پریس لکھنؤ

- مولانا شمس الحق ڈیانوی: عزیز، کراچی
- نغمۂ راز: شوق نیموی، قومی پریس، لکھنؤ
- ہماری شاعری: مسعود حسن رضوی، نظامی پریس لکھنؤ
- ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں: ابوالحسنات ندوی، اعظم گڑھ
- ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں: اطہر مبارکپوری، دہلی
- ہندوستانی مسلمان: ابوالحسن ندوی، لکھنؤ
- ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں: سالم قدوائی، کوہ نور پرنٹنگ پریس، دہلی
- یاد ایام: حکیم عبدالحی، مطبع انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ
- یادگار وطن: شوق نیموی، قومی پریس لکھنؤ

فارسی

- اتحاف النبلاء: صدیق حسن خان، نظامی کانپور
- ازاحۃ الاغلاط: شوق نیموی، قومی پریس لکھنؤ
- خزینۃ الاصفیاء: غلام سرور، لکھنؤ
- خوان پر نعمت: مخدوم بہاری، پٹنہ
- سفینۃ الاولیاء: داراشکوہ، نول کشور لکھنؤ
- گنج شائیگاں (قلمی): لالہ رام چندر حسرت عظیم آبادی، خدا بخش لائبریری، پٹنہ
- مآثر الکرام: آزاد بلگرامی، مطبع رفاہ عام لاہور
- معدن المعانی: مخدوم بہاری، مطبع شرف الاخبار، بہار شریف
- منتخب التواریخ: عبدالقادر بدایونی، کلکتہ
- وسیلۃ العقبیٰ: شوق نیموی

عربی

- آثار السنن: شوق نیموی، [illegible]

- ابجد العلوم: صدیق حسن خان، بھوپال
- ابکار المنن: عبدالرحمٰن مبارکپوری
- الاتحاف لمذہب الاحناف: انور شاہ کشمیری
- بذل المجہود: خلیل احمد سہارنپوری
- تبیان التحقیق: شوق نیموی، قومی پریس، لکھنؤ
- تحفۃ الاحوذی: عبدالرحمٰن مبارکپوری
- تعلیق التعلیق: شوق نیموی
- التعلیق الحسن: شوق نیموی، قومی پریس، لکھنؤ
- رجال السند والہند: قاضی اطہر مبارکپوری
- سبحۃ المرجان: آزاد بلگرامی، بمبئی
- العرف الشذی: انور شاہ کشمیری
- فتح الملہم: شبیر احمد عثمانی
- فتوح البلدان: بلاذری، قاہرہ
- الفوائد البہیہ: عبدالحی لکھنؤ
- القول الحسن: عبدالرشید فوقانی
- معجم البلدان: یاقوت رومی، بیروت سنہ ۱۹۸۴ء
- نزہۃ الخواطر: حکیم عبدالحی، حیدرآباد
- الینع الجنی

اخبار و رسائل

- اشارہ: ۱۹۵۸ء پٹنہ
- معارف: ۳۵، ۱۹۲۸ء اعظم گڑھ
- ندیم: بہار نمبر ۱۹۳۵ء - گیا
- نقوش شخصیات نمبر ۱۹۵۶ء - لاہور
- ہماری زبان - ۱۹۶۱ علی گڑھ